مختصر تاریخ ادب اُردو

مختصر تاریخ ادب اردو

از

ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ

صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

اردو اکیڈمی سندھ

مشن روڈ کراچی

پہلا پاکستانی ایڈیشن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۵۶ء

تعداد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہزار

مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انجمن پریس کراچی

قیمت ——— ساڑھے [illegible] روپے

لاہور آفس

اُردو مرکز

گنپت روڈ ۔ لاہور

حیدرآباد ایجنٹس

کتاب ایجنسی ۔ تلک چاڑی ، حیدرآباد

عرضِ حال

اردو پڑھتے پڑھاتے وقت اکثر یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس زبان میں تاریخ ادب پر کوئی ایک ایسی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے کوئی کتاب امیر و داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ شعرا کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی تو اس وقت تک کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلہ میں موجودہ دور کے طرزِ تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس کمی کی شکایت صرف انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے طلبا تک محدود نہ تھی۔ ایم۔ اے کے طلبا نے بھی بار بار تکلیف کے ساتھ اسی بات کو کہا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اور خاص طبقوں میں بھی اس قلت کا تذکرہ اکثر زبان اور قلم سے ہوتا رہا ہے۔ اسی کمی کے پورا کرنے کے لیے میں نے قلم اٹھایا، میری کامیابی و ناکامیابی۔ کتاب کی خوبی و خرابی کا فیصلہ بالکل پڑھنے والوں کی رائے پر ہے۔ مجھے کسی بات پر اصرار نہیں نہ کچھ بتانا ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جس کمی کو پوری کرنے کی میں نے کوشش

کی تھی وہ بُرے بھلے آج آپ کی خدمت میں پیش کر سکا اور اس احساس پر مسرت بھی ہے لیکن اس کی حسرت بھی رہ گئی کہ اختصار کی قید نے بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا جن کو لکھنے کے لئے بہت جی چاہتا تھا۔

اُردو زبان کے مخرج اور ارتقا کے متعلق مختلف نظریئے جو مختلف الباب قلم نے پیش کیے اُن کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ مجھے خود تشفی نہیں ہوئی اور سچ پوچھیے تو میں بھی مخرج کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر اس وقت تک نہیں پہنچا تھا جب اس کتاب کا ابتدائی حصّہ پریس بھیجا گیا۔ اگر ممکن ہو تو میری دوسری تصنیف کا انتظار فرمائیے۔ جو اُردو زبان کی ابتدا، مخرج اور ارتقا کے لئے مخصوص ہوگی۔ شاید وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سہارا دے سکے۔ یہاں اس امر پر کسی تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں۔

اس مختصر "تاریخ ادب اُردو" میں اختصار کا پہلو، حالاتِ زندگی لکھتے وقت اور تنقید کلام کے موقع پر بھی مدِنظر رہا ہے۔ تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔ لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے۔ اگر ممکن ہو تو پارہ کو جملہ میں اور جملہ کو چند لفظوں میں پر معنی طریقہ سے بیان کر دیا جائے۔ بعض انگریزی داں طبقہ میں اُردو ادب کی تاریخی و تنقیدی کتابوں پر یہ بھی اعتراض تھا کہ اُردو والے تنقید کے وقت چند الفاظ چن لیتے ہیں اور ہر شاعر یا نثر نویس کے کلام پر ترتیب بدل کر وہی الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ گویا یہاں امتیازی خصوصیت ہے ہی نہیں۔ یہ اعتراض نہ بالکل صحیح ہے نہ بالکل غلط، بعض کتابیں

ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر آپ مصنفین کی انفرادی حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن سے اس قسم کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ میں نے غالباً ہر موقع پر اس کا خیال رکھا ہے کہ ہر مصنف کی امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے۔

یہ کتاب اب سے دو سال پہلے شائع ہو چکی ہوتی مگر لوگوں کے حالاتِ زندگی کی فراہمی میں اتنی دقتیں پیش ہوئیں کہ شاید کتاب لکھنے میں اتنی مصیبتوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ خود بھی خط لکھے دوسروں سے بھی لکھوائے مگر بہت کم حضرات نے اتنی زحمت گوارا کی کہ اپنے حالاتِ زندگی لکھ کر روانہ فرمائے۔ مجھے شاید اس کی شکایت کم ہوتی کہ حالاتِ زندگی لوگوں نے دینا پسند نہیں کئے۔ ان کی چیز ہے۔ ان کو اختیار رہے دقت تو یہ ہوتی تھی کہ لوگ تحریری و زبانی برابر وعدہ کرتے تھے کہ انشاءاللہ بہت جلد سوانح عمری بھیج دوں گا۔ مگر یہ "انشاءاللہ" بھی "وعدہ فردا" سے کم نہ ثابت ہوا اور مجھے انتظار میں اس قدر زحمتیں اٹھانا پڑیں۔ یہ تجربہ اتنا تلخ ہوتا گیا کہ بالآخر گھبرا کر یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ جن حضرات کے حالاتِ زندگی بہت آسانی سے مل جائیں اُن ہی کی سوانح عمری لکھی جائے۔ مگر اس سلسلہ میں ان حضرات سے ندامت کے ساتھ معافی کا خواستگار رہوں جن کو میں نے سوانح عمری بھیجنے کی زحمت نہیں دی اور کتاب میں بھی نہیں لکھ سکا۔

موجودہ شعراء کے کلام کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں رکھا گیا جس مصنف کے متعلق مواد جمع ہوتا گیا پریس میں بھیج دیا گیا۔ بعض ایسے شعراء کا ذکر لکھنے سے

رہ گیا ہے جن کے متعلق مجھے لکھنا چاہیئے تھا مگر افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام اتنی مقدار میں دستیاب نہ ہو سکا کہ رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ اگر ممکن ہوا تو آئندہ اڈیشن میں انشاءاللہ تلافی کر دی جائے گی۔ فی الحال معذور سمجھ کر مجھے معاف کر دیا جائے۔

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ تاریخ لکھنا شاید ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ مجھے اپنے چند خاص احباب و کرم فرما کا شرمندۂ احسان ہونا پڑا۔ جن میں ایک ذات تو ایسی ہے کہ جس کے ابرِ کرم کی بارش سے اکثر میری کشتِ امید کو سرسبز ہونے کے لئے زیربارِ منت ہونا پڑتا ہے۔ ضامن علی صاحب قبلہ میرے لئے صرف صدر شعبۂ اردو ہی نہیں بلکہ استاد و شفیق بزرگ بھی ہیں۔ جن کے لئے میری رہنمائی فرض ہو یا نہ ہو مگر ان کی طبیعت کسی حال میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ ان کے امکان میں ہو اور راہِ بہبودی و ترقی میں میرے پائے ادب کو لغزش ہو جائے۔ اس کتاب کے سلسلہ میں جب کبھی میں نے کسی امداد کی درخواست کی ہے۔ نہایت فراخ دلی اور ہمت افزائی کے ساتھ آپ نے توجہ فرما کر میری مشکل حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی ذات اور قابلِ قدر کتاب "تاریخ ادب و زبان اردو" سے میں نے جو فائدہ اٹھایا ہے اس کا بے حد ممنون ہوں۔

اسی سلسلہ میں اپنے دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مغربی فنِ تنقید کی معلومات نے میرے نزدیک کتاب میں اصولِ

تنقید کے لحاظ سے بہت کچھ دل کشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ موصوف نے ہر موقع پر جب
کبھی میں نے تکلیف دی ہے نہایت ہی خندہ پیشانی و کشادہ دلی کے ساتھ لبیک
کہا۔ ان کی قیمتی رائے اور دوسری کا اعتراف نہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں غالباً
آپ کا یہ احسان میں کبھی بھول نہ سکوں گا۔

ایک بزرگ کا شکریہ ادا کر چکا۔ ایک برابر کے دوست کی عنایتوں کا بھی ذکر
کر چکا۔ ایک مشکل سوال میرے لئے یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں کا شکریہ کیونکر ادا کروں
اوّل تو دنیا نے کوئی طریقہ اس کا مقرر نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو میں نے سیکھا نہیں
اور پھر دوسری دقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے ان کی غیور طبیعت
یہ بھی تو گوارا نہیں کرتی کہ میں شکریہ ادا کروں مگر میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا ہے کہ ان
لوگوں کا کم سے کم ذکر تو کر ہی دوں میرے چند عزیز شاگرد (جن کو اب دوست بھی
سمجھنا چاہیئے) اس تصنیف میں ہر وقت میرا ہاتھ نہایت خوشی کے ساتھ بٹاتے رہے۔
سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے۔ سید وقار عظیم صاحب ایم، اے۔ ریسرچ
اسکالر اور سید احتشام حسین صاحب بی، اے۔ جس محنت و محبت کے ساتھ اس
کتاب کے لئے جاں فشانی اٹھاتے رہے وہ صرف قابلِ قدر ہی نہیں بلکہ میرے
لئے مایۂ ناز بھی ہے۔ ان کی سعادت مندی و قابلیت اور ادبی شغف کو دیکھ کر بیساختہ
دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا ہر استاد کو ایسے شاگرد نصیب کرے۔ ان لوگوں نے نہ
صرف پروف ہی پڑھا بلکہ مواد بھی اکٹھا کیا۔ اور جا بجا مضمون بھی ترتیب دیئے۔ ان

تمام باتوں کا احساس خود اپنی جگہ پر ایک شکریہ ہے۔ اب میں ان کی خاطر سے اگر شکریہ یا اس سے قبیل کا کوئی لفظ نہ بھی استعمال کروں تو پڑھنے والے میرا مطلب خود سمجھ لیں گے۔

آج اُردو ادب کے ہر مورخ کو تہِ دل سے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس دلچسپ مگر دشوار کام میں وہ اپنے پیش رو متعدد تذکرہ نویسوں اور ان کے بعد اُردو ادب کے پہلے مورخین و نقادوں کا ممنونِ احسان ہے۔ مجھے بھی فرض شناسی مجبور کرتی ہے کہ اس سلسلہ کے اہلِ قلم کا دل سے شکریہ ادا کروں کیونکہ جس طرح ادب اپنی روایات و سرمایۂ قدیم کا بارِ احسان لے کر آگے بڑھتا ہے اسی طرح تنقید و تاریخِ ادب بھی اپنے پہلے کے مواد و مثال کو پیشِ نظر رکھ کر نئی منزلیں طے کرتی ہے۔

نشیمن - الہ آباد

اعجاز - ۱۴ر نومبر ۱۹۳۲ء

طبعِ ثانی ۴ر دسمبر ۱۹۵۲ء

فہرستِ مضامین

حصّۂ نظم

وہ یا کئی زبانوں کے میل جول سے کبھی کبھی ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے مگر دو چار سال میں نہیں بلکہ صدیوں میں۔ اُردو زبان بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ عربی۔ فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی اختلاط سے اس کا وجود ظہور میں آیا۔

ہندوستان میں آریہ قوم تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح آئی۔ یہاں ڈراویڈی قوم کا غلبہ تھا جو ان سے بہت پہلے ہندوستان آچکے تھے۔ آریاؤں نے ڈراویڈوں کو دھکیل کر پیچھے کر دیا اور ان کو مغلوب کرکے سنہ قبل مسیح تا ۶۰۰ قبل مسیح شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئے۔ ہندوستان میں پہلے ہی سے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں تھیں۔ آریہ لوگ جب تک محدود علاقہ میں رہے ان کی زبان اپنی جگہ برقرار رہی لیکن جیسے جیسے وہ پھیلتے گئے زبان میں فرق آتا گیا۔ کچھ آب و ہوا کی وجہ سے کچھ دوسری زبانوں کے میل جول سے

تلفظ اور الفاظ میں ردّ و بدل ہوگیا۔ یہاں تک کہ ان کی زبان کی مرکزی حیثیت بہت کم رہ گئی۔۔۔۔۔ قبل مسیح تک کوشش ہوئی کہ زبان کو منظم کر کے ایک حیثیت دیدی جائے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اصول یہ رکھا گیا کہ مقامی تعصبات سے الگ ہو کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا جائے جو سب جگہ رائج ہوں۔ اس اصول پہ کاربند ہو کر لوگ ایک خاص ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے اور یہ زبان پاک صاف ہو کر سنسکرت کہلائی۔ سنسکرت کو بڑا عروج ہوا۔ مگر ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ادبیت اتنی زیادہ آتی گئی کہ وہ عوام سے الگ ہو کر خاص طبقہ کی چیز ہو کر رہ گئی۔ اور یہی سبب خاص طور سے اس کے زوال کا بھی ہوا۔ دوسرا سبب اس کے زوال کا یہ ہوا کہ گوتم بدھ اور مہابیر سوامی نے اپنے اپنے مذہب کی ترویج مقامی بولیوں میں کی۔ عوام نے ان کے عقائد اور طرز بیان کو بہت پسند کیا۔ مذہب کا سہارا پاکر صوبائی زبانیں چمک اٹھیں اور سنسکرت سے مقابلہ کرنے لگیں۔ ہندو مذہب کے پرستار اپنی زبان یعنی سنسکرت کی حفاظت سختی سے کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت عوام سے بالکل الگ ہو کر صرف ایک طبقہ کی زبان ہوگئی۔ ہندوستان کے عوام کی زبان شروع ہی سے ایک مخلوط زبان تھی۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ مختلف خطوں میں مقامی زبانیں رائج تھیں اور وہ برابر چلتی رہیں۔ ان زبانوں کو پراکرت کہتے تھے۔ ہم کو پراکرت کا پہلا نمونہ ۲۵۰ قبل مسیح اشوک کی لاٹوں میں ملتا ہے۔ یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ اسی ایک پراکرت کی ادبی شکل کا نام پالی ہے جس کو بدھ مذہب کے ہاتھوں فروغ ہوا لیکن اس وقت کہ جب اس پر شورسینی (متھرا اور اس کے ارد گرد کے علاقہ کی زبان) کا اثر پڑ چکا تھا۔ سنسکرت کے ساتھ پراکرت کا بھی پہلو بہ پہلو ارتقا ہوتا رہا۔

ہرش وردھن اور راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعہ سے دوآبہ کی زبان بھی

ترقی کرتی رہی

سنسکرت کی طرح بعض بعض پراکرتیں بھی کبھی کبھی اتنی ادبی حیثیت اختیار کرلیتی تھیں کہ عوام ان کے استعمال سے گریز کرنے لگتے تھے اور پھر اپنی ملی جلی زبان کو ایک خاص انداز میں پیش کر کے ایک نئی زبان تیار کر لیتے تھے جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا کرسکیں۔ اسی طرح پر ایک زبان اپ بھرنش کا بھی وجود ہوا چنانچہ جب عوام نے ادبیات سے گھبرا کر اپنے طور پر ایک ملی جلی بولی کا استعمال شروع کیا تو اس کو اہل زبان حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس کا نام اپ بھرنش رکھا جس کے معنی بگڑی زبان[1] کے ہیں۔

اپ بھرنش عوام کی رہنمائی میں بڑھتی رہی۔ بالآخر اس میں زندگی کے آثار دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف مائل ہوا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں نے بھی اس کا اثر لیا۔ خاص طور پر گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ کی بولیاں اس سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اس کو بھی اتنا فروغ ہوا کہ ۸۰۰ء سے لیکر ۱۰۰۰ء تک دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی۔ موجودہ اردو یا کھڑی بولی اسی اپ بھرنش سے نکلی۔ اس کے وجود میں وہ اپ بھرنش کارفرما ہوئی جو دہلی میرٹھ اور اس کے گردونواح میں بولی جاتی تھی۔ اسی زبان کی جنم دی ہوئی مغربی ہندی بھی تھی۔ جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رائج تھی۔

۱۰۰۰ء کا زمانہ ایسا ہے کہ جس کے بعد افغانستان کے راستہ سے برابر مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا مرکز زیادہ تر پنجاب رہا اس سے پہلے محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم

[1] تاریخ زبان اردو، ڈاکٹر مسعود حسن صفحہ ۴۵، صفحہ ۸۳۔

کرلی تھی - وہاں عربی و فارسی کے الفاظ برابر استعمال ہونے لگے تھے - محمود غزنوی وغیرہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی الفاظ کی رد و بدل ہوتی رہی عربی و فارسی الفاظ ہندوستان کی زبانوں میں اور عربی و فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بڑی تیزی سے بڑھتے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے - نئی زبان کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا - یہاں تک کہ فارسی اور عربی کے شعرا ہندوستانی زبان میں بھی شعر کہنے لگے - چنانچہ خواجہ مسعود سعد سلمان جن کا انتقال ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان ہوا ہے، علاوہ ترکی و فارسی زبانوں کے ہندوستانی زبان کے بھی شاعر تھے جس کا ثبوت محمد عوفی اور امیر خسرو کی کتابوں سے ملتا ہے - چونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان کے کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ہندوستان کی کس زبان میں شعر کہے ہیں - لیکن قیاس یہ ہے کہ غالباً لاہوری زبان رہی ہوگی - لاہور کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنانے پر اس وقت تک کے لسانیاتی اندوختہ کو بھی ترمیم کرنا پڑا - اب ۱۲۰۶ء میں جب قطب الدین ایبک نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو یہاں کی زبان بجائے لاہوری کے دہلوی تھی جو کئی زبانوں سے متاثر ہو کر اپنی ایک انفرادیت مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی - وہ نہ تو خالص بھاشا تھی نہ خالص کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش سے روایات میں جکڑی ہوئی زبان تھی جس پر راجستھانی اور برج بھاشا کا اثر نمایاں تھا -

ہندوستان کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں ہوئی تھی اس لئے سولھویں صدی سے زیادہ پرانے نمونے نہیں مل سکے - لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسی دہلوی زبان کی بنیاد پر اردو کا ڈھانچہ قائم ہوا جو زیادہ تر اپ بھرنش کا اثر لئے ہوئے تھی -

پنجاب[۱] سے مسلمان فارسی آمیز پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے۔ دہلی میں اور اس کے آس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوئی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی کھڑی بولی اور دوسری طرف پرانی ہریانی بولی جاتی تھی۔ چونکہ کسی زمانے میں مشرقی پنجابی زبان خود انہیں دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی اس لئے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انہوں نے اس کی صوتیات اور صرف و نحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا اس قربت کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب برج بھاشا کے بجائے انہیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے دہلی بار بار ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ آباد ہوتی تھی۔ چنانچہ شاہجہاں کے وقت میں دہلی کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی گئی تھی جس کی آبادی آگرہ کے آنے والوں سے بھی بسی تھی۔ ان آنے والوں کی بولی برج بھاشا تھی۔ اس لئے برج بھاشا کا اثر اس نئی بولی پر زیادہ پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو سے پنجابی کا اثر رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ لب ولہجہ بدلنے لگا اور ہندوستان کا اپنا معیار اس وقت قائم ہوا جب وہ ایک طرف بادل۔ لٹا۔ گڈی کے بجائے بادل۔ لوٹا، گاڑی استعمال کرنے لگے۔

محمود غزنوی کے زمانے سے ہندوستان کے بعض الفاظ ہم کو فارسی کے مستند شعراء کے یہاں ملنے لگتے ہیں۔ مثلاً فردوسی نے ایک شعر میں کوتوال کا لفظ استعمال کیا ہے جو خالص ہندی لفظ ہے "کوٹ" اور "والا" سے مرکب ہے کوٹ = قلعہ اور والا مخفف وال بمعنی مالک محمود غزنوی کے لڑکے سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ کا فارسی شاعر منوچہری کے یہاں لنگھن، اور حکیم سنائی کے یہاں

---

[۱] تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسن

"پانی" کا لفظ شعر میں آیا ہے۔ اسی طرح پرتھوی راج کے زمانے میں بھی ہندوستانی شعرا کے یہاں بے شمار عربی و فارسی الفاظ ملنے لگتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے علاوہ جملے بہت کم ملتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں لکھی ملتی جو مسلسل عبارت کے ساتھ اس نئی زبان کا نمونہ پیش کر سکے۔ صوفیوں اور سادھوؤں کے اقوال البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں امیر خسرو کا اس زبان میں اشعار کہنا تو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی فارسی مثنویوں میں ہندی زبان، ہندی اشیاء کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اور علاوہ اس کے خود ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ میرا ایک دیوان ہندی میں بھی ہے لیکن یہ دیوان نایاب ہے کسی نے دیکھا نہیں جو اشعار۔ پہیلیاں، مکرنیاں ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ محل گفتگو ہیں کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ کلام واقعی امیر خسرو کا ہے۔ اس لئے اس کو پرانی اردو کا نمونہ سمجھنا خطرہ سے خالی نہیں بہرحال الفاظ اور فقروں کے نمونے ہیں محمود غزنوی، پرتھوی راج وغیرہ کے مصنفین اور بزرگان دین کے فیض سے برابر ملتے آئے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نئی زبان روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

اس زبان کی ترویج میں فوجیوں کا بھی بہت کچھ حصہ ہے۔ یہ نئی زبان ابتدا میں برج بھاشا اور کھڑی بولی اور راجستھانی سے مل کر چلتی ہے لیکن بعد میں کھڑی بولی پر زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے۔ اس زور کا بڑا سبب فوجیوں کا ملک میں پھیلنا تھا۔ سلاطین دہلی کی فوج میں بھرتی۔ انبالہ، کرنال۔ حصار اور دہلی کے جنوب میں میوات کے علاقہ سے کی جاتی تھی[۱] گریرسن نے ان اضلاع کی ہندوستانی (کھڑی بولی) کو معیاری اور ادبی اردو سے قریب تر بتایا ہے۔ یہ زبان فوجیوں کی آمد و رفت سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل رہی تھی

---

[۱] ہملٹن بحوالہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسن صفحہ ۵۳

اور اس کی اہمیت و عزت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ دہلی کی مرکزیت اور اس کے تمدن کا اثر تمام ہندوستان پر ہو رہا تھا۔ اس کا تمدن اس کی تہذیب سارے ملک میں وقعت سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کی زبان کو بھی لوگ دلچسپی سے سننے اور بولنے کی فکر کرتے تھے۔ ہندوستان میں گوتم بدھ ہی کے زمانے سے مذہبی پیشواؤں نے اپنے خیالات کی اشاعت ملک کی عام فہم زبانوں میں کی تھی۔ اس وقت یعنی سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی صوفیائے کرام اور دوسرے بزرگان دین کا یہی رویہ رہا چنانچہ علاوہ اور لوگوں کے لسانی تحریک میں ہم کو سب سے زیادہ مدد کبیر داس کی تحریک اور شاعری سے ملتی ہے۔

کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک ہے۔ کبیر داس کے کلام میں ملی جلی زبان ملتی ہے۔ جس میں کھڑی بولی برج بھاشا، راجستھانی اور کبھی کبھی پنجابی کے اثرات نمایاں ہیں۔ غرض کہ اس نئی زبان یعنی اردو کا ارتقا عوام کے ہاتھوں ہوتا رہا۔ ہندوستان کی مختلف مروجہ زبانوں کو سمیٹ کر ایک نیا خاکہ تیار ہو رہا تھا گویا بقول ڈاکٹر مسعود حسن کثرت میں وحدت کا نقش ابھر رہا تھا۔ کبیر کے یہاں بھی بے شمار عربی و فارسی الفاظ اور محاورے مل جاتے ہیں۔ کبیر کی تقلید لسانی گرو نانک نے بھی کی چنانچہ ان کے یہاں بھی فارسی و عربی الفاظ وغیرہ بہت کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہاں بھی گرامر کا ڈھانچہ وہی ملتا ہے۔ جو کبیر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ کھڑی بولی کے اسماء، افعال اور ضمائر بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں۔ اور بعد میں اسی کی گرامر پر زور دے کر اردو کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ اس لئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اردو زبان نہ برج بھاشا سے بنی نہ پنجابی سے بلکہ مخلوط زبانوں سے متاثر ہو کر کھڑی بولی پر اس نے اپنی بنیاد قائم کی۔ یہ نئی زبان اپنی مقبولیت کی وجہ سے برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ جب بابر ہندوستان آیا

تو یہ زبان ایک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے ہمراہی شروع شروع اس زبان کو نہ سمجھے ہوں لیکن بابر نے اپنی دلچسپی کا ثبوت بہت جلد دیدیا اور اس نے ایک شعر اسی زبان میں کہدیا۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسیتو پانی و روتی

یہ زبان اپنی انفرادیت کو لیکر آگے بڑھ رہی تھی۔ بابر کے بعد ہمایوں کے دربار میں بھی اسی کا چرچا تھا لیکن اکبر کے وقت میں اس کی ترقی کو صدمہ پہنچا کیونکہ اکبر نے اپنی حکومت کا مرکز بعض مصلحتوں سے زیادہ تر آگرہ کو رکھا جہاں برج بھاشا اور راجستھانی بولیوں کا اثر تھا اور چونکہ متھرا میں مذہب کی وجہ سے برج بھاشا کا تنہا اثر تھا اور یہ علاقہ آگرہ سے قریب تھا اس لئے اس نئی زبان کی نشو و نما میں برج بھاشا اور راجستھانی سدراہ ہوئیں۔ اسی زمانے میں شاہی محلوں میں راجپوت رانیاں تھیں۔ دربار میں ہندی سنگیت کا زور تھا اور سنگیت کی اصطلاحات اور زبان پر برج بھاشا کا غلبہ تھا اس لئے بھی برج بھاشا کا اثر تیز ہوتا گیا۔ چنانچہ اکبر سے جو دوہے منسوب کئے گئے ہیں وہ بھی برج بھاشا میں ہیں اور پھر اسی کے سپاہ سالار عبدالرحیم خانخاناں نے برج بھاشا میں اس پایہ کی شاعری کی کہ وہ آج بھی اس زبان کے بہت بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں غرض کہ اس دور میں برج بھاشا کا اتنا زور ہوا کہ کھڑی بولی جو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی تھی کچھ دنوں کے لئے دب گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کھڑی بولی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ اس نرغے میں بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ ثبوت کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اکبر ہی کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۲ء میں ودچند چھند ورنن کی مہما کھڑی بولی میں لکھی۔ اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کر دینا مفید مطلب ہوگا

اس سے مثال ملاحظہ ہو[1]

"اکبر شاہ جی عام کھاس (خاص) ہیں تکھت (تخت)
اوپر ودراجمان ہو رہے اور عام کھاس بھرنے لگا ہے جس میں
تمام امرا دائے آئے کورنش بجلائے جہاد کرکے اپنی اپنی بیٹھک
پر بیٹھ جا کریں۔ اپنی اپنی مسل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم کے
رسے ہیں، ریسم کی لوہیں پکڑے پکڑے کھڑے تاجیم (تعظیم) ہیں
رہے۔"

اس اقتباس میں فارسی۔ عربی اور سنسکرت کے الفاظ کے میل جول کے علاوہ گرامر بھی قابل غور ہے۔ اب ہم زبان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی اور برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اپنی ارتقائی منزل طے کر رہی تھی بلکہ برج بھاشا سے کچھ قبل ہی وہ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اکبر کے زمانے سے اس کھڑی بولی کو صدمہ پہونچتا ہے۔ برج بھاشا کو زور حاصل ہوتا ہے۔ سنسکرت کے الفاظ زیادہ آنے لگتے ہیں۔ شاہجہاں اسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ جب شاہجہاں نے آگرہ چھوڑ کر نئی دہلی آباد کی تو دہلوی زبان کو پھر عروج ہوا کیونکہ یہاں وہی زبان رائج تھی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی کھڑی بولی جس پر تھوڑا بہت اثر برج بھاشا، پنجابی۔ راجستھانی کا بھی تھا۔ لیکن بایں ہمہ کھڑی بولی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اور عوام میں اسی کا غلبہ تھا۔ اور اب شاہجہاں کے آنے سے اس کا زور اور زیادہ ہو گیا۔ غالباً اسی وجہ سے اردو کو شاہجہاں سے زیادہ قریب سمجھ کر شاہجہانی اردو کہا جاتا ہے

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۳۳۶ بحوالہ تاریخ زبان اردو (مسعود حسن صفحہ ۱۷)

دہلی کی فضا میں اس وقت کھڑی بولی اپنا قدم جما رہی تھی گو برج بھاشا بھی آگرہ سے دہلی گئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر کم ہوتا گیا اور کھڑی بولی کو عروج حاصل ہوتا گیا کھڑی بولی نے اپ بھرنش کی قدیم ادبی روایات اور پنجابی اثرات کا جوا اپنے سر سے اتار پھینکا۔ اس وقت کے کئی ایک ہندی لکھنے والوں کی زبان کے نمونے ایسے ملتے ہیں جن میں 'ہوا ہے'، 'سن کر'، 'کرتا ہے'، 'ہوتا ہے'، 'دیکھتا نہیں' وغیرہ کو دیکھ کر نئی ہندوستانی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ زبان تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کر کے برج بھاشا کو بھی پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور اورنگ زیب کے زمانے میں اس زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کا نام اردوئے شاہی بھی کہیں کہیں ملنے لگتا ہے۔

اب مسلمان شعراء نے عبدالرحیم خانخاناں کی طرح برج بھاشا کی شاعری کو ترک کر کے اسی اردوئے شاہی کو اپنانا شروع کیا۔ برج بھاشا اور فارسی دونوں کو اس نئی زبان نے پیچھے کر کے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ دہلی کے آنے سے بھی پہلے یہاں اس نئی زبان نے شعروشاعری کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ یہ زبان عام طور سے یہاں بول چال اور لکھنے پڑھنے والے طبقوں میں رائج ہو گئی تھی۔

شمالی ہندوستان میں تو اردو زبان کا بیج اس طرح بویا گیا جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں مگر دکنی ہند میں کچھ اس سے مختلف طور پر اردو کی نشوونما میں کام ہوا علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے دکن پر شمال کے بادشاہوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا۔ ۱۳۲۹ء میں محمد تغلق نے شہر دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ یہ شہر اس کو اتنا پسند آیا کہ اس نے حکم دے دیا کہ ہر شخص دہلی سے دکن چلا جائے۔ شاہی حکم تھا ہر شخص مجبور تھا غریب

قریب ساری آبادی دہلی کی دکن منتقل ہوگئی دہلی کے لوگ اپنے جان ومال کے ساتھ اپنی نئی زبان بھی لیتے گئے۔ اس نئی زبان کا اثر اس تیزی سے ہوا کہ شمالی ہند بھی راہ ترقی میں پیچھے رہ گیا۔ دکن والوں نے اس زبان کو اپنے ہاں کی بولیوں میں شامل کر کے دکنی اردو کا نیا باب کھول دیا۔ عوام و خواص اس میں دلچسپی لینے لگے۔ یہاں بھی بزرگان دین کی مدد سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ان بزرگوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور مذہب کی تبلیغ اسی نئی زبان میں کی جس سے نئی زبان کو مقبولیت کا اور سہارا مل گیا۔ یہ زبان یہاں کچھ اس تیزی سے بڑھی کہ باوجود اس کے کہ شمالی ہند کے مقابلے میں یہ بہت بعد میں آئی تھی مگر وہاں سے زیادہ یہاں کامیاب ہوئی چنانچہ دکن میں اردو کے تحریری نمونے اسی وقت سے ملنے لگتے ہیں جب شمالی ہند میں کہیں کوئی ادبی کارنامہ نہیں دکھائی دیتا۔ دکن میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ اس زبان میں بہمنی دور سے ملنے لگتا ہے۔ چنانچہ بندہ نواز خواجہ گیسو دراز جو فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے ان کے تین رسالے تصوف کے متعلق اب تک موجود ہیں۔

(۱) معراج العاشقین (۲) ہدایت نامہ

(۳) رسالہ سہ بارہ ، زبان کا نمونہ ان کی ایک کتاب معراج عاشقین سے ملاحظہ فرمائیے۔

"اے عزیز دو اصلان خدا سوں ملنا جدا ہونا یو دونوں بھی ہیں یو بات پیر سوں معراج کو خبر دے کر یو بندے کو سرفراز کر۔"

اسی دور میں ان کے علاوہ ان کے پوتے عبداللہ حسینی بھی اہل قلم تھے انہوں نے بھی نشاط العشق کا دکھنی ترجمہ لکھا ہے۔ اور اس کی شرح بھی لکھی ہے اسی دور کا ایک اور مشہور شاعر نظامی بھی ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی

کے زمانے میں سلطان کا درباری شاعر تھا۔ اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اس کی یادگار ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہو گئیں مگر اس زبان کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا ہر عہد میں ہم کو ممتاز شعرا اور نثر نگار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فہرست اتنی لمبی چوڑی ہے کہ سب کا ذکر کرنا اس جگہ ناممکن ہے۔ ہم صرف خاص خاص ادیبوں کا ذکر یہاں کریں گے تاکہ آپ کو دکن کی ادبی خدمات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

شاہ میراں جی

اپنے وقت کے زبردست صوفی تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۹۰۲ھ میں ہوا۔ آپ کے مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ وعظ و نصیحت میں عموماً دکنی زبان استعمال کرتے تھے جو عام طور سے یہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ کئی ایک تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان کی نثر کی کتابوں کا ذکر حصۂ نثر میں آئے گا۔ یہاں ان کی نظموں کے تین مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) خوش نامہ ۔۔ ۱۱۷۰ شعر کی ایک مثنوی ہے۔

(۲) خوش نغزیہ ۷۲ شعر کی چھوٹی سی مثنوی ہے۔

(۳) شہادت الحقیقت۔ میراں جی کی سب سے زیادہ اہم اور طویل نظم ہے اس میں ۵۶۳ بند ہیں۔ تصوف سے متعلق ہے اسلوب بیان اور زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔

شاہ میراں جی کی نظموں کا موضوع تصوف ہے " ان کے کارنامے اگرچہ ادبی حیثیت سے زیادہ اہم نہیں لیکن لسانیاتی نقطہ نظر سے بے حد وقعت حاصل ہے [1] "

---

[1] اُردو شہ پارے

شاہ بُرہان الدّین جانم

شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ باپ کی طرح صوفی اور صاحب علم تھے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا۔ کئی ایک تصنیفات ان کی یادگار ہیں جن میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں۔

وصیت الہادی۔ ایک مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف ہے

رمز الواصلین }
بشارت الذکر } ان دونوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے

ارشاد نامہ۔ اس کے ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ صوفیانہ اعتقادات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے نظم کا زیادہ حصہ مکالمہ کی صورت میں ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کی کتابوں کا موضوع زیادہ تر تصوف ہے لیکن کبھی کبھی انہوں نے دوہرے اور غزلیں بھی کہی ہیں اس سے اپنے باپ سے زیادہ بامذاق شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کے کلام میں میراں جی کے کلام سے زیادہ سادگی ہے۔ حتی الوسع فارسی اور عربی الفاظ کو استعمال کرنے سے احتراز کرتے تھے۔

---

[1] دکن میں اردو (بار سوم) صفحہ ۱۴۷

نصرتی

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا (۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے نصرتی کا باپ اپنے وقت کے لوگوں میں بہت باوقار و با اثر تھا۔ چنانچہ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔

نصرتی کی تین تصنیفوں کا پتہ چلتا ہے۔

گلشن عشق۔ اس میں کنور منوہر اور مدمالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔

علی نامہ۔ علی عادل شاہ کے واقعات کے علاوہ چند قصائد بھی اس میں شامل ہیں۔

تاریخ اسکندری۔

نصرتی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے نصیر الدین صاحب ہاشمی فرماتے ہیں "نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادر الکلامی کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ گلشن عشق میں انسانی جذبات اور خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے"[1]

---

[1] دکن میں اردو

ہاشمی

سید میراں نام تھا ہاشمی تخلص بعض تذکروں میں ان کا سنہ انتقال ۱۶۸۸ء اور بعض میں ۱۶۹۷ء ہے[1] - یہ مادر زاد اندھے تھے -

ہاشمی نے غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے چنانچہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے - اس کے علاوہ ہاشمی نے مرثیہ بھی کہا ہے -

ان کی ایک مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے - جس کو مصنف دکن میں اردو، نے دیکھا ہے - یہ کتاب ۱۰۹۹ء میں ختم ہوئی اس کا ایک نسخہ جرمن کے کتب خانہ میں اور ایک آغا حیدر حسین دہلوی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے

سیوا

یہ ایک خاص پایہ کے شاعر تھے - ان کا وطن گلبرگہ تھا ۱۶۸۰ء میں انہوں نے فارسی روضتہ الشہدا کا اردو زبان میں ترجمہ کیا - مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس نے کی شہرت میں چار چاند لگا دئے - اسی دور میں ایک اور شاعر رام راؤ تھے جو مرثیہ گو تھے اور شاہی امرا میں داخل تھے -

---

[1] اردو شہ پارے

قطب شاہی دور

سلطان قلی قطب شاہ اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا سنہ ۹۱۶ھ میں اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اس کے بعد اس کو قتل کر کے اس کا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سبحان جو ابھی نابالغ تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ ان بادشاہوں کو سیاست اور حکومت نے مہلت نہ دی کہ اردو کی طرف التفات کرتے اور کوئی کارنامہ اپنی یادگار میں چھوڑ جاتے حالانکہ پہلا بادشاہ یعنی سلطان قلی قطب شاہ نہایت ہی علم دوست اور قابل آدمی تھا مگر ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس وقت کسی نے اردو نظم پر طبع آزمائی کی ہو۔

اردو کا پتہ اس خاندان کے چوتھے بادشاہ یعنی ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے تیس سال تک نہایت شد ومد کے ساتھ سلطنت کی یہ بادشاہ علم پروری اور خوش اخلاقی میں شہنشاہ اکبر سے کم نہ تھا۔ ہندوؤں سے اسے بھی انس تھا اکثر نہایت ممتاز عہدوں پر ہندو مامور تھے اس کے دربار میں اہل کمال کا مجمع رہتا اور لوگ ادبی شغل میں مصروف رہتے۔ اس زمانہ میں اردو کی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔

محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہی خاندان میں محمد قلی قطب شاہ غالباً سب سے زیادہ اور بلند پایہ بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا دور حکومت ۳۱ سال تک یعنی ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک رہا۔ اس کے دور حکومت میں سلطنت کو ہر طرح کا فروغ ہوا وہ خود ایک زبردست

شاعر تھا۔ اس کے کلام کا ذخیرہ نہایت وافر ہے جس کو اس کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے اس کے مرنے کے بعد ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا اور ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر زور کی جدید ترتیب سے ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا اسلوب بیان نہایت سادہ اور عبارت سلیس ہے۔ اس کی شاعری مقامی خصوصیات سے مملو ہے۔ ہندوستان کے رسم و رواج اور تہواروں پر اس نے کافی نظمیں کہیں۔ یہاں کے میووں، ترکاریوں، پرندوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے کلام پر ہندی شاعری کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں میں لطافت اور عاشقانہ عنصر بہت کافی ہے۔

کلیات قلی قطب شاہ میں ہم کو مثنوی۔ قصیدہ ترجیع بند۔ مرثیے۔ غزل سب ہی اصناف سخن ملتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے اس کی قادرالکلامی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

وجہی

وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اس قطب شاہ کا زمانہ حکومت ۹۵۷ھ سے ۹۸۸ھ تک ہے۔ انہوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آخر وقت تک اپنے دور کے بڑے کامیاب شاعر سمجھے جانے لگے وجہی نے غالباً کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ وجہی کی دو کتابیں قطب مشتری اور سب رس، بہت مشہور ہیں۔ قطب مشتری ایک مثنوی ہے جس میں بادشاہ قطب کی تعریف اور اس کے عشق کی داستان بڑی خوبی سے قلمبند کی

گئی ہے ۔ یہ مثنوی ۱۰۱۸ھ میں کہی گئی چنانچہ وجہی کا کہنا ہے کہ

تمام اس کیا دیس بارا منے　　　　سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا بنے

انجمن ترقی اردو نے اس مثنوی کو شائع کر دیا ہے ۔ یہ مثنوی دکن کی بلند پایہ مثنویوں کے ہم پلہ نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ بادشاہ وقت کی محبت کی کہانی ہے ۔ ایک طرح سے نیم تاریخی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کے علاوہ اس مثنوی سے اس زمانہ کی طرز معاشرت و تمدن کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اس مثنوی کی ضخامت تقریباً دو ہزار اشعار کی ہے ۔ اس مثنوی کے علاوہ وجہی نے غزل اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے ۔

سب رس ۔ وجہی کی بڑی اہم کتاب ہے حسن و دل کے پیرایہ میں تصوف کے مسائل نہایت خوبی سے ایک قصہ کے پیرایہ میں قلم بند کیے گئے ہیں انسانی جذبات کی کشمکش اس کتاب میں نہایت خوبی سے پیش کی گئی ہے ۔ اردو میں غالباً رمزیہ انداز بیاں کی پہلی تصنیف ہے یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے ۔ نصیرالدین ہاشمی کی رائے ہے کہ یہ کتاب غالباً وجیہہ الدین گجراتی کی تالیف کا ترجمہ ہے جس کو وجہی نے ۱۰۴۵ھ میں مرتب کیا ۔

محمد قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا تھا ۱۰۲۰ھ سے لے کر ۱۰۳۵ھ تک اس نے بادشاہت کی ۔ چچا کی طرح یہ خود بھی بہت بڑا علم دوست اور اہل کمال کا سرپرست تھا ۔ خود بھی شعر کہتا تھا چنانچہ دو دیوان اب تک موجود ہیں ۔ ایک فارسی میں ہے اور ایک اردو میں ۔

محمد قطب شاہ کے کلام میں بھی لطافت و سادگی کافی ہے۔ اس نے بھی رباعی و غزل وغیرہ پر طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

شوقیؔ

ان کا نام حسن تھا اور شوقیؔ تخلص ان کی بھی دو کتابیں اب تک موجود ہیں۔ پہلی ایک رزمیہ مثنوی ہے اس کا نام ظفر نامہ نظام شاہ ہے جو ایک مشہور جنگ کی تاریخ ہے یہ جنگ والی وجیانگر رام راج اور دکن کے مسلمانوں میں ہوئی تھی۔ اس وقت کے تاریخی اور معاشرتی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی دوسری کتاب کا نام "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" ہے یہ مثنوی ایک عاشقانہ انداز میں ہے جس میں بادشاہِ وقت یعنی محمد عادل شاہ کی شادی کا تذکرہ ہے۔

عبداللہ قطب شاہ

اس نے تقریباً پچاس سال تک حکمرانی کی یعنی ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکومت کا سلسلہ جاری رہا اس کے زمانہ میں اردو ادب کا آفتاب دکن میں نصف النہار تک پہنچ گیا تھا۔ یہ بادشاہ نہایت زبردست عالم اور شاعر تھا۔ اس کا بھی کلام اور بادشاہوں کی طرح فارسی اور دکھنی زبان میں موجود ہے۔ اس کا تخلص عبداللہ تھا۔ اس کا کلام زبان کے لحاظ سے اس کے پیشرو محمد قطب شاہ سے زیادہ صاف ہے لیکن تخیل میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے کم رتبہ ہے۔ امیر خسرو کی طرح کبھی کبھی

عبداللہ کے کلام میں بھی فارسی عبارت اردو کے ساتھ دست و گریبان نظر آتی ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنۂ زمانہ
گفتا کہ راست گفتی اے گن بھرے سجانا

گفتم کہ در جہاں یا لیلیٰ ہوائی ہے توں
گفتا کہ من چو مجنوں پائیں ہو تجھ دِوانا

غوّاصی

یہ بھی سلطان محمد قطب شاہ کے وقت میں ایک ممتاز شاعر تھے ۔ ان کی دو کتابیں مشہور ہیں ایک کا نام "سیف الملوک و بدیع الجمال" ہے یہ مثنوی ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی اس میں تخمیناً دو ہزار شعر ہیں اور دوسری مثنوی کا نام "طوطی نامہ" ہے اس میں چار ہزار شعر ہیں یہ ۱۰۴۹ھ میں ختم ہوئی ۔

غواصی نے غزل اور مرثیے بھی لکھے ہیں ان کے کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے ۔ مگر کافی دل کش ہے

ابن نشاؔطی

ابن نشاؔطی بھی اس دور کے مشہور شاعر ہیں۔ ابتدا میں یہ نثر نویس تھے رفتہ رفتہ نظم میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے جو ان کے حیاتِ جاودانی کا باعث ہوئی۔ پھول بن، ان کی وہ مثنوی ہے۔ جس پر ان کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے یہ تصنیف

۱۰۷۶ھ کی ہے زبان و بیان کے لحاظ سے یہ نہایت قابل قدر مثنوی ہے رسوم و طرز معاشرت کو جا بجا بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

ابوالحسن تاناشاہ

تاناشاہ نے قریب پندرہ سال تک بادشاہت کی ۱۰۹۸ھ میں اس کے ساتھ قطب شاہی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور اس کے عہد میں اردو کے اور بھی شاعر تھے لیکن تاناشاہ کا کلام کسی کتاب کی صورت میں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی معزولی اور قید کی تکالیف نے اس کی شاعری کو نہ تو ابھرنے ہی دیا اور نہ اس کی کچھ شہرت ہی ہوئی[۱]

فائز

تاناشاہ کے دور کے شاعر ہیں۔ ان کو ادب سے فطری شغف تھا۔ ان کی ایک مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" نہایت دلچسپ اور دلکش ہے۔ ان کے کلام میں ہندی کے بجائے فارسی الفاظ اور ترکیبیں کافی تعداد میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاناشاہ کے عہد حکومت میں فارسی کا دخل دکنی زبان میں کافی ہو گیا تھا۔

---

[۱] اردو شہ پارے صفحہ ۱۱۹

بحری

ان کا نام قاضی محمود تھا چونکہ باپ کا نام بحر الدین تھا اسی وجہ سے بحری تخلص کیا۔ بحری کے سوانح حیات پردہ راز میں ہیں باوجود تحقیق و جستجو کے ابھی تک ان کی زندگی کے متعلق ان حالات سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا جو ان کی تصانیف من لگن، وغیرہ کے دیباچے سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

نصرت آباد کے نواح میں موضع گوگی کے رہنے والے تھے ۱۰۹۸ھ میں بیجاپور جا بسے بیجاپور کی تباہی پر حیدرآباد کا رخ کرنا پڑا۔

بحری ولی کے ہمعصر تھے۔ ان دونوں کے کلام میں زبان و بیان کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ بحری نے سنسکرت الفاظ ولی سے زیادہ استعمال کئے ہیں۔ بحری روشن دل صوفی بزرگ تھے اس لئے تصوف کی اصطلاحات ان کے یہاں بکثرت ہیں۔

بحری نے اپنے اشعار میں اعتراف کیا ہے کہ وہ فن شاعری اور اصطلاحات سخن سے واقف نہ تھے۔ کسی استاد فن عالم یا شاعر سے استفادہ نہ کیا تھا لیکن پھر بھی بقول ڈاکٹر حفیظ سید[1] صاحب وہ شاعرانہ حیثیت سے کسی طرح بھی ولی و نصرتی سے کم نہ تھے اس کے باوجود بھی وہ غیر معروف رہے حفیظ سید صاحب نے اس کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ اول تو بحری نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گوگی میں گزارا۔ جہاں وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور تھے وہ زیادہ تر مذہبی و صوفیانہ مضامین نظم کرتے تھے دوسرے یہ کہ اور مشہور شعراء کی

[1] لیکچرار شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی جنہوں نے بحری پر قابل قدر مقالہ لکھا ہے۔

طرح ان کو شاہی سرپرستی نہ مل سکی جو ان کی شہرت کا سہارا ہوتی۔
بحری نے تین تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

ایک دیوان غزلیات
دوسری مثنوی "من لگن"
تیسری مثنوی بنگاب نامہ

اشرف

اشرف اپنے وقت کے نہایت مشہور شاعر ہیں۔ ان کی ایک مثنوی جس کا نام "جنگ نامہ" ہے اور جس میں حضرت علیؓ کی لڑائیوں کا ذکر ہے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ مصنف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء کتاب کے خاتمہ پر بیان کیا ہے۔

اشرف نے مرثیے بھی کہے ہیں جن میں جذبات اور فطرت نگاری کو نہایت خوبی سے مدنظر رکھا ہے۔

اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
بہ رنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی ہیں شاد دیں کے ہے وطن میرا

ولی

ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔ یہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے ایک زمانہ میں خیال تھا کہ یہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام دیوان کی صورت میں مل سکا ہے۔ لیکن یہ خیال اب غلط ثابت ہو گیا اس لئے کہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی مل گیا اور چھپ بھی گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ تقریباً سو سال پہلے ولی کے مرا ہے۔ اس لئے فی الحال اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے۔

ولی اپنے وقت کے سب سے زیادہ مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ ان کا احسان صرف دکن تک محدود نہ تھا بلکہ شمالی ہند کو بھی ان کی ذات سے فائدہ پہنچا۔ ولی کو سیر و سیاحت کا کافی شوق تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دکن سے دلی آئے تھے۔ سورت اور احمد آباد بھی گئے تھے۔

کلیات ولی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی قریب قریب اردو کے ہر صنف شاعری پر قادر تھے۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی، مستزاد۔ قطعہ ترجیع بند مثنوی، کے علاوہ کچھ چیزوں پر اور بھی ولی نے طبع آزمائی کی ہے جس کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں بعض اصناف سخن ایسی رائج تھیں جواب نہیں.... جیسے ثلاثی چار در چار بازگشت اور قریب قریب ہر صنف شاعری کو ولی نے نہایت خوبی اور کامیابی سے نبا ہا ہے۔

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے یہاں تغزل کے علاوہ اخلاقی مضامین وغیرہ بھی موجود ہیں گو باتیں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر جہاں

مضمون آفرینی کرتے ہیں وہاں تخیل کی گہرائی قابل دید ہوتی ہے خاص کران مقامات پر جہاں تصوف کے نکات بیان کرتے ہیں چونکہ خود صوفی منش تھے اور برسوں خانقاہوں میں رہ کر درس معرفت حاصل کر چکے تھے اس لئے معنویت کے ساتھ پرلطف طریقے سے رموز حقایق قلم بند کرتے ہیں جس سے غزل میں ایک جان سی آجاتی ہے۔ ولی کی زبان عموماً صاف وشیریں ہے۔ پرانے اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے کہیں کہیں الجھن ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس کا شکوہ بیکار ہے بلکہ قابل قدر بات تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اتنے پرانے زمانے میں تھے انہوں نے فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور ہندی اور فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے اپنے کلام کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ دلکشی اور صفائی ہر جگہ نمایاں ہے یہاں تک کہ بعض اشعار پر دھوکا ہوتا ہے کہ شاید آج کے کہے ہوئے ہیں۔

ولی کی غزلوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے لیکن برجستگی اور کیف کی وجہ سے بیان میں مزہ کافی رہتا ہے۔ چونکہ صاحب معرفت تھے لہٰذا دل کے سوز و گداز کا اثر کلام میں بھی نمایاں ہے اور سادگی بیان کی وجہ سے تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔

ان کی تشبیہات و استعارات میں جدّت ہے اور غالباً اس جدّت کے لئے انہیں وقت بھی نہ اٹھانی پڑی ہوگی اس لئے کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی جہاں سے چاہتے ہوں گے۔ نئی چیزیں لے آتے رہے ہوں گے۔ معشوق بعض اداؤں کا خیال کرکے اس کو بانکے پٹھان کہہ دیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملے گی اور یہیں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کمال معمولی سی چیز کو موقع سے ملا کر غیر معمولی بات پیدا کر دیتا ہے۔

ولی کے قصائد پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں جب زبان ابتدائی حالت میں تھی کیونکر انہوں نے اتنے زوردار قصیدے کہے ہوں گے۔

جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہیئے وہ سبھی موجود ہیں۔ شوکت الفاظ بھی ہے زور بھی ہے اور مشکل زمین کے ہوتے ہوئے روانی بھی بہت ہے۔ ان کے قصائد میں محاکاتی عنصر بھی خوبی کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔

دکنی نے دہلی میں آکر یہاں کی زبان کا اتنا اثر لیا کہ دکھنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور محاوروں کو اپنے کلام میں جگہ دینا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی الفاظ اور مقامی اثرات جو اردو زبان میں آرہے تھے وہ کم ہونے لگے اور فارسی الفاظ و تخیل زیادہ زور کے ساتھ اردو میں داخل ہونے لگے چونکہ دہلی کے اس وقت کے شعرا دکنی کے کلام سے متاثر تھے اس لئے انہوں نے بھی یہی رنگ اپنی شاعری کو دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرز تخیل اور طرز بیان دونوں میں فارسی کا اثر غالب ہوگیا۔ دکنی کے آنے سے پہلے ہی شمالی ہند میں اردو زبان اور شعر کا چرچا عام ہوگیا تھا۔ یہاں بزم سخن پہلے ہی سی جمی تھی دکنی کی آمد نے اس بزم میں تازگی پیدا کردی۔ دکنی اردو شعرا کے ذکر کے بعد ضروری ہے کہ شمالی ہند کے اردو ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا جائے چنانچہ اب یہاں سے ہم شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ پیش کریں گے۔

دکن کی ابتدائی خدمات

دکن میں زبان نے جس طرح ترقی کی اس کا مختصر ذکر کردیا گیا۔ اسکی تفصیل میں زیادہ پڑنا تحصیل حاصل ہے۔ زبان سے ادب کی طرف رجوع ہوتے وقت ہمیں دکن کی جو ادبی خدمات نظر آتی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی ناانصافی ہوگی

یہی اس مختصر کتاب میں دکن کے سارے شاعروں اور ادیبوں کا مفصل ذکر بھی قریب قریب غیر ممکن تھا۔ اس لئے ہم نے چند مخصوص شعرا کو لے کر ان کی ادبی خدمات کا مختصر ذکر کیا اس کے بعد اب یہ زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی تبصرہ کے طور پر اس اصناف شاعری کا ذکر کر دیں جس کی دکن میں ترقی ہوئی۔

اردو میں شروع سے اب تک جن اصناف کا عموماً رواج رہا ہے ان میں غزل قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ زیادہ نمایاں ہیں۔ غزل ایسی چیز ہے جس پر قریب قریب ہر شاعر نے طبع آزمائی کی۔ قصیدہ کم لوگوں نے کہا۔ مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئیں۔ مرثیوں کی رفتہ رفتہ کافی ضخامت ہو گئی یہ مان لینے کے بعد کہ غزل اردو کے قریب قریب ہر شاعر نے کہی اور اس میں فارسی کے شاعروں کی تقلید بھی کی دکن کی غزلوں پر کوئی تفصیلی تبصرہ بیکار ہے۔ اس لئے کہ ان میں ہمیں کوئی خاص بات نہیں ملی سوائے اس کے کہ دکنی دور کی غزلوں پر مقامی تخیل زیادہ نمایاں ہے۔ قصیدہ نگاری کی دکن میں بھی کمی رہی صرف نصرتی ایک ایسا شاعر ہے جسے ایک بلند پایہ قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے اس لئے محض ایک شاعر کی وجہ سے قصیدہ نگاری کی کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دکن میں قصیدوں کی بھی مہتمم بالشان داغ بیل پڑ چکی تھی۔

دو خاص چیزیں جو اس سے زیادہ توجہ کی محتاج ہیں مثنوی اور مرثیہ ہیں۔ ان کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے کہ شمال میں آنے سے پہلے ان دو چیزوں نے دکن میں کتنی ترقی کر لی تھی۔

مثنوی۔ جس طرح شمال کے شاعروں میں سے کوئی ایک بھی ایسا مشکل سے ہوگا جس نے غزل نہ کہی ہو اسی طرح دکن کے شاعروں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ملے گا جس نے مثنوی نہ لکھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی مثنویوں میں ہر قسم کی مثنویاں موجود ہیں۔ ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جنہیں صرف مذہب سے تعلق ہے اور صوفیانہ

مسائل سے پُر ہیں۔ مثال کے لئے میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کی مثنویاں پیش کی جا سکتی ہیں ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جن میں صرف حسن وعشق کے قصے اور واردات قلب کی داستانیں دہرائی گئی ہیں ایسی مثنویاں ایک دو نہیں پچاسوں ہیں مثال کے لئے غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال۔ جنیدی کی ماہ پیکر۔ طبعی کی بہرام وگل اندام، فائز کی رضوان شاہ و روح افزا۔ عاجز کی قصہ لال گوہر۔ مشہور عشقیہ مثنویاں ہیں۔

یہی زمانہ ہے جس میں مختلف زبانوں کی بہترین مثنویاں اردو کے قالب میں ڈھالی گئیں۔ یوسف زلیخا فارسی کی مشہور مثنوی ہے۔ ہاشمی اور امین نے اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ اسی عہد میں مثنویوں کی شکل میں سوانح عمریاں لکھی گئیں اور ان سے تاریخ کا کام لیا گیا۔ اس حیثیت سے نصرتی کا علی نامہ اور مومن کا اسرار عشق بھی بہت مشہور ہے نام کی مثنویاں ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ اسے بھی چھوڑئے یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مثنوی کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے رسم ورواج اور طور طریق کی مکمل تصویر بن کر ہمارے سامنے آئے تاکہ جو کچھ ہم نے نہیں دیکھا ہے وہ سن لیں دکن کی مثنویوں میں کافی مثنویاں ایسی ہیں جو اس حیثیت سے بھی مکمل کہی جا سکتی ہیں۔ نصرتی کا علی نامہ ان میں سب سے نمایاں ہے۔

ابن نشاطی کی مشہور مثنوی پھول بن گو ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ سلاست روانی اور دوسرے فطری محاسن سے قطع نظر کر کے اسے اگر ہم صرف اسی نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ مثنوی اپنے زمانے کی طرز معاشرت۔ رسم ورواج اور سیاسی و سماجی حالات کا ایک بہترین مرقع ہے۔ بعض مثنویاں ہمیں ایسی بھی ملیں گی جن سے ہم بہترین اخلاقی درس حاصل کر سکتے ہیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ کچھ زیادہ حیرت افزا نہیں معلوم ہوتا اس لئے

کہ ادب جس دور سے گزر رہا تھا اس وقت اس نے کوئی مستقل شکل نہیں اختیار کی تھی اس لئے ہر صنف نے اپنی مخصوص ذہنیت کے مطابق مختلف قسم کی مثنویاں لکھیں اور خزانۂ ادب کو مالا مال کیا اور مثنوں کا یہ دور آیندہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک مفید سبق بن گیا۔ لیکن ان حیثیتوں کے علاوہ جو چیز ہماری نظر کو اور زیادہ تسخیر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھی مثنویوں کے بیچ بیچ میں ہمیں ایسے بیانیہ ٹکڑے مل جاتے ہیں جو مثنوی سے علیحدہ کرنے کے بعد ہمارے لئے مستقل نظموں کا کام دیتے ہیں۔ جو چیز اب صدیوں کے بعد ترقی کی شاہراہ سے گزر رہی ہے وہ اردو کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں شروع ہو چکی تھی۔ ان بیانیہ ٹکڑوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی منظر کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن میں کسی مخصوص مادی چیز کا تفصیلی لیکن شاعرانہ ذکر کیا گیا ہے۔ بعض میں کسی خاص رسم کو اپنا موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہم نے دیکھا کہ دکن کی مثنویوں میں مذہبی فلسفیانہ عاشقانہ۔ بیانیہ۔ رزمیہ اور بزمیہ سب طرح کی مثنویاں ہیں۔ ان میں سے کچھ طبع زاد ہیں اور کچھ ترجمے۔ بعض میں کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں اور بعض میں جذبات کی فطری تصویریں۔ کسی میں مناظر قدرت کی جھلک ہے اور کسی میں انسانی نقش و نگار کے فنی نمونے۔ اس کے علاوہ جو چیز ہمیں زیادہ مسحور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مثنویوں میں سے بعض کی زبان اتنی صاف ہے کہ کچھ شعر صرف ایک آدھ لفظ بدل دینے کے بعد ہمارے زمانے کے کہے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور بعض بغیر کسی تبدیلی کے بہت صاف اور با اثر ہیں دو ایک نمونے دیکھ کر اس کا اندازہ کیجئے ؎

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　　عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی

سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر　　سخن بہنچوں کو میرا مشتری کر

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا　　بیاباں اُس کو گلزار ارم تھا

کروں اُس وحشت کی کیونکر صفت کو　　زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی　　وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی پاؤں کی دارو　　وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو
وہاں کی باد تھی شوریدہ صرصر　　وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر

(مثنوی لال وگوہر ۔ عاجز)

تو ہیں اے شہنشاہِ دنیا و دیں　　شجاعت کی ہے صف کا کرسی نشیں

طمع اہلِ عزّت کوں کرتی ہے خوار　　کرے جگ میں بے قول ہیلے اعتبار
طمع نام و ناموس کا کال ہے　　طمع سکھ کو جیون کے بھونچال ہے

(علی نامہ نصرتی)

مرثیہ ۔ مرثیہ اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس کی بدولت ہماری شاعری آج دنیا کی ہر شاعری کی آسانی سے ہم پلّہ کہی جا سکتی ہے ۔ انیس نے اس صنف کو جتنی ترقی دی اتنی اُردو کی ساری زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ لیکن اب تک عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جن چیزوں کی انتہا انیس کے مراثی میں پائی جاتی ہے اس کی ابتدا بھی شمال ہی میں ہوئی تھی ۔ لیکن موجودہ تحقیق کچھ اور کہتی ہے ۔ اس کے نزدیک جو چیزیں شمال کے مرثیہ گویوں میں اپنی انتہائی بلندیوں کے ساتھ موجود ہیں ان کی داغ بیل دکن میں پڑ چکی تھی ۔ ہم اپنے اس بیان کو مختلف

مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

کسی صنف شاعری میں کسی قسم کا کمال پیدا کرنے سے پہلے شاعر جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کرتا ہے وہ ادبیت ہے دکن کے مرثیوں کے بالکل ابتدائی دور میں مرثیہ گوئی بالکل ایک مذہبی چیز سمجھی جاتی تھی اس لیے اس میں پڑھنے والوں کو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن غواصی کے زمانے سے اس روش میں تبدیلی ہوئی اور سب کے دل پر غواصی کے اس مصرعہ کا اثر پڑا۔ کہ ع

خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا

جو لوگ غزل کی شکل میں مرثیے کہتے تھے انہوں نے اسے مختلف طریقوں سے ادبی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ کہیں رنگینی کو جگہ دی اور کہیں تغزل کو کہیں صرف لطف بیان کو مثلاً ؎

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں — نرگس و لالہ یاسمن کے گل

(روحی)

ماہ محرم میں دیکھو چندا ہو ماں آ گیا — تارے گگن کے گوندکے سہرا جو شہ کوں لا گیا
کنگن ستم کا باندھ کر دکھ کا اُبٹنا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلا گیا

(سیدن)

روحی اور سیدن کے مرثیوں کے یہ شعر شعریت تغزل اور رنگینی کی اچھی مثالیں ہیں۔

دکنی مرثیہ کا دوسرا اہم جزو اس کی جذبات نگاری ہے۔ فطرت انسانی کا

جتنا گہرا مطالعہ انیس نے کیا اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں دکن کے مرثیوں کو دیکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان میں جذبات نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت شہر بانو کے بین کو ندیم نے یوں نظم کیا ہے۔

تجھ بن جوگن کا کر بھیس راکھ لگا موں کھولے کیس
تجھ کو ڈھونڈھوں دیس بدیس سونا تیرا پالنا
دکھ کی کنتھا پہنوں تن، غم کی دھونی جانوں من
تجھ بن مجھ کو گھر ہے بن۔ سونا تیرا پالنا

غلامی کے مراثی میں جذبات نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

اب میں جھولاؤں کیسے چھاتی لگاؤں کیسے
دودھ پلاؤں کیسے ہے ہے فلک کیا کیا
نکلی میں جب از وطن کیسی ہوئی تھی شگن
گم ہوئے سارے رتن ہے ہے فلک کیا کیا

اردو کے مرثیوں میں فطرت انسانی کی جو مصوری کی گئی ہے وہ ہندوستان کے ماحول سے زیادہ متاثر ہے انیس کے کلام پر اعتراض کرنے والے اس چیز کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی شمال کی ایجاد ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دکن کے مرثیوں کو دیکھنے سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں خود ہماری ملکی فطرت جلوہ گر ہے مثال کے لئے ہاشم کے ایک مرثیہ کا ٹکڑا پیش ہے ؎

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رہی　　سونا یہ پالنا جھلاتی رہی
تھا بڑی آس کا تجھے ارماں　　لال جاما ترا سلاتی رہی

قاسم آیا ہے جب بھیانے کو میں تماشا تجھے دکھاتی رہی

مرثیہ کا ایک خاص جز سیرت نگاری ہے۔ سیرت نگاری کے بیان کا بہترین طریقہ مکالمے ہیں۔ مصنف اگر خود اپنے لفظوں میں کردار کی سیرت بیان کر دے تو اسے ادبی لطافت کی کمی سمجھنا چاہئے دکنی مرثیوں میں جہاں بیانیہ سیرت نگاری کی مثالیں موجود ہیں وہاں کہیں کہیں مکالموں کے ذریعے سے بھی اس کا پتا چلتا ہے ایک مثال لکھی جاتی ہے جس سے سیرت نگاری کا اندازہ ہو جانے کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہوگی کہ مکالموں کا اندازہ بھی معلوم ہو جائے گا حضرت قاسم لڑائی کو جاتے ہیں۔

جلوے سین اٹھ کے رن کوں چلا تب کہی دلہن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھار و تم اس حال میں ہمن
تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون سرا

حضرت قاسم جواب دیتے ہیں ؎

مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق ساتھ میں جاتا ہوں بے قرار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار
حق سے کیا نے رن میں مقرر رہن مرا

صرف دو بندوں سے مکالمہ کے حسن و سیرت نگاری کی بلندی ادبیت

کی لطافت اور محاکات کی فطری جھلک کس قدر نمایاں ہو جاتی ہے۔ محاکات
کے لئے یہ مصرعہ ۔

دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین

ہم آج بھی اچھی سے اچھی مثالوں کے ساتھ ہر موقعہ پہ پیش کر سکتے ہیں ۔

روایات نظم کرنے کی ابتدا بھی دکن میں ہو چکی تھی لیکن اس کی بالکل غیر
مکمّل مثالیں ہمارے پاس ہیں ۔ اشرف کے ایک مرثیہ کا تھوڑا سا انتخاب مثال
کے لئے لکھا جاتا ہے ۔

سیج جھولے کی میں بناتی تھی
بائے اصغر کوں تب جھلاتی تھی
جب وہ لارادہ نیند بھر سوتا
دودھ پینے کو میں جگاتی تھی

جن چیزوں کی مثالیں مختصر طور پہ پیش کی گئیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے
کہ اشرف ، روحی ۔ نظیر ۔ سیدن ۔ ہاشم ۔ غلامی ۔ امامی اور ندیم کے مرثیوں
میں جذبات ۔ سیرت ۔ مکالمہ ۔ محاکات ۔ روایات سب چیزیں اپنی ابتدائی
شکل میں موجود ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شمال کے شاعر اس حیثیت سے
بھی دکن کے مرہونِ منت نہیں ہیں ۔

جس دکن کے متعلق اب تک عام طور پہ یہ خیال تھا اس کے ابتدائی
دوروں میں ادب کی کچھ خدمت نہیں اس کا ہم احسان ماننے پر مجبور ہیں کہ اس
نے غزل ۔ قصیدہ اور خصوصاً مثنوی اور مرثیہ کو ایک ایسے راستے پر لگا دیا ۔
جس کے زیادہ اچھے نمونے ہمیں شمال میں آکر ملے ۔

دکن میں اردو ادب کے ارتقائی منازل پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا اور ادب کا جائزہ لیا جائے ۔

باب (۳)

شمالی ہند

برہمن

تذکرہ نگاروں کو چندر بھان برہمن کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی لاہور بتاتا ہے کوئی آگرہ۔ حسرت موہانی رسالہ اردوئے معلیٰ ماہ اگست سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں برہمن اکبرآباد کے رہنے والے تھے تذکرہ نسخہ جاوید سے بھی ان کا وطن اکبرآباد ہی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً لاہور میں قیام کرنے کی وجہ سے بعض لوگ انکو لاہوری سمجھتے ہیں جسکی تردید خود برہمن کی ایک عبارت سے ہوجاتی ہے[1]

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب نے رسالہ زمانہ (مئی و جون سنہ ۱۹۳۱ء) میں برہمن کے متعلق لکھا ہے کہ "شاہان مغلیہ کی سلطنت میں چندر بھان برہمن

---

[1] بحوالہ بہار گلشن کشمیر جلد اوّل

لاہوری ملقب بہ خواجہ چندر بھان گورنر لاہور کے دفتر میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا۔ "انشاء چہار چمنی" اس کی تصنیف میں سے ہے۔ چندر بھان کو نظم کا بہت شوق تھا۔ شروع کتاب میں لکھتا ہے کہ :-

"ایں نیاز مند بہ دار السلطنت لاہور بہ مقتضائے لطافت
آب و ہوا و اقسام خوبیہائے کہ دم حالات بہ قسمت اتحادے می
زند رسیدہ"[1]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ برہمن کا اصلی وطن لاہور نہ تھا بلکہ بسلسلہ ملازمت وہ لاہور آئے تھے۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ برہمن اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے شاہجہاں کے وقت میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے۔ بعضوں نے دارا شکوہ کا منشی لکھا ہے اور بعضوں نے شاہجہاں کا خاص منشی بتایا ہے۔ بہار گلشن کشمیر میں ایک[1] جگہ لکھا ہے کہ ۱۰۶۶ھ میں سعد اللہ خاں شیرازی وزیر سلطنت شاہجہانی نے انتقال کیا۔ اس وقت شاہجہاں کی مردم شناس نظر نے چندر بھان کو انتخاب کیا اور خطاب "رائے رایاں" سے مفتخر کر کے قلمدان وزارت آپ کے سپرد کیا۔ فارسی میں کئی ایک تصنیفات آپ سے یادگار ہیں۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ دارا شکوہ کے قتل کے بعد برہمن تارک الدنیا ہو کر بنارس چلے گئے اور وہاں ایشور بھگتی میں بقیہ عمر صرف کر کے ۱۰۷۳ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

حسرت موہانی اسی رسالے میں جس کا ذکر ابھی آچکا ہے رقمطراز ہیں کہ ...... اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے زمانے میں ان پر (برہمن پر) نوازشات شاہی مبذول ہوتی رہیں اور ان کا تقرر خدمات شاہیاں پر ہوتا رہا۔ آخری عمر میں نوکری سے

[1] ضمیمہ جلد اول صفحہ ۶۶۳

استعفا دے کر شہر بنارس میں سکونت اختیار کی اور ۱۷۴۳ء میں انتقال کیا“
کلام کا نمونہ بہت کم دستیاب ہو سکا ہے جو مل سکا ہے ملاحظہ ہو۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے پگیا سین
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

فائز دہلوی

حال ہی میں ان کا دیوان پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے مرتب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ولی کے زمانے میں شمالی ہند میں بھی اردو کے شعرا موجود تھے جن میں فائز کی حیثیت صاحب دیوان ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔
فائز کا دیوان ۱۱۲۷ھ میں یعنی فرخ سیر کی سلطنت کے پانچویں سال میں مرتب

---

[1] خمخانۂ جاوید

ہو چکا تھا۔ وہ ولی کے ہم عصر تھے۔

فائز کے خاندانی حالات زیادہ نہیں معلوم۔ ان کا نام صدرالدین محمد تھا اور ان کے والد زبردست خاں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے آبا و اجداد اپنے وقت کے بادشاہوں کے یہاں ممتاز عہدوں پر مامور رہے چنانچہ ان کے والد زبردست خاں عالمگیری عہد کے بیالیسویں سال میں ناظم اودھ مقرر ہوئے تھے اور بعد میں کبھی پنجاب کے صوبے دار رہے اور کبھی اجمیر کے۔

فائز کے وطن کا پتہ قطعی طور پر معلوم نہیں لیکن جس انداز سے انہوں نے اپنے کلام میں دہلی کا ذکر کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے باشندے تھے۔ وہ نہایت ذی علم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ نثر و نظم فارسی و اردو دونوں میں ان کا قلم یکساں رواں تھا۔ چنانچہ ان کی اردو و فارسی کی اب تک جن تصنیفات کا پتہ لگایا جا سکا ہے ان کی تعداد انیس (۱۹) ہے۔

فائز کا اردو دیوان ضخیم نہیں ہے صرف تیس غزلیں ہیں لیکن نظمیں تعداد میں اس سے بہت زیادہ ہیں۔ جو سب کی سب مثنوی کی شکل کی ہیں۔ جس طرح وہ دہلی کے پہلے اردو غزل گو ہیں اسی طرح پہلے نظم گو بھی ہیں۔

فائز کے کلام میں غور و فکر کے عناصر نہیں پائے جاتے۔ وہ سیدھی سادی باتوں کو نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایہام بہت کم ہے البتہ اور صنعتیں کافی ہیں۔ ان کی غزلوں کا عام موضوع ظاہری حسن ہے یا مجازی محبت۔ کلام میں مقامی خصوصیات بہت ہیں۔ سوز و گداز رندی و سرمستی۔ جوش و خروش کم ہے لیکن محبوب کی اداؤں کے بیان اور عاشق کی محبت کے اظہار میں کبھی کبھی کلام میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

آبرو

اِن کا نام نجم الدّین تھا۔ شاہ مبارک لقب اور آبرو تخلص تھا سلسلہ نسب شاہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے۔ تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ گوالیار میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن ہی میں دہلی چلے آئے جہاں تعلیم، دشعر گوئی حاصل کی۔۔۔۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور ان ہی سے مشورہ شعر و سخن کرتے تھے۔

تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے نہایت خلیق و متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۰ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔ نہایت کہنہ مشق شاعر تھے اس وقت ہر ایک ان کو استاذ زمانہ سمجھتا تھا۔

کلام میں صفائی ضرور ہے مگر رعایت لفظی کا اس قدر چسکا ہے کہ تخیل میں وسعت نہیں پیدا ہوتی۔ الفاظ سادے اور ملائم ہیں لیکن زمانہ حال کے لحاظ سے بہت سے ایسے ہیں جو ثقیل اور بھدّے ہیں۔ چند اشعار نمونہ کے لئے ملاحظہ ہوں۔

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی

---

[1] ماخوذ از تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری

قدر داں حسن کے کہتے ہیں اسے دل مردہ
سا نورے چھوڑ کے جو چارہ کرے گوروں کی
گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی تری انکھاں نے
دو پلک نہیں یہ کترنی ہے مگر چوروں کی
لب شیریں پہ سریجن کے نہیں خط سیاہ
ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی
پلکیں سورج منیں جوں خط شعاع کے شعلے
دیکھ انکھیوں منیں یہ لال جھلک ڈوروں کی
قادری جبکہ سجی بریں سجن بوٹہ دار
عقل چکرّیں گئی دیکھ کے چھب موروں کی
آبرو کوں نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوروں کی

ناجی

ان کا نام سید محمد شاکر تھا۔ ناجی تخلص کرتے تھے۔ محمد شاہ کے ایک وزیر عمدۃ الملک امیر خاں تھے جو خود بھی شاعر تھے اور شاعر پرور بھی تھے یہ ان کے یہاں ملازم تھے۔ جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر چڑھائی کی اس وقت (۱۷۳۹ء میں) اس قلم کے سپاہی نے میدان جنگ میں قدم رکھا اور فوج کے ساتھ تباہی میں شریک دار رہا۔ اس وقت کے حالات جو کچھ لکھے ہیں وہ تاریخی

لحاظ سے بھی حرف بحرف صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی منصف مزاج تھے لشکر اور دربار کی جو حالت تھی اس کو من وعن لکھ دیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں محمد شاہی لشکریوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔

لڑے ہوئے تو برس بیس اُن کو بیتے تھے
دعا کے زور سے وائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اُپر طلا کے نال

ناجی کی طبیعت میں شوخی اور تیزی بہت کافی تھی۔ چنانچہ کلام میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے۔ میر تقی میر نے لکھا ہے کہ طبیعت کا رجحان ہزل کی طرف زیادہ تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منھ بنائے رہتے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دیکھ جو ہن تری کمر کی طرف — پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لب شیریں — نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف
ہے محال اُن کا دام میں آنا — دل ہے ان سب بتاں کا زر کی طرف
تیرے رخسار کی صفائی دیکھ — چشم دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پاکباز ہے ناجی
بد عمل جائیں گے سقر کی طرف

اپنے ہمعصروں کی طرح رعایت لفظی ناجی کو بھی بہت مرغوب ہے۔ تھوڑا بہت جو کچھ کلام دستیاب ہوا ہے اس میں قدم قدم پر اس رغبت کا پُر زور ثبوت نظر آتا ہے۔ مثلاً

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف
ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنے خورد و خواب

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں عارضی میری زندگانی ہے
انا الحق بولنے لگتا ہے اس کے زخم کا بسمل
کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

مضمون

شیخ شرف الدین نام تھا اور مضمونؔ تخلص کرتے تھے۔ اکبرآباد اصل وطن تھا مگر دلّی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تمام عمر زینت المساجد میں بسر کی سلسلہ نسب کئی واسطوں سے شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے جس کا اشارہ مضمون نے جا بجا اپنے کلام میں کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

اس زمانہ میں سراج الدین آرزوؔ مسلّم الثبوت استاد تھے۔ گو وہ مضمون سے عمر میں چھوٹے تھے۔ مگر "بزرگی بعقل است نہ بہ سال" کے مقولہ کو مدنظر رکھ کر یہ اپنا کلام آرزوؔ کو اصلاح کے لئے دکھاتے تھے۔ مضمونؔ خود ایسے صاحب فن اور باکمال شاعر تھے کہ ان کے مرنے کے بعد سوداؔ نے اظہار افسوس اور اقرار کمال ان الفاظ میں کیا۔

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمونؔ دنیا سے رہا سوداؔ سو مستانہ

کلام اس وقت کے عام پسند رنگ یعنی صنعت مراعاۃ النظیر میں ڈوبا ہوا ہے نمونہ ملاحظہ ہو کہیں کہیں کلام ابتذال کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ مضمون کا انتقال ۱۷۴۵ء میں ہوا۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج　　ہُوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

نہیں ہیں ہونٹھ تیری پان سے سرخ　　ہوا ہے خون میرا آ کے لبریز

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں　　ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے　　مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

یک رنگ

غلام مصطفٰے خاں نام اور یک رنگ تخلص تھا۔ مرزا جان جاناں مظہر کو کلام دکھاتے تھے۔ محمد حسین آزاد فرماتے ہیں "بزرگوں سے سُنا اور تذکروں میں بھی دیکھا بڑے مشّاق تھے اور اپنے وقت میں سب انہیں خوش فکر اور باکمال مانتے تھے اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یک رنگ و یکتا تھے اُمرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے تاریخ وفات و ولادت کا پتہ نہیں چلتا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

یک رنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں دو نین جو کہو تو نذر کردں

اُس زلف کا یہ دل ہے گرفتار یال بال
یک رنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے   دل سے صبر و قرار جاتا ہے

کلام علوئے تخیّل سے خالی نہیں مگر استعارات کی بھرمار اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کو خوش نہیں کر سکی - ان کا ایک دیوان یادگار ہے - جو لوگوں کو مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے مجاز و حقیقت دونوں کا مزا دیتا ہے -

---

آرزو

سراج الدین علی خاں کے متعلق ہر تذکرہ نویس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قابلیت اور علمیت کا سکّہ ہر دل پر جما ہوا تھا ان کے کلام سے ان کی قابلیت اور علمی تبحّر کا پتا چلتا ہے سب تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں علم منقول و معقول ہر چیز پر عبور تھا - لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ جس چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان کے ذاتی محاسن اور اخلاق و عادات میں ان کی شیریں زبانی اور علم مجلس کا ہر شخص معترف ہے -

ان کے متعلق مجموعہ نغز میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے دو ایک لطیفے لکھے ہیں جن سے ان کی قابلیت اور شاعرانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے - آزاد نے بھی غالباً یہ لطیفے اسی تذکرے سے لئے ہیں -

(۱) **لطیفہ**:- ایک دن کہیں مشاعرہ ہو رہا تھا سوداؔ نے حاجی محمد جان قدسی کے چند شعر اس طرح پر ترجمہ کر کے پڑھے گویا مضمون خود ان کا ہے - بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گیا مگر سودا کی ہجو گوئی کے خوف سے لوگوں نے خاموشی اختیار کی - جان آرزو

ضبط نہ کر سکے۔ نہایت لطف سے یہ شعر پڑھا ؎

شعر سوداؔ حدیثِ قدسی ہے لکھ رکھیں چاہیئے فلک پہ ملک

مرزا بے اختیار ہو گئے۔ اُٹھ کر خان آرزوؔ کے گلے ملے بات گئی گزری ہوئی۔

(۲) لطیفہ:۔ ایک دن ایک نوجوان خان آرزوؔ کے سامنے سے ہو کر گزرے۔ جب یہ بچے تھے تو خان آرزوؔ سے ربط تھا انہوں نے سلام تک نہ کیا۔ آرزوؔ نے فوراً یہ شعر کہا ؎

یہ شان یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

آرزوؔ کا اردو کلام کہیں نہیں ملتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اردو میں بہت کم کہا تھا۔ ان کے چند شعر مجموعہ نغز سے لکھے جاتے ہیں[1]

کھول کر بند قبا کو ملک دل غارت کیا
کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا

آتا ہے یہ سحر اُٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

---

[1] مجموعۂ نغز مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب صفحہ ۲۵، ۲۶

از زلف سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اس شعر کو آرزو سے منسوب کرنے میں کچھ تکلّف ہوتا ہے۔ البتہ مرزا سودا نے اسے دوسرے طریقے سے بیان کیا ہے اور غالباً وہی صحیح ہے؂

اس زلف سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

عمدة الملک امیر خاں انجام

ان کا تخلص انجام تھا باپ ان کے اُمرائے عالمگیری میں سے تھے، جو ایک زمانہ میں عالمگیر کی طرف سے کابل کے صوبہ دار تھے انجام محمد شاہی دور میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے۔ طبیعت میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بہت تھی۔ شاعر اچھے تھے فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے تھے ان کا ایک خاص احسان اردو پر یہ ہے کہ اس زبان کی ترقی کے لئے اپنی نگرانی میں ایک انجمن بھی قائم کی جس میں وقت کے فضلا و زبان داں شریک ہوتے الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں الفاظ و محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہند میں اس کی نقل بھیجدی جاتی اور دیگر اُمرا اسی امیر کی تقلید کو فخر مانتے۔[۱]

---

[۱] خطبہ صدارت نواب نصیر حسین خیال

علمی لیاقت کے لحاظ سے بہت کم شاعر اس قابلیت کے گزرے ہوں گے وہ نہ صرف عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ بلکہ سنسکرت اور بھاشا کے بھی استاد سمجھے جاتے تھے۔ افسوس ہے کہ محمد شاہ کے ہاتھ سے انجام کا انجام اچھا نہ ہوا ایوانِ شاہی میں ۱۱۵۹ھ میں قتل کر دیے گئے۔ گھر بھی ضبط ہوا اور ظلم یہ ہوا کہ ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد ہوا جس کے ساتھ قیامت یہ ہوئی کہ ان کا کلام بھی تلف ہو گیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا ان میں سے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ زبان کی لطافت، اسلوبِ بیان اور محاورات کے صرف میں ان کا کوئی مقابل مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔

کیوں بلایا پھر ہمیں مجھ سے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیٔ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجامِ پاسِ تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

بعض اشعار ان کے اب تک لوگوں کے زبان پر جاری ہیں مثلاً

دور سے آتے تھے ساقی سن کے میخانہ کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

دور کی خصوصیات

جس دورِ شاعری کے مختلف شاعروں کا ذکر کیا گیا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے علاوہ اس میں کوئی ایسا شاعر مشکل سے تھا جس نے زبان اور ادب کی کوئی خاص خدمت کی ہو۔ ولی کے اس دور کے شعرائے شاعری کو زیادہ ترقی نہیں دی۔ بلکہ اگر بنظر انصاف سے دیکھا جائے تو بجائے ترقی کے یہ دور انحطاط اور زوال کا تھا۔ ولی نے اب تک بھاشا کے الفاظ کے علاوہ خاص چیز جو اردو میں لانے کی کوشش کی تھی وہ بھاشا کی شاعری کے جذبات تھے اردو کی عاشقانہ شاعری میں خاص طور پر ان خصوصیات کا اثر پڑا۔ ولی کے وہ شعر جو بھاشا کے جذبات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں۔ ایک آدھ شعر سے اس کا اندازہ کیجئے ؎

بیراگی جو کہاتے ہیں انہیں گھر بار کرنا کیا
ہوئی جو گن جو کُنی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

ترے بن مجکوں اے ساجن تو یو گھر بار کرنا کیا
اگر تو نا چہے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا
سلونے سانورے پیتم ترے موتی کی جھلکاں سے
کیا عقدِ ثریّا کوں خراب آہستہ آہستہ

ولی کے بعد اس دور کے شاعروں نے ہندی کی تقلید تو کی لیکن جو چیز ہندی میں سب سے اچھی تھی اسے چھوڑ دیا۔ جذبات نگاری اور اس کے انداز کی پروا نہ کی بلکہ ہر بات میں فارسی کی تقلید کرنے لگے اور لطف یہ کہ اس کے باوجود بھی زبان کو صاف کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی۔ خیالات فارسی سے لئے مگر الفاظ وہی بھاشا کے استعمال کرتے رہے۔ غیر مانوس متروکات اسی طرح کام میں لاتے رہے اور یہ کام آیندہ والوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اس میں شک بھی نہیں کہ دوسرے دور کے شاعروں نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔

اس دور کی تیسری خصوصیت ایہام گوئی ہے جو ہندی کے دوہروں سے آئی اس نئی چیز نے ہماری شاعری میں خرابیاں پیدا کرنی شروع کر دیں بے تکلفی اور سادگی کی جگہ ایہام نے لے لی اور سیدھی سادی بات کو ذو معنی بنانے کی فکر میں شاعروں نے اثر و لطف کا سرمایہ اپنے ہاتھوں سے کھو دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیندہ آنے والوں نے اصلاحِ زباں کی طرف بہت توجہ کی لیکن اظہارِ کمال کے شوق میں ایہام گوئی کے پھندے سے وہ بھی نہ چھٹ سکے۔

اس کے باوجود بھی اس دور کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ان شاعروں نے تکلف اور ایہام کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا وہاں کلام میں بے حد لطف اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ سیدھے سادے جذبات آسان سے آسان الفاظ میں بیان کر دیے ہیں اس لئے وہ پڑھنے والے پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہئے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی　　　اس دل بے قرار کی صورت

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوبؑ کیا ۔ گریۂ یعقوبؑ کیا

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اُسے جُدا کر کے

اس کے علاوہ اس دور کے شاعروں کے یہاں تصوّف کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ فطرتاً اس دَور کے شعرا صوفی تھے اور اس عہد کی فضا میں تصوف چھایا ہوا تھا۔

حاتم

ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص۔ مضمون۔ ناجی اور آبرو کے ہمعصر تھے۔ باپ کا نام فتح الدین تھا۔ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان کے نام (ظہور) کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔ اصل وطن شاہجہاں آباد ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

دل نہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف اشرف کے بیچ
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ جس کی بدولت نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازمت حاصل کی۔ میر بادل علی شاد کے تکیہ میں اکثر فقیر جمع ہوا کرتے تھے یہ بھی وہاں جاتے اور برابر اپنا وقت گزارتے صحبت نے اثر کیا اور خود بھی ایک آزاد منش فقیر ہو گئے۔ شاعری کا چسکا بچپن ہی سے تھا پہلے رمز تخلص کرتے تھے بعد میں حاتم

ہو گئے قابلیت کا یہ حال کہ زمانے نے ان کو نہ صرف دہلی اسکول کا بانی قرار دیا بلکہ جگت استاد بھی سمجھا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست پر جب نظر پڑتی ہے تو اس خیال کی ایک حد تک تائید بھی ہوتی ہے۔ جس کا شاگرد سوداؔ ایسا استاد ہوا اس کو جگت استاد کہنا کیا غلط ہے۔ صرف سوداؔ ہی ان کے شاگرد نہ تھے بلکہ اور بھی ممتاز شعرا ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ سعادت یار خاں رنگینؔ تاباںؔ لالہ مکند رام فارغؔ وغیرہ حاتمؔ کی خدمت میں اصلاحِ سخن کے لئے حاضر ہوتے اور فخر کرتے۔ ضخامت کے لحاظ سے حاتمؔ کا کلیات بہت بڑا ہے جس میں قصائد۔ رباعیات۔ غزلیات سبھی کچھ ہیں۔

آخر عمر میں اس ضخیم کلیات سے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا جس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔"

اس دیوان زادہ میں حاتمؔ نے چند الفاظ ترک کر دیے ہیں جو ان کے دیوانِ قدیم میں پائے جاتے ہیں مثلاً در۔ بر۔ از۔ وغیرہ کیونکہ یہ الفاظ اردو میں غیر مانوس نظر آتے تھے۔ ان الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے جو اصلاً عربی تھے لیکن تلفظ اور ہجے کے لحاظ سے ہندی ہو گئے تھے۔ مثلاً تسبیح کو تسبی نہ صحیح کو صحی لکھنا حاتمؔ نے صحیح نہیں سمجھا۔

تیسری اصلاح بھی ان کی قابل قدر ہے عربی و فارسی کے حروف جو اردو میں دبتے تھے ان کو بھی نامناسب سمجھ کر ترک کر دیا۔ مثلاً بیگانہ کو بگانہ۔ دیوانہ کو دوانہ حاتمؔ کے نزدیک اردو میں لکھنا معیوب ہے۔ مگر ان اصلاحات پر عرصہ تک عمل درآمد نہ ہوا۔ چنانچہ میرؔ نے خود "دوانہ" وغیرہ استعمال کیا ہے۔ لیکن ناسخؔ کے وقت میں ان اصلاحات پر پوری توجہ ہوئی۔

حاتم نے ہندی کے بھی ثقیل الفاظ اردو میں استعمال کرنے سے گریز کیا ہے مثلاً ایدھر۔ کیدھر وغیرہ ترک کر دیا۔ مختصر یہ کہ حاتم نے فصاحت اور زبان کی صفائی کو بہت زیادہ مدنظر رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں روزمرّہ اور فصاحت اوروں سے زیادہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی زائد الفاظ شعر میں استعمال کرتے ہیں۔

حاتم کا انتقال ۹۶ برس کی عمر میں ماہِ رمضان ۱۲۰۷ھ میں ہوا اور دلّی دروازہ کے باہر دفن ہوئے مصحفی کو اس سال وفات سے اختلاف ہے وہ ۱۱۹۶ھ میں ان کا مرنا بتاتے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے خرد مندو مبارک ہو تمہیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی
بے مروّت بے وفا بے دید لے بے آشنا
آشناؤں سے نہ کر بے رحمی و بے گانگی
ملک دل آباد کیوں کرتا ہے حاتم کا خراب
اے مری بستی! خوش آتی ہے تجھے ویرانگی

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر کی فرمائش سے حاتم نے ایک مثنوی قہوہ کی

تعریف میں لکھی تھی۔ یہ مثنوی اس لئے قابل قدر ہے کہ شمال میں اس سے پہلے کوئی
مسلسل نظم نہیں ملتی اس حیثیت سے حاتم کو اولیت کا مرتبہ حاصل ہے[1]

فغاں

اشرف علی خاں نام فغاں تخلص تھا۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے "کوکا" تھے
طبیعت میں ظرافت اور مزاح فطرت سے لیکر آئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کی طرف
سے "ظریف الملک کوکا خاں بہادر" کا خطاب تھا۔ ابتدائے عمر سے شعر کہنے
کا شوق ہوا۔ عشق سخن نے ان کی کرسی اردو کے ممتاز شعراء کے برابر رکھ دی ہے۔
میر تقی میر نے انہیں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے مصحفی انہیں ندیم
کا شاگرد بتاتے ہیں اور فغاں نے بھی ایک آدھ جگہ اس کو تسلیم کیا ہے۔ ایک جگہ
کہتے ہیں۔

وحشت جنوں میں کیوں نہ پھر دل میں بہ ہنہ پا
اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے مختلف وقتوں میں دونوں کے شاگرد
ہوں۔ کیونکہ اس شعر میں "اب تو" سے خیال ہوتا ہے اس سے پہلے امید کے
شاگرد رہے ہوں۔

احمد شاہ درانی کے حملوں نے دلّی اور اہل دلّی دونوں کو تباہ و برباد کردیا
فغاں نے بھی دلّی کو خیرباد کہہ کر مرشد آباد کی راہ لی۔ وہاں ان کے چچا ایرج خاں

[1] مضمون ڈاکٹر زور ہندوستانی۔ جنوری ۱۹۳۲ء

اقتدار پر تھے۔ کچھ دن ان کے پاس رہے۔ پھر وہاں سے فیض آباد آئے۔ گو دلی اجڑ چکی تھی مگر بقول آزاد، دلی کا آدمی کہیں جاتا تھا تو لوگ اس کو ایسا سمجھتے تھے گویا بہشت زادے آئے بلکہ اس کی نشست برخاست کو سلیقہ اور امتیاز کا دستور العمل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کو بھی نواب شجاع الدولہ نے بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا۔ لیکن نازک مزاجی نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ ایک دن نواب کے ناتھ سے فغاں کا ہاتھ چل گیا یہ آگ بگولہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے۔ وہاں راجہ شتاب رائے نے بہت قدر کی یہاں تک کہ فغاں نے ساری عمر وہیں بسر کر دی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں اس دنیا سے انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ــ

صنم ہوا تو خدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا

ہزار شکر کہ تو بت ہوا خدا نہ ہوا

کیا سب ہو گیا آخر کو کچھ برا نہ ہوا

عجب یہ دل ہے جلا اور کبھی سیہ مرا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچے کے تئیں پریشانی

بھلا ہوا کہ کبھی کا مرا تو مجھ سے وا نہ ہوا

ہوا نہ میں جیا آخر کو نیم بسمل ہو

غضب ہوا سر مقتل قاتل کا مدعا نہ ہوا

نپٹ ہوا ہوں فضیحت بہت ہوا ہے خراب

تری طفیل اے خانہ خراب کیا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مرا صاحب

مری بلا سے فغاں کا اگر بھلا نہ ہوا

مظہر جانجاناں

نام مرزا جانجاناں تھا اور تخلص مظہر تھا والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ سلسلۂ نسب محمد ابن حنیفہ سے ملتا ہے جو حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ ماں بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تھیں۔

سنہ ۱۱۱۱ھ میں جب شاہ عالمگیر دکن میں فوج لئے پڑا تھا تو خبر آئی کہ مرزا جان کے بیٹا بمقام کالا باغ علاقہ مالوہ میں پیدا ہوا۔ جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ "پسر جان پدری باشد"، باپ مرزا جان ہے ہم نے لڑکے کا نام جان جاناں، رکھا۔ افسوس کہ مرزا جانجاناں کو سایۂ پدری سے عنفوانِ شباب ہی میں محروم ہونا پڑا۔ ابھی یہ صرف اٹھارہ برس کے تھے کہ مرزا جان انتقال کر گئے۔ مگر شفقتِ خداوندی راہ نما ہوئی۔ مرزا جان جاناں نے ۳۰ برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جاروب کشی کی اہل علم سے حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ اس زمانہ میں ہر طرف تصوف کا چرچا تھا۔ ان کا بھی رجحان تصوف کی طرف ہوا۔ چنانچہ ہزاروں ہندو مسلمان ان کے مرید ہوئے۔ تصوف کے لئے قناعت و استغنا لازمی ہے ان کے مزاج میں یہ باتیں روزِ ازل سے خمیر ہو گئی تھیں۔ اُمرا اور بادشاہوں کی بھی نذریں قبول نہ کرتے تھے جب تک جئے فقیرانہ زندگی بسر کی دس محرم سنہ ۱۱۹۵ھ کو ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہو کر راہی ملک بقا ہوئے۔

سودا نے تاریخ کہی

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتدِ شوم

اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ از روے درد یہ سن کے کہی
سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم
۱۱ ھ ۹۵

ان کی بزرگی کا یہ عالم تھا کہ بڑوں بڑوں نے ان کے آگے سر جھکایا میر تقی میر اور شیخ علی حزیں جو ہر شخص کو اپنے سے کمتر جانتے تھے۔ انہیں نہایت پر تعظیم لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔

مرزا مظہر کے شاگردوں میں چند مشہور استاد گزرے ہیں۔ انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں، بساون لال بیدار، خواجہ احسن اللہ خاں بیان

مرزا مظہر کا ایک دیوان فارسی میں ہے۔ اردو میں بھی دیوان ہے۔ مگر ناتمام و نایاب۔

مرزا مظہر کے کلام میں علاوہ اور باتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے ایہام سے بہت گریز کیا ہے اور بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ مرزا مظہر پہلے شخص ہیں جنہوں نے صنعت ایہام کے طوفان سے زبان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلام میں درد و کیف بہت کافی ہے زبان نہایت پاک اور شستہ ہے۔ دہلی کے خاص محاورات نہایت خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

چلے سب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
میرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر

کہ جس کے آسرے پہ گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

الٰہی کب کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

دور کی خصوصیات

اس دور میں جو اس وقت زیر بحث ہے اردو کی خاطر خواہ خدمت کی گئی۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں ایہام گوئی کا کافی غلبہ ہو گیا تھا جس کے جال میں شعرا ایسے پھنس گئے تھے کہ دوسرے میدان میں قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا اگر اس کو آپ اعجاز کہئے یا اردو کی طبیعت کی نفاست سے تعبیر کیجئے کہ کوئی بدنما دھبہ اپنے دامن پر زیادہ دنوں تک نہیں دیکھ سکتی۔ زبان کی عمر میں ۵۰۔۶۰ سال کچھ زیادہ نہیں ہوتے اگر کسی دور کو لے لیجئے آپ دیکھیں گے کہ اتنی ہی مدت میں ایسے عیوب جن پر زمانہ نے حرف زنی کی ہو اردو نے عمداً اپنے دامن سے دور کر دیا ہے

ایہام گوئی بھی زیادہ دنوں تک اپنا طلسم قائم نہ رکھ سکی لوگوں کو احساس ہوا اور اصلاح پر کمربستہ ہو گئے۔ حاتم اور مظہر دونوں بہترین مصلح تھے۔ حاتم نے ثقیل الفاظ اور عیوب قافیہ کو دفع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں جو دیوان لکھا تھا اسے منتخب کر کے دیوان زادہ تیار کیا جس کا ذکر ان کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ شاہ مبارک آبرو کے یہاں سین اور صاد کے قوافی بھی رائج تھے۔ حروف کا دبنا معمولی بات تھی مگر حاتم نے سب کو ناجائز قرار دیا۔ ایہام گوئی کی روک تھام مرزا مظہر نے کی اور نہایت شد و مد کے ساتھ اس خار دار جھاڑی سے اردو کے نوخیز پودے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

کسی بانی اصلاح کو مشکل سے یہ کامیابی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنی کوششوں کو پوری طرح بار آور دیکھے۔ حاتم اور مرزا مظہر دونوں کی اصلاحیں میر سودا کے ہاتھوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچیں لیکن یہ فخر ان ہی حضرات کو نصیب ہے کہ ابتدا ان ہی کے دم سے ہوئی۔ زمانہ کو رغبت کے بجائے الفاظ کی خرابیوں اور ایہام گوئی وغیرہ سے تنفر پیدا ہو گیا۔ چنانچہ سودا نے جب شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں طبع آزمائی کی ہے۔ تو ایک مقام پر گھبرا کر کہتے ہیں۔

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں

فیروزہ ہوئے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

نہیں چھوڑتا ہے اشک مرا دامن و کنار

یہ طفل بد سرشت ہے گہوارہ سے پلا

شاکی نہیں خدا سے بنی گر یہ شکل زشت

ممکن نہیں کمہار کا ماٹی کرے گلا

غم سے خزاں کے خونِ جگر چھٹ اب لے نسیم
غنچے گلوں کے کچھ نہیں کھاتے انہیں بھلا

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا یہ سودا ہے سلسلا

اس دور کے شعرا کا بیان سیدھا سادا اور بڑی حد تک نیچرل ہے۔ جو جی پر گذرتی ہے مہذب اور مزیدار الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔

سودا

ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ ان کے باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا مرزا شفیع
تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے۔ تجارت نے ان کو
دولت مند فارغ البال کر دیا تھا۔ اتنا زیادہ اعزاز تھا کہ نعمت خاں عالی کی لڑکی
سے ان کی شادی ہوئی سودا اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ سودا کے سال ولادت
میں اختلاف ہے لیکن گمان غالب ہے کہ وہ سنہ ۱۱۱۹ھ اور سنہ ۱۱۲۴ھ کے درمیان
میں پیدا ہوئے۔ اور دہلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ باپ کے مرنے کے بعد جب
ترکہ کی دولت اڑا چکے تو گذر اوقات کے لئے فوج میں سپاہی ہو گئے مگر جلد ہی
اس ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ خاندانی اعزاز اور اپنی قابلیت کی وجہ
سے بادشاہوں اور امراء کا تقرب حاصل ہو گیا۔

اپنا کلام پہلے سلیمان قلی خاں وداد کو دکھایا پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے

سودا نے پہلے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور اس میں وہ درجۂ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے استادوں سے خراج تحسین وصول کیا یہاں تک کہ شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔ جب تک ہو سکا دہلی کو مادر وطن سمجھ کر وہیں رہے مگر ایک زمانہ آگیا کہ دلی کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔

سودا کے سرپرستوں کی بھی حالت دگرگوں ہوئی ناچار دل پر صبر کا پتھر رکھ کر دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد میں نواب بنگش کے یہاں آکر قیام کیا کوئی سترہ سال تک یہاں آسودگی سے بسر کی اس کے بعد فیض آباد آکر شجاع الدولہ کے دربار میں عزت حاصل کی اور باقی عمر لکھنؤ میں گزاردی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔

شاہ حاتم زندہ تھے۔ سودا کے انتقال کی خبر سنکر بہت روئے، کہا افسوس ہمارا وہ پہلوان سخن مر گیا۔[1]

سودا ایسا دل و دماغ لیکر آئے تھے کہ اردو کے بہت کم شاعروں کو ایسی نعمتیں ملی ہوں گی۔ طبیعت کی ہمہ گیری اور جولانی شاعری کے جس میدان میں اپنا رنگ دکھاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی اردو کے اکثر اصناف شاعری پر انہوں نے کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے قصائد اور ہجو میں وہ نام پیدا کیا کہ آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا۔

غزل میں ان کا خاص رنگ یہ ہے کہ "کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی و روشنی۔ الفاظ اپنی جگہ پر اس طرح جا دیتے ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی شعر میں ادھر کا ادھر رکھ دیجئے تو سارا شعر بے لطف ہو جاتا ہے جب تک آپ الفاظ کی ترتیب اصلی طریقہ پر نہ دیجئے گا

---

[1] آب حیات

پورا لطف شعر کا نہیں حاصل ہو سکتا۔ سوداؔ کے شعر میں بندش نہایت چست ہے معنویت اور درد کا بھی حصہ کم نہیں ہے۔ تاثیر جس کی چاشنی اردو غزل کے لئے ضروری سمجھی گئی اس میں بھی سوداؔ نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کبھی کبھی دیسی چیزوں سے پیدا کئے جاتے ہیں جو خاص لطف دے جاتے ہیں۔

سودا کے کلام میں ہندوستان کے رنگ و بو کا بھی کافی حصہ ہے۔ یعنی فارسی شعرا کی تقلید میں ہندوستان کے رسوم میں اشخاص وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا ارجن کا بھی نام آتا ہے۔ ساون سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کرشن اور دوسرے مقدس لوگوں کا بھی حوالہ جا بجا کلام میں دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندی کے ثقیل الفاظ انہوں نے نکال ڈالے مگر ان کے بدل بھی پیش کئے۔ یعنی فارسی کے محاورات کے ترجمے اردو میں نظم کئے۔ مثلاً بو کردن سے، بو کرنا یعنی سونگھنا۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منہ کے ہیں ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

سوداؔ کا مذاق شعر اتنا اچھا تھا کہ ہندی کے ملائم الفاظ کو ترک کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کو برابر استعمال کرتے رہے۔ پربت۔ رائی وغیرہ آپ کو اکثر ان کے کلام میں مل جائیں گے۔ ان کی اس روش کو اگر دردؔ، و ناسخؔ ترک نہ کرتے تو موجودہ اردو ادب کو مضمون نگاری وغیرہ میں بہت کچھ سہولت حاصل ہو جاتی۔ سوداؔ نے رباعی، مرثیے، غزلیں شہر آشوب بھی لکھے ہیں لیکن ان کے قصائد ہر چیز پر بھاری ہیں۔ نا انصافی ہوگی کہ اگر ان کے قصائد کی خصوصیات بیان کئے بغیر ان کا تذکرہ ختم کیا جائے۔ مختصر طور پر ان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ زمین مشکل منتخب کرتے ہیں لیکن نشست الفاظ سے دلاویز بنا دیتے ہیں۔

۲۔ قصیدے کی شان کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں۔ یعنی متانت، پختگی، زور الفاظ، مضمون آفرینی، اور علو تخیل جتنا ان کے قصائد میں ہے۔ وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔

۳۔ استعارے اور تشبیہوں کے صرف میں جدت و ندرت سے کام لیتے ہیں

۴۔ سوداؔ کے قصائد میں محاکاتی شاعری نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہے جو اردو کے دوسرے قصیدہ کہنے والوں کو بہت کم نصیب ہوئی۔

۵۔ سوداؔ کے قصائد میں مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ہیں۔

۶۔ سوداؔ کی جدّت پسند طبیعت نے بہاریہ تمہید کو پامال سمجھ کر نئے عنوان بھی پیش کئے ہیں۔

یہ وہ چند خصوصیات ان کے قصائد کی ہیں جو سوداؔ کو نہ صرف اردو کے شعرا سے ممتاز کر دیتی ہیں بلکہ ان کو فارسی کے بہترین قصیدہ گو کے برابر رکھتی ہیں یہی حال ہجو کا بھی ہے۔ غالباً مرزا سوداؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو اس قدر شدّ و مد کے ساتھ اردو میں نظم کیا ہجو کا استعمال اگر اچھی طرح کیا جائے تو کارآمد باتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ مذاق اُڑا کر عیوب دور کئے جا سکتے ہیں ذاتیات کو الگ کر کے عالمگیر اصلاحات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ برائیوں کو چھوڑ کر سوداؔ کے یہاں حسب ذیل خوبیاں ہیں:۔

۱۔ ان کی ہجو میں اس زمانہ کے تنزل کا بھی نقشہ نظر آتا ہے۔ شرفاء و امراء کی ردّی حالت، غریبوں کی مفلسی، دہلی کے کوتوال کا ظلم یہ سب مناظر آپ کو ہجو کے میدان میں مل جائیں گے۔

۲۔ پاکیزہ تمسخر اور شائستہ مذاق کا ایک اچھا ذخیرہ ان کی ہجو میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ ان کے کمال اور الفاظ پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے اچھے بُرے خیالات کو ان کی جگہ پر موزوں الفاظ میں حسن کے ساتھ نظم کر دینا سودا کا خاص کارنامہ ہے۔

۴۔ سودا کے مزاج کی شگفتگی اور افتاد طبیعت کا پتہ ان کی ہجوؤں سے ملتا ہے۔ یہ رنگ آخر وقت تک قائم رہا ہے اور لطف یہ کہ اگر کوئی اُن پر ہجو کہتا۔ تو نہایت خوش ہو کر داد دیتے۔

سب کچھ لکھنے کے بعد سودا کے مرثیوں کا تذکرہ بھی ضرور ہے۔ مرثیہ تاریخ ادب کا ایک ایسا اہم جزو بن گیا ہے کہ ہمیں اس کی ابتدا اور ترقی کا مطالعہ ہر اعتبار سے کارآمد معلوم ہوتا ہے سودا نے یہاں بھی اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے اب تک مرثیوں کی شکل غزل یا ایسی ہی دو ایک شکلوں تک محدود تھی۔ انہوں نے اسے مربع، مخمس، مسدس، مستزاد وغیرہ تمام شکلوں میں پیش کیا انہوں نے مرثیہ کو مذہبی دائرے ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ مرقع نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری وغیرہ کا اضافہ کر کے ادب کے لئے بھی ایک خاص چیز بنا دی۔ اس عہد میں بہت سے مرثیہ نگار تھے۔ لیکن سودا کی حیثیت مرثیہ نگاری میں بھی ان کے ہمعصروں سے ممتاز ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں پہلی بار پیش کرنے کا فخر سودا کو حاصل ہے۔ لیکن یہ خیال بحث طلب ہے۔ سودا کے زمانہ ہی میں کئی ایک مرثیہ گو تھے مثلاً میر تقی میر، افسردہ وغیرہ اور ان سبھوں کے مرثیے مسدس کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ پہل، کس شاعر نے کی، البتہ

سودا کی جدت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے قیاس بھی کہتا ہے کہ ممکن ہے سودا ہی نے پہلے پہل مرثیہ کو مسدس کی شکل دی ہو۔

درد

ان کا نام سید خواجہ میر اور تخلص درد تھا ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا۔ اور عندلیب تخلص کرتے تھے فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاءالدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ خواجہ میر درد دہلی میں پیدا ہوئے اور والد کے اثر سے شاعری اور تصوّف کے ورثہ دار ہوئے۔

تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ ایک رسالہ پندرہ برس کے سن میں احکام الصلوٰۃ لکھا اور انتیس برس کی عمر میں واردات درد نام کا ایک اور رسالہ لکھا۔ کئی تصنیفات درد کی یادگار ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان ہے آزاد ان کے کلام کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر، نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوتی"

ان کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ہم مصنف کاشف الحقائق، کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ درد اور مسلک میں سوز و گداز ہیں درد کی غزلیں میر کی غزلوں کے دوش بدوش ہیں فرق یہ ہے کہ میر کے یہاں ایک خستگی اور کھلی ہوئی سپردگی ہے اور درد اپنے کو لئے دیئے رہتے ہیں۔

ان خوبیوں کے علاوہ میر درد کا پایۂ تصوّف کے اعتبار سے غالباً اردو کے کسی شاعر سے کم نہیں اکثر دقیق مسائل کو نہایت مزے اور اختصار کے ساتھ نظم کرتے ہیں ہم نے اپنی ایک کتاب[1] میں درد کے تصوّف پر کافی بحث کی ہے یہاں موقع نہیں کہ اس موضوع پر زیادہ گفتگو کی جائے ۔ مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ بقول آزاد کے "تصوف جیسا انہوں نے کہا اردو میں آج تک کسی نے نہیں کہا" گو ان کا اردو کا دیوان مختصر سا ہے لیکن نفاست اور سادگی کے ساتھ خیالات میں بلندی اور جذبات میں جوش ہر جگہ آپ کو ملے گا الفاظ چیدہ اور پسندیدہ استعمال کرتے ہیں ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ اور محاورے اس زمانہ میں متروک ہیں انہیں درد نے بھی ترک کیا ہے ۔ کہیں کہیں ثقیل الفاظ ضرور ملتے ہیں مگر وہ بھی اس خوبی سے سجائے گئے ہیں کہ اشعار ناخوش گوار نہیں ہوتے ۔

میر درد کی ایک یہ بھی خوبی قابل غور ہے کہ ان کے یہاں عشق حقیقی کا جلوہ ایسا غالب ہے کہ مجازی عشق کو کہیں جگہ نہیں ملتی روحانیت سے خیالات کو اس طرح پاک و پاکیزہ کیا ہے جس طرح صابن سے کثافت دور کی جاتی ہے ۔ ان کی قابلیت اور بزرگی نے ہمعصروں کے دل میں گھر کر لیا تھا ۔ خواجہ میر درد کا انتقال ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ م ۱۷۸۵ء کو ہوا ۶۶ برس کی عمر تھی ۔ دہلی میں دفن کئے گئے ۔ ان کا مزار اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے ۔

---

[1] آئینۂ معرفت یعنی اردو شاعری میں تصوّف

سوز

سوز تخلص سید محمد میر نام۔ بزرگوں کا وطن بخارا تھا۔ سوز دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما ہوئی۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دہلی پر تباہی آئی تو فقیری لیکر لکھنؤ سدھارے۔ یہاں بھی زمانہ نے چین لینے نہ دیا۔ ۱۲۱۱ھ میں مرشد آباد گئے وہاں سے پھر لکھنؤ کی خاک دامن کھینچ کر اپنی طرف لائی۔ صاحب کمال کا جوہر اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اس بار میر سوز لکھنؤ آئے تو کافی قدر ہوئی۔ نواب آصف الدولہ شاگرد ہوئے مگر افسوس کہ زیادہ دن تک لکھنؤ میں نہ رہنے پائے تھے کہ ۱۲۱۳ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

میر سوز کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ غزل کے لئے شیریں زبان جان ہے وہ ان کے یہاں کافی موجود ہے محاورات کا صرف اس خوبی سے ہے کہ باتوں باتوں میں شعر بلند ہو جاتا ہے ان کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ اضافت، تشبیہ استعارے، فارسی ترکیبیں بہت کم ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر سوز کا رجحان فارسی کی رنگینی کے بجائے ہندی کی سادگی اور خداداد حسن کی طرف تھا۔ آزاد نے سچ کہا تھا کہ اگر اس انداز پر زبان رہتی اور قوت بیان کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا تو آج ہمیں اس قدر دشواری نہ ہوتی۔ اب دوسری مشکلیں ہیں اول یہ کہ رنگین استعارات اور مبالغہ کے خیالات گویا مثل تکیہ کلام کے زبانوں پر چڑھ گئے ہیں یہ عادت چھڑانی چاہئے پھر اس میں نئے انداز اور سادے خیالات کو داخل کرنا چاہئے۔"

حسنؔ

میر غلام حسن نام اور حسنؔ تخلص بزرگوں کا وطن ہرات تھا۔ مگر یہ خاص دہلی کے رہنے والے تھے وہیں پیدا بھی ہوئے تھے۔ دہلی کی حالت جب دگرگوں ہوئی تو یہ اپنے والد میر غلام حسین ضاحکؔ کے ساتھ فیض آباد آئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔

شاعری خاندان میں بزرگوں کے وقت سے چلی آرہی تھی خود ان کے والد میر ضاحکؔ بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ چنانچہ میر حسن نے ابتدا میں ان ہی سے اصلاح لی بعد میں میر دردؔ کو کلام دکھانے لگے جب دہلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے تو میر ضیا الدین ضیاؔ کے شاگرد ہوئے مگر ان کا رنگ کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ لہٰذا میرؔ اور سوداؔ کی تتبع میں شعر کہنا شروع کیا۔ دیوان چھپ گیا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو، صفائی و محاورے کا لطف خاص چیزیں ہیں جو ان کے یہاں نمایاں ہیں۔ میر حسنؔ کے یہاں تصوف اور روحانیت قابل دید ہے ان کو بھی تناسب لفظی کا خاص چسکا ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصائد بھی کہتے ہیں لیکن غزل کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر حسن کی حیات جاودانی کا راز نہ غزل ہے نہ قصیدہ بلکہ مثنوی جس کو اس آب و تاب کے ساتھ اردو کے دربار میں انہوں نے پیش کیا کہ اگلے پچھلے شعرا کو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اردو میں نہ اس سے پہلے کوئی اس پایہ کی مثنوی ہوئی ہے نہ اب آئندہ امید ہے اس لئے کہ جس ماحول میں مثنویاں تیار ہوتی تھیں وہ مدت ہوئی کہ ختم ہو گیا فارسی ہو یا اردو دونوں زبان کی قریب قریب تمام مثنویاں کسی صلہ کی امید پر لکھی

گئیں ہیں۔ اب سوائے زبانی سرپرستی کے اور کسی صلہ کی امید تو کیا بلکہ بقول شخصے یہ بھی امید نہیں کہ توجہ سے لوگ پڑھ لیں گے۔

یوں تو میر حسن نے کئی مثنویاں لکھیں لیکن ان کا بہترین کارنامہ "سحرالبیان" ہے جس میں بے نظیر اور بدر منیر کا افسانہ ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ زمانہ نے اس کی سحرالبیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔" حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کی تنقید پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے جس کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ گنجائش لیکن بغیر اتنا بتلائے جی بھی نہیں مانتا کہ یہ مثنوی اپنے زمانہ کی معاشرتی زندگی کا آئینہ ہے جس سے اس زمانہ کے رسم و رواج تمدن وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بیان اور طرز ادا کا لطف اتنا عمدہ ہے کہ آج تک اسی رغبت کے ساتھ یہ مثنوی پڑھی جاتی ہے۔ جو شاید ان کے زمانہ میں رہی ہو۔ زبان اس دور اندیشی اور پاکیزگی کے ساتھ نظم کی گئی ہے۔ کہ ڈیڑھ سو برس گزرنے کے بعد بھی بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے میر حسن جذبات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ بڑے بوڑھے عورت مرد بادشاہ فقیر سب کا ذکر اس مثنوی میں آیا ہے۔ مگر ہر شخص کا خیال اور بیان حفظ مراتب و کردار نگاری کے لحاظ سے نہایت خوبی سے دکھائے گئے ہیں یہ مثنوی اس قدر دلچسپ اور مقبول عام ہے کہ اس کے اکثر اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ مزا کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ اور منظر و واقعہ نگاری اس خوبی کے ساتھ ہے کہ دولہا دلہن کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھچ جاتی ہے۔ کلام کا نمونہ دینا بیکار ہے اس لئے کہ مثنوی سحرالبیان ہر جگہ مل سکتی ہے۔

میر حسن کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا مصحفی نے "دو شاعر شیریں بیان" سے مادۂ وفات نکالا۔

میر

میر آگرہ میں پیدا ہوئے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی، والد کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے۔ یہاں اپنے ایک رشتہ دار سراج الدین خاں آرزو کے یہاں کچھ دن رہے تحصیل علم جاری تھی مگر خالو کے برتاؤ نے میر کو بڑی تکلیفیں پہونچائیں اور یہ دہلی سے پھر اکبر آباد چلے گئے کچھ دنوں یہاں قیام کرکے پھر مستقل دہلی واپس آئے۔

میر کی شاعری کو عروج دہلی میں ہوا۔ لوگ ان کے کلام کو دور دراز شہروں میں بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ دہلی نے اُن کی قدر بہت کچھ کی۔ شاہ عالم کے دربار اور امراء کی محفل میں ان کا جوہر کمال بڑے بڑوں سے داد تعظیم و تکریم لیتا لیکن بقول آزاد "خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا" اس لئے میر نے سینہ پر صبر کی سل رکھ کر حسرت و یاس کے ساتھ آرزو، سودا، اور سوز کی طرح دہلی کو بھی الوداع کہا اور ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں غیر معمولی التفات اور اعزاز کے ساتھ میر کی آؤ بھگت کی گئی۔ نواب آصف الدولہ نے میر کے لئے دو سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیئے۔

میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام اور گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے۔ بات کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی اور ملائمیت تھی مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی۔ بد مزاجی بھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی نتیجہ یہ تھا کہ فاقے کرتے تھے دُکھ اٹھاتے تھے۔ مگر بقول آزاد اپنی بددماغی کے سائے میں دنیا اور اہل دنیا سے بیزار بیٹھے رہتے تھے سان کی

لازوال دولت یعنی سرمایۂ شعر و سخن نے ہفت اقلیم کی سلطنت کو ہیچ سمجھا اور ان کی استادی کا اقرار نہ صرف ان کے ہمعصروں نے کیا بلکہ زمانہ نے اس کا فتویٰ دیا کہ اردو شاعری میں اس سے زبردست غزل گو نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ جس پایہ کے وہ استاد تھے اتنے ہی پُرگو بھی تھے ان کے کلام کا ذخیرہ نہایت وافر ہے ایک دیوان فارسی کا ہے اور چھ دیوان اردو کے ہیں بہت سی مثنویاں وقصائد بھی ان سے یادگار ہیں ایک مختصر سا رسالہ فیض میر اور ایک اردو شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا بھی موجود ہے اردو کے دیوان میں علاوہ غزلوں کے رباعی، مخمس، مستزاد، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس وغیرہ سب ہی کچھ ہیں۔ واسوخت وہ ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں۔ آزاد نے میر صاحب کو اردو میں واسوخت کا موجد قرار دیا ہے۔

یوں تو میر صاحب نے مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں ان کا پایہ ہر شاعر سے ممتاز ہے جس کا اعتراف اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ مختلف اوقات میں کر چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تغزل جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے میر صاحب نے نبھایا ہے وہ ان ہی کے حصہ کی بات ہو گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کی بدولت ان کی انفرادیت قائم و برتر ہے۔ میر کے یہاں بقول مصنف کاشف الحقائق "سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت شیرینی، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں" اگر اس کے ساتھ ان کا خلوص بھی شامل کر لیجیے تو آسانی سے یہ راز معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ تاثیر و تغزل میں کوئی دوسرا کیوں نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ ایک اور زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ عشق کے واردات کو اس حسن سے بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ پاتے ہیں۔

ان کے اشعار میں سادگی اور صفائی اتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار

ذہن میں سما جاتے ہیں اور دل میں نشتر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاص و عام محظوظ ہوتا ہے۔ غزل میں جذبات پر اگر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں اس دل کے واردات ہیں جس پر عشق کا پورا وار ہو چکا ہے۔ میر صاحب کی زندگی پتہ دیتی ہے کہ عین شباب میں کسی کی نگاہِ ناز کے گھائل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے طبیعت میں سوز و گداز اس طرح سے اپنا کام کر رہے تھے جیسے رگوں میں لہو میر کا درد و اضطراب اپنے ساتھ ایک خاص سکون و کیفیت لے کر آتا ہے سننے والے سنتے ہیں اور بجائے کرب کے اپنے دل میں ایک اشتیاق پاتے ہیں۔

قصیدہ میں میر صاحب سودا سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدہ کے لئے ایک بڑی حد تک کار آمد نہیں۔ اس میں شکوہ الفاظ۔ مضامین کی بلند پروازی اور طبیعت کی شگفتگی نہایت ضروری سامان ہیں یہاں طبیعت اس کی عادی تھی کہ ملائم الفاظ ہوں۔ سامنے کے مضامین ہوں حسن کو پژمردگی اور غم کے سانچے میں ڈھال کر شعر کا جامہ پہنا دیا جائے۔ قصیدہ میں مدح کا حصہ خاص ہوتا ہے۔ ان کی خود دار طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی کہ اس میدان میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملائیں۔

مثنوی، اس صنف شاعری میں میر صاحب کو بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ یہاں بھی عشق کے واردات نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کرتے ہیں لیکن منظر نگاری پر اتنی دسترس نہیں۔ اور پھر بقول مصنف کاشف الحقائق "آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا نادر ہیں۔ کہیں آپ صحرا، جنگل، جبال، خزاں بہار وغیرہ جیسے خوش آیند مضامین بیان نہیں فرماتے ہیں۔ کردار اپنی جگہ پر موزوں نظر آتے ہیں اور بڑی خوبی سے جگہ پاتے ہیں۔ ان کی مثنویوں نے وہ رنگ جمایا

کہ اکثر شعرا نے ان کے قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کی۔

میر صاحب کے کلام پر جو رائے آزاد نے دی ہے ہمارے نزدیک وہ مختصر طور پر بہترین تنقید ہے جس کو نقل کرنے پر ہم مجبور ہیں۔

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قایم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں [1]"

میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مزار بھی ہے مگر افسوس کہ سنگ مزار بھی نہیں کہ صحیح اندازہ کیا جا سکے کہ کونسی قبر ہے میر درد نے سچ کہا ہے ؎

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

---

[1] آبِ حیات صفہ ۲۱۲

یقین

انعام اللہ خاں نام یقین تخلص۔ ان کے والد کا نام شیخ اظہر الدین تھا۔ یہ معزز خاندان شاہانِ مغلیہ سے متوسل تھے۔ انعام اللہ خاں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے حالات زندگی اب تک لاعلمی کے پردے میں پنہاں ہیں۔ حال میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کا دیوان حیدرآباد سے شائع کیا ہے باوجود جد وجہد کے مرزا صاحب کو بھی مکمل حالات زندگی نہیں معلوم ہو سکے تذکروں سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ یہ ایک خوبصورت، خوش اخلاق، آدمی تھے۔ افیون کھاتے تھے۔ چنانچہ اپنے اشعار میں جابجا افیون کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہمیں مارِ سیاہِ زلف کے کاٹے سے کیا ہوئے
کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خالِ لب کی افیوں سے

یقین میرزا مظہر جانِ جاناں سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یقین خود شعر نہ کہہ سکتے تھے بلکہ ان کا دیوان میرزا مظہر کا کہا ہوا ہے۔ مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ یقین خود نہایت اچھے شاعر تھے ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر کچھ اور جیتے رہتے تو اردو شاعری میں ایک کارِ نمایاں کرتے مگر افسوس کہ پچیس برس کے سن ہی میں مار ڈالے گئے۔ ان کے قتل ہونے کی مختلف وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ جن کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہایت مدلل گفتگو کی ہے مگر پھر بھی قتل ایک رازِ سربستہ ہی رہ گیا جس کے سلسلہ میں ہم ایک اقتباس مرزا صاحب کا پیش کرکے اس غمناک واقعہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں " اب رہے

تذکرے والوں کی کچھ نہ پوچھو ایک نے کچھ لکھا۔ دوسرے نے اس سے روایت لی مگر اپنی طرف سے تھوڑا بہت کچھ اور بڑھا دیا تیسرے نے اس کا ترجمہ کرکے رنگ ہی بدل دیا اس لئے میں یقین کے قتل کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد نے ان کو کسی ایسی وجہ سے قتل کیا جس کا پتہ چلنا اب ناممکن ہے کیونکہ یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا اور وہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا[1]" غرض یقین کا انتقال سنہ ۱۱۶۹ھ میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوا۔

یقین کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ متروک الفاظ ان کے یہاں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کی شوخی اور طرز ادا شعر میں دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ یقین بحریں نہایت شگفتہ منتخب کرتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایک قافیہ کو مختلف پہلو سے مختلف ردیفوں میں جگہ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معنویت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ دیوان بھر میں ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ دو جگہ ایک ہی قافیہ سے ایک ہی مضمون ادا کیا ہو۔

یقین کے دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر درد کی طرح یقین کہتے تھے لیکن یہ التزام خاص طور پر دلچسپ ہے کہ دیوان بھر میں ایک سو ستر غزلیں ہیں اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں کلام میں مزا اور نمک ہر جگہ ہے۔ گو کہیں کہیں پر صنعت ایہام بھی ہے لیکن اس زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر بھی قابل گرفت نہیں معلوم ہوتا تعقید سے کلام میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ اس زمانہ کے شعرا روا رکھتے تھے۔ یقین کے یہاں جوش و ولولہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔

---

[1] دیباچہ دیوان یقین صفحہ ۳۱

یقین نے فارسی شعرا کے خیالات لے کر کہیں کہیں نظم کئے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ سرقہ نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ مقابلہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ مضمون میں وسعت اور جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں چند باتیں قابل غور و داد ہیں۔ زبان کی صفائی ابھی ایسی نہ ہوئی تھی کہ اس میں خیالات کو پوری طرح سادگی کے ساتھ ادا کر سکتے۔ اس دور کے شعرا نے اس بات کا احساس کیا اور پوری طرح سے اس اصلاح کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ چنانچہ فارسی کی ترکیبیں جو بقول آزادؔ مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں انہیں گھلایا یعنی فارسی کی ترکیبیں اور محاوروں کو اردو کے سانچہ میں ڈھال کر ایرانی سے ہندوستانی کر لیا۔ جتنے محاورے فارسی کے اس دور میں اردو کے بن کر ہماری زبان میں آئے ہیں شاید اتنے کبھی نہیں آئے۔ آزادؔ نے ایک فہرست آبِ حیات کے دیباچہ میں دی ہے۔ جو قابل مطالعہ ہے۔

اس زبان کی صفائی اور معیار کے قائم رکھنے کے لئے خواجہ میر دردؔ نے اپنے مکان پر ایک ماہانہ مشاعرہ مقرر کیا جس میں شعر و زبان کے حسن و قبح پر نظر ڈالی جاتی تھی بعد میں یہ مشاعرہ میر صاحب کے یہاں ہونے لگا اس انجمن کو قائم رکھنے کی فکر عرصہ تک بزرگانِ سخن کو رہی۔

ہندی کے ثقیل الفاظ جو اب تک روڑے بن کر شاہ راہ ادب میں مخل ہوتے تھے اُن سے بھی زمینِ شعر کو پاک کر کے ہموار راستہ بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے شعرا کے کلام میں نفاست اور خیالات میں صفائی پیدا ہو گئی کیونکہ

فارسی کی نامانوس ترکیبیں اور ہندی کے ناخوش گوار الفاظ بہت کم ہو گئے تھے۔

اس دور کے شعرا نے سنگ لاخ زمینیں اور پیچ در پیچ استعاروں سے بہت کچھ گریز کیا ہے تاکہ خیالات الفاظ کے ساتھ ہی دلوں میں اتر جائیں۔ جو تاثیر اور درد اس زمانہ میں شعراء کو نصیب ہوا وہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی دور میں نظر آتا ہے

آزاد کو اس بات کا ملال ہے کہ "اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رخ نہ کیا کاش آگے قدم بڑھاتے تاکہ حسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ اُنکی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نظر فارسی شاعری پر تھی جس کے دامن میں اتنی وسعت نہ تھی جتنی مغربی زبانوں میں ہے اگر وہ میدان پیش نظر ہوتے تو اس دور کے شعرا کی قابلیت اور جدت غالباً دوسرے میدانوں میں بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہتی۔

اس دور کے شعرا کا کارنامہ ایک اور لحاظ سے بھی قابل فخر و ستائش ہے مثنوی اور قصیدے میں وہ نام کیا کہ جواب تک مشکل سے ہوا تھا گو یہ تو نہیں کہ اس سے پہلے ان چیزوں پر طبع آزمائی نہ کی گئی ہو۔ لیکن حسن۔ میر اور سودا نے ان اصناف شاعری کو اتنا فروغ دیا کہ دونوں معراج کمال کو پہنچ گئے۔

غزل کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں اس دور میں اس صنف شاعری کی جو ترقی ہوئی وہ ہر آنے والے عہد کے لئے باعث رشک رہی۔ اس طرح پر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی دنیا میں اس وقت وہ لوگ خامہ فرسائی کر رہے تھے جن کا نظیر مثنوی، قصیدہ اور غزل میں آج تک کوئی نہ ہو سکا۔

اس عہد کا کارنامہ یہیں نہیں ختم ہوتا بلکہ کچھ اور بھی باتیں ہیں مرثیہ اب تک مسدّس کی شکل میں نہ تھا۔ اسی زمانے میں لوگوں نے مرثیہ کو بھی مسدّس میں کہہ کر خیال اور مضمون میں وسعت پیدا کر دی۔ میر صاحب نے اردو میں ایک اور صنف شاعری کا اضافہ کیا یعنی واسوخت کہہ کر اردو، اور اپنے نام کو بلند کیا مگر وہاں ان پھولوں کے ساتھ کچھ خار بھی آ گئے۔ مرزا سودا نے ہجو گوئی میں بھی کمال پیدا کیا جس کا غلبہ اچھا نہ تھا کیونکہ اس کی سرحد کبھی کبھی ابتذال اور فحش گوئی سے مل جاتی ہے۔

جرأت

ان کا اصلی نام یحییٰ امان تھا مگر زمانہ نے قلندر بخش کے نام سے مشہور کیا ان کے باپ کا نام حافظ امان تھا ان کے بزرگوار مغلیہ خاندان کے دربار سے وابستہ تھے چنانچہ امان شاہی خطاب اکبر کا عطیہ تھا۔

دہلی کی جب حالت خراب ہوئی تو جرأت فیض آباد آئے اور یہاں پڑھ لکھ کر جوان ہوئے۔ نواب محبت خاں کے ملازم ہوئے۔ ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ آئے اور شاہ عالم ثانی کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی کی۔ عرصہ تک یہاں قیام رہا اور یہیں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں پیوند خاک ہوئے۔

جرأت شاعری میں جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے جو فارسی کے ایک مشاق اور اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ جرأت کو موسیقی سے فطری شغف تھا علم نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے طبیعت اتنی شگفتہ پائی تھی کہ بات کرنے

ہیں منہ سے پھول جھڑتے تھے لیکن بعض ان میں آتشبازی کے پھول کی طرح بھی ہوتے تھے جن سے کبھی کبھی لوگ تلملا اٹھتے تھے۔ اس زمانہ کے دربار داد محفلوں کے لیے جرأت کا مذاق ایک بڑی حد تک پرلطف خیال کیا جاتا تھا۔ انشاء اللہ خاں سے صحبت گرم رہتی تھی عین جوانی میں آنکھوں سے محروم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے حریفوں کو مضحکہ اڑانے کا موقع ملتا تھا۔

جرأت اور انشاء دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مسلسل غزلوں کا خاص التزام ہے۔ معاملہ بندی جرأت کا طرۂ امتیاز ہے۔ رندی، سرمستی، اور ہوا ہوس پرستی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر جرأت نے اپنے لیے ایک رنگ الگ قائم کر لیا تھا۔

چھیڑ، خود رفتگی، کیف اور جذبات میں ایک لطیف شوخی پیدا کر دینا جرأت ہی ایسے استاد کا کام تھا۔ اگر اس پہلو کو ابتذال سے بچا لیا جائے تو شاعری لطیف احساسات محبت کی ترجمان نظر آئے گی، مصحفی کے یہاں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے اور موجودہ دور میں حسرت موہانی کے کلام میں بھی کبھی کبھی جرأت کے رنگ تغزل کے پہلو نظر آجاتے ہیں۔ لوگوں کی تقلید اور پیروی سے یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جرأت نے اپنے رنگ کو مقبولیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

جرأت کے باکمال شاعر ہونے میں کلام نہیں انہوں نے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، رباعی، مخمس، واسوخت، ہجو سب کچھ ہے۔ البتہ قصیدہ سے دیوان خالی ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس میں صفائی۔ سادگی خاص طور سے قابل دید ہے۔ محاورات کی بندش اور خوش مزاجی کا چٹخارہ پڑھنے والے کو اپنی طرف پوری طرح مائل کر لیتے ہیں۔ لیکن باتیں ہی

باتیں ہیں نہ کلام میں عمق ہے نہ درد۔ شوخی اور بانکپن البتہ زیادہ ہے۔ بے جا نہ ہوگا
اگر کہا جائے کہ کہیں کہیں شوخی حد سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ان کا کلام حسن و عشق کے
اکثر واردات کا مرقع ہے۔ رباعیوں میں معشوق کے اعضا کا ذکر بڑی خوبی سے
بیان کرتے ہیں۔ دیوان کم یاب ہے اس لئے یہاں نمونہ کلام دینا بے جا نہ ہوگا۔

میں تڑپ کے سنگ تربت بصد اضطراب الٹا
مری قبر پر وہ آکر جو بصد اشتاب الٹا

مرے تو سوال سن کر وہ رہا خموش بیٹھا
نہیں یہ بھی کہنے کی جا کہ ملا جواب الٹا

جو رکھے ہے بخت واژوں وہ غنی سے ہو مفلس
کہ رہے بہ آب دریا قدح حباب الٹا

شب وصل بے قلق تھا کہ وہ سو گیا تو منہ سے
نہ ذرہ بھی میں دوپٹہ زرہ حجاب الٹا

ہمیں ہے خیال اس کا کہ جو آیا خواب میں وہ
تو زباں پہ اس کی ڈر سے نہ وہ ہم نے خواب الٹا

اسی در تک آؤں گا میں کہ نہیں ہے دل کہے میں
مجھے پھیرتے عبث ہو زرہ عتاب الٹا

طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پہ
مجھے شوخ نے دکھا کر قدحِ شراب الٹا

جو کنار مقصد اپنی لگے بہ کے ناؤ گاہے
تو ہوا تھپیڑ مارے لگے بہنے آب الٹا

کبھی تذکرہ میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ

تو ہوا نے دو ہی جرأت ورق کتاب اُلٹا

جرأت زیادہ لکھے پڑھے آدمی نہ تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے مگر شاعری سے دلچسپی دیوانگی کی حد تک تھی، ان کے کلام میں ایسے سارے رجحانات مل جاتے ہیں جو ایک عیش پرست اور زوال پذیر عہد کے تقاضے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جرأت کی شاعری میں صحت مند جنسی اشارے زیادہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی بیانات کے دلدادہ تھے

انشا

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشاء تخلص۔ حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے بزرگوں کا اصل وطن نجف اشرف تھا۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس فن میں یہ خاندان نہایت ممتاز تھا جس کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ کے دربار تک رسائی تھی۔ دہلی کے زوال پر میر ماشاء اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا۔ اور انشاء اللہ خاں وہیں پیدا ہوئے۔ باپ نے انشاء اللہ خاں کی تعلیم و تربیت میں بڑی جانکاہی کی مختلف علوم و فنون کا ماہر کر دیا۔

شاہ عالم ثانی کے وقت میں انشاء اللہ خاں مرشد آباد سے دہلی آئے۔ ان کی قابلیت اور شعر گوئی کی بدولت یہاں کافی احترام ہوا۔ انشاء زود طبیعت اور شگفتگی مزاج سے تمام دربار پر چھا گئے یہاں تک کہ دربار کے دوسرے شعرا اپنا رنگ اکھڑتے دیکھ کر انشا سے کبیدہ خاطر ہونے لگے اور یہ چشمک زنی بزمِ سخن کو کبھی کبھی رزم کا میدان بنا دیتی تھی ایک حریف دوسرے پر تیغ زبان

سے حملہ آور ہوتا دوسرا تیر مذمت و ہجو سے زخمی کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر انشاءاللہ خاں سب پر بھاری پڑتے تھے۔ ممکن تھا کہ یہ صحبتیں کچھ عرصہ تک گرم رہتیں کیونکہ پڑھے لکھے لوگوں کی لڑائی تھی لیکن شاہ عالم کا خزانہ خالی تھا۔ انشا کی ضرورت کے مطابق خرچ دخانہ کرتا ناچار دہلی چھوڑ کر وہ لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کا دربار دہلی کے شعرا کا پناہ گاہ تھا باپ کے دربار سے انشاءاللہ خاں کو آتے ہوئے دیکھ کر مرزا سلیمان شکوہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا قدردانی اور خاطر اس حد تک کی کہ اپنا استاد بنالیا۔ حالانکہ اس سے پہلے مصحفی اپنے استاد سے اصلاح لیتے تھے۔ کچھ دنوں تک انشا یہاں رہے لیکن جو صلہ مندی کے لئے یہ دربار بھی ناکافی نظر آیا۔ رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے یہاں پہنچ گئے اور وہاں نواب کے مزاج میں اتنا دخل ہوا کہ تمام لکھنؤ میں انشاءاللہ خاں کا طوطی بولنے لگا۔ اپنے مزاح اور لطف طبیعت سے نواب کو ایسا گرویدہ کرلیا تھا کہ جس کو جو چاہتے دلا دیتے۔

ایک عام مقولہ ہے کہ "زیادہ میٹھے میں کیڑا پڑ جاتا ہے" انشاءاللہ خاں کی دوستی بھی اسی کی مصداق ہوئی نواب سعادت علی خاں فطرتاً نہایت متین اور سنجیدہ مزاج تھے۔ انشا کی ظرافت اور تمسخر ایسے مزاج کے آدمی کے لئے ایک نہ ایک دن ناگوار ضرور ہونا چاہئے تھا۔ گو ابھی تک نواب کا یہ حال تھا کہ انشاءاللہ خاں کی جدائی کسی وقت گوارا نہ ہوتی یہاں تک کہ ایک دن انشاءاللہ خاں کو جب گھر پر نہ پایا تو یہ حکم دیا کہ آج سے بجز ہمارے دربار کے اور کہیں نہ جایا کیجئے۔ اس قید سے رنجیر نے انشاءاللہ خاں کیلئے وہی کام کیا جو کسی کے لئے طوق و سلاسل کرتے ہیں۔ کچھ دنوں میں شکر رنجی بہت بڑھ گئی۔ دربار سے تنخواہ بھی بند ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشا کے یہاں فقر و فاقہ کا دور دورہ ہوگیا اور وہی انشاء

جن کے دروازے پر ہاتھی جھوما کرتے تھے اور مال و دولت پہرہ دیا کرتے تھے
وہی اس عالم میں ۱۸۱۷ء میں اس دنیا سے سدھارے کہ خدا دشمن کو بھی وہ
دن نہ دکھائے۔

آبِ حیات میں ایک نہایت دردناک تصویر انشا کی آخری حالت کی آزاد
نے سعادت یار خاں رنگین کی روایت کی بنا پر تیار کی ہے وہ ہیں (سعادت یار خاں)
اندر گیا دیکھا کہ ایک کونے میں (انشا) بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے دونوں زانوؤں پہ
سر دھرا ہے آگے راکھ کے ڈھیر میں ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے یا تو وہ تماشا
شکوہ کروفر کے دیکھتے تھے وہ گرم جوشی اور چہلیوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یا یہ
حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پہ بیٹھ گیا اور دیر تک روتا
جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سید انشاء۔ سید انشا نے سر اٹھا کر اس نظر
حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھ میں آنسو ہیں۔ میں نے کہا کیا حال ہے
ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہے۔ پھر اسی طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ
اٹھایا۔

انشا کی قابلیت اور زورِ کلام اس پایہ کے ہیں کہ شاید اردو کے اور شعرا
میں مشکل سے کسی کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہو۔ اور لطف یہ کہ ان کی ہمہ گیر طبیعت کسی
میدان میں بند نہ تھی۔ جس طرف اشہبِ قلم جھک پڑتا میدان کو روند ڈالتا۔ کاش
ایسے عالی دماغ شخص کو کوئی ایسی سوسائٹی مل جاتی جو اس سے ڈرتا یا ایسی ہی کوئی
اور کارآمد چیز لکھا لیتی تو اردو میں انشا کی بدولت شاید ایسا کارنامہ مہیا ہو جاتا
جس کی نظیر مشکل سے ملتی۔

انشا کی کلیات میں قریب قریب تمام اصنافِ شاعری موجود ہیں علاوہ
نظم کے نثر میں بھی ایک تصنیف یادگار ہے جس کا نام دریائے لطافت ہے۔

یہ اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۲ء ہے جس کی زبان فارسی ہے۔ لیکن دوسری کتاب کی زبان اردو ہے جس کا نام "رانی کیتکی کی کہانی" ہے اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ عربی، فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ یہ خالص اردو کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ان کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان پر قدرت اور محاوروں پر حکومت کافی حاصل ہے۔ یہ ہی نہیں کہ صرف اردو، فارسی کے ماہر ہوں بلکہ کئی زبانوں سے واقف تھے۔ چنانچہ ایک قصیدہ لکھا ہے جو سات زبانوں میں ہے۔ ایک قصیدہ اور ہے جو بے نقطے ہے۔

انشاء کا کلام ان کے ماحول کا آئینہ ہے یعنی ظرافت۔ ہجو۔ شوخی، وغیرہ دیکھ کر اس زمانہ کے مذاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا دماغ ایک ایسا ذخیرہ تھا جو بلا کاوش کے ان کے سامنے ایک لمحہ میں ہر چیز پیش کر دیتا تھا۔ کبھی کسی لفظ یا محاورے کی صحت پر اُن سے سند مانگی جاتی تو لغت اور اساتذہ کے کلام سے فوراً نمونہ پیش کر دیتے۔

سوداؔ کی طرح انشاء کا رجحان فارسی، عربی کے علاوہ ہندی کی طرف بھی تھا اس معاملہ میں یقیناً وہ سوداؔ سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ ہی نہیں کہ ہندی کے نرم اور لطیف الفاظ استعمال کرتے ہوں بلکہ اس معاملہ میں اس قدر شغف تھا کہ بحر اور اصناف شاعری کا نام عربی سے بدل کر ہندی میں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مثلث کا نام تکڑا۔ اور مربع کا نام چوکڑا رکھا تھا۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن کی جگہ۔ پری خانم، پری خانم، پری خانم، پری خانم۔ فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن، فاعلن کی جگہ۔ چت لگن، چت لگن۔ چت لگن۔ چت لگن۔ رائج کیا۔ اسی طرح منطق کی اصطلاحیں ہندی میں پیدا کیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں بے اعتدالی بہت ہے لیکن بقول آزاد

"کچھ جہالت کے سبب سے نہ تھی بلکہ عمداً تھی"۔ ان کی غزلوں میں داخلی پہلو
بہت کم ہے۔ ٹھٹھول اور کبھی کبھی عورتوں کا لب ولہجہ یہاں بھی نمایاں ہے
البتہ علوئے تخیل کی کمی کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

مصحفی

مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام باپ کا نام ولی محمد تھا۔ ان کا خاندان امروہہ میں
ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۱۹۰ھ میں کہ مصحفی کا عالم شباب تھا دہلی میں آکر مشق
سخن اور تحصیل علم میں منہمک ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد قابلیت اور شاعری نے انکو
بلندی پر پہنچا دیا لیکن دہلی پر افلاس کا دورہ دورہ تھا لکھنؤ میں سخاوت کی گنگا بہ رہی
تھی جس نے مصحفی کو بھی اپنی طرف مائل کیا۔ دہلی کو خیرباد کہہ کر آصف الدولہ کے زمانہ
میں لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ان کے فن کی کافی
قدر کی گئی یہاں تک کہ زمانے نے جگت استاد تسلیم کر لیا۔ آزاد کا خیال ہے کہ مصحفی
کا انتقال ۱۲۴۸ھ م ۱۸۳۲ء میں ۹۰ برس کے سن میں ہوا لیکن شیفتہ کو اختلاف
ہے گلشن بے خار میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

مصحفی کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ جس پایہ کے شاگرد
ان کو ملے وہ خود اپنے وقت کے مستند استاد تھے۔ مثلاً آتش، خلیق، ضمیر، اسیر
وغیرہ۔ گو مصحفی متین اور سنجیدہ مزاج تھے لیکن سید انشا کی ظرافت نے ان کو
بھی جواب دینے پر مجبور کیا۔ اس وجہ سے ان کے کلام کا ایک حصہ سید انشا کے

رنگ کا ہے۔ لیکن اس معرکہ میں انشائے سے پیچھے ہیں۔ دیوان تعداد میں آٹھ ہیں جس سے ان کی پر گوئی کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ ہزاروں شعر قیمت لے کر بیچ ڈالتے تھے۔ جن کو لوگ اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ طبیعت ہمہ گیر تھی مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں کبھی میر سوز کا انداز ہے کبھی میر کی تقلید ہے اور کہیں سودا کا ڈھنگ ہے لیکن یہ صحیح نہیں مضمون کے اعتبار سے ان کی امتیازی خصوصیت " نشاط شباب " اور " رنگ ردپ " کو نہایت پرکیف و رنگین طریقے سے بیان کر دیتا ہے۔ قصیدے نہایت اچھے ہیں۔ شاندار الفاظ دل پسند ترکیبیں، مشکل زمین خیال میں رفعت سب کچھ ہے لیکن سودا کا سا جوش و خروش کم پایا جاتا ہے۔ ان کی ایک مثنوی " بحر المحبت " بہت مشہور ہے۔

مصحفی کی علمی قابلیت کا پتہ نہیں چلتا مگر خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک دیوان بھی ان کا فارسی میں ہے مصحفی کا نام اردو کی دنیا میں یوں بھی قابل قدر ہے لیکن تذکروں کی وجہ سے ان کی شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دو تذکرے انہوں نے اردو فارسی شعرا کے متعلق لکھے ہیں۔ اردو کے شعرا کا تذکرہ محمد شاہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اور مصحفی کے ہمعصروں تک سلسلہ چلا آتا ہے۔

مصحفی نے اردو زبان کی اصلاح میں کافی حصہ لیا۔ بہت سے الفاظ اور عیوب مثلاً ستر گربہ وغیرہ نکال ڈالے۔ لیکن ایسے الفاظ رائج بھی کر دئے جو مقامی ہیں مثلاً اسپاٹ۔ بھٹ سا اسی طریقہ سے ملکی خصوصیتوں کے مضمون بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

دیکھا نہ میں نے ہند میں جب خشکۂ پیشاوری

لینے برنج اے مصحفی رُخ اپنی پیشا در گئی

تختۂ آب چمن کیوں نہ نظر آئے سپاٹ
یاد آئے مجھے جس دم وہ تمبود کا گھاٹ

اثرؔ

سید محمد نام اور تخلص اثرؔ تھا ان کے حالات زندگی کا پتہ ابھی تک نہیں چل سکا بس اتنا معلوم ہے کہ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے اور ان سے اتنے مانوس تھے کہ جتنا ایک مُرید اپنے پیر سے ہوتا ہے - فقیری اور شاعری دونوں میں دردؔ کی تقلید کرتے ہیں -

اثرؔ کا کلام میر دردؔ کی طرح صاف اور سادہ ہے - لیکن وہ دردؔ نہیں جو دردؔ کے یہاں ہے - جذبات بے شک ادا ہوگئے ہیں اور نہایت خوب نظم ہوئے ہیں لیکن بقول مولوی عبدالحق "مضمون کو دیکھئے تو اس میں تصوّف ہے نہ اخلاق - نہ حکمت و فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کر دی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"[1]

دیوان بہت مختصر ہے اور قریب قریب ساری غزلیں چھوٹی بحریں ہیں کچھ رباعیاں ہیں اور کچھ مطلعے - غزلیں مختصر ہیں اور زبان کے لحاظ سے فارسی ترکیبیں ہیں مگر بہت کم - یوں تو اثرؔ کے کلام میں دل سوزی، درد، خلوص سب کچھ ہے مگر بقول مجنوں جس خصوصیت نے اثرؔ کو اثرؔ بنایا ہے وہ ایک جدّت ہے - ایک گداز

[1] دیباچہ دیوان اثر صفحہ ۳

ایک عاشقانہ گم شدگی ہے"۔ الفاظ بہت کم آئے ہیں۔ اور ممکن تھا کہ ان کی ثقالت معلوم بھی نہ ہوتی مگر چونکہ اثر کی زبان بہت نرم ہے اس وجہ سے یہ الفاظ کبھی کبھی ناگوار ہوتے ہیں۔ مثلاً تعجبات۔ میر اثر کا شعر ہے

زیست ہوئی تعجبات ہے اب
مرہی جانا بس ایک بات ہے اب

اسی طرح پرافہام۔ اُلجھیڑے۔ ہم وطنان وغیرہ ہیں مگر یہ خرابی زیادہ نہیں ہے۔ اثر کے کلام میں چند الفاظ اور بھی قابل دید ہیں جن سے اسی دور کے لسانی رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

تلوار کے بجائے تروار، آگے کے بجائے آگو، ہم نے کے بجائے ہمنیں، جن نے کے بجائے جنیں۔

ایک مثنوی خواب و خیال بھی ان کی یادگار ہے۔

دور کی خصوصیت

(۱) زبان کی اصلاح برابر جاری ہے ثقیل الفاظ برابر نکالے جارہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں صفائی اور روانی زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی نت، ٹک، واچھڑے، جھمکڑا، زور (بہت) وغیرہ ابھی اپنی جگہ پر قایم ہیں۔

(۲) ہندی کے الفاظ بھی لائے گئے مگر نرم اور فصیح۔

(۳) مضمون میں بہت کم ترقی ہوئی اس دور کے شعراء بزرگوں کے خیالات کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں مگر خود کوئی نئی بات مشکل سے سوچتے ہیں۔

(۴) ظرافت اور تمسخر کی بھرمار ہے یہاں تک کہ متانت اور سنجیدگی کی بھی آنکھیں کبھی کبھی بند ہو جاتی ہیں۔

(۵) ملکی اور مقامی خصوصیات کو اس دور کے شعرا نے زیادہ جگہ دی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے میلے اور مختلف جشن اور اثرات کا تذکرہ پہلے سے زیادہ ہے۔

(۶) کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی زیادہ ہے کم شاعر ایسے ہیں جن کے یہاں یکسانیت پائی جاتی ہو۔

(۷) شاعری میں روحانیت اور عمق کی کمی ہو گئی۔ باتیں ہی باتیں رہ گئیں۔ درباداری کی وجہ سے شعرا اپنی آزادی خیال کو کام میں نہ لا سکے، بہت کم شاعر ایسے ہیں جو دربار کی سرپرستی کے جویاں نہ رہے ہوں اور جو دربار سے متعلق تھے وہ اپنے سرپرستوں کی خوشی کو زیادہ مدنظر رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں تصوف اور جذبات عالیہ کی کمی ہو گئی۔

(۸) سید انشا نے دریائے لطافت، لکھ کر اردو کے محاورات اور قواعد کو باقاعدہ کرنے کی کوشش کی۔

(۹) آپس کے مقابلہ نے غزل میں زور آزمائی کا میدان ڈھونڈھا مشکل قافیے۔ ردیف۔ زمین پر زیادہ توجہ ہونے لگی اور ایسی صورت میں صرف غزل کی خانہ پوری ہو سکی۔ معنویت اور بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

(۱۰) ریختی کو بھی فروغ اسی زمانہ میں ہوا غالباً امرا کی خوشنودی مزاج اور تعیش پسندی کے زیر اثر اس کی نشوونما ہوئی۔

شعرا کے باہمی اختلافات نے جو ادبی اور فنی اعتراضات کا سلسلہ قائم کر دیا تھا اگر وہ تنقید کا پہلو اختیار کر لیتا تو اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا

لیکن نہ تو اس نیت سے اعتراض کئے جاتے تھے اور نہ کسی کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

باب ۶
نظیر اکبر آبادی

تاریخ ادب اردو مرتب کرنے والے کے لئے ایک بڑی دقت نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس دور کے شعراء کے ساتھ رکھا جائے۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ حملۂ نادر شاہی کے وقت دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی قرین قیاس بھی ہے کیونکہ انہوں نے طویل عمر پائی تھی اور ان کا انتقال سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوا اگر پیدائش سنہ ۱۷۳۹ء یا ۱۷۴۰ء کے قریب مان لی جائے تو البتہ نظیر کے عہد متعین کرنے میں کچھ آسانی ہو جاتی ہے پھر بھی زبان۔ طرز بیان۔ موضوع کے لحاظ سے ان کو کسی دور سے وابستہ کرنے میں قطعی فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے۔

ہم ان کو اپنی دنیا آپ سمجھ کر ہر دور سے الگ رکھتے ہیں ان کے کلام کی خصوصیات خود ایک دور کی خصوصیات کے برابر ہیں۔

نام ولی محمد تھا اور نظیر تخلص کرتے تھے۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے زمانہ میں دہلی چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ آگرہ آئے اور اکبر آبادی ہو گئے۔

دہلی اس زمانے میں انقلابات کا گہوارہ تھی۔ سیاسی۔ سماجی تبدیلیاں، ہو رہی تھیں۔ نظیر کو بھی انہیں تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی سمجھنا چاہیے کیونکہ غزلوں کی رسمی شاعری کو الگ کرنے کے بعد نظیر کا نہ تو کوئی ہمعصر دکھائی دیتا ہے اور نہ ہم زبان، انہوں نے میر کی قنوطیت اور سودا کی ہمہ گیری بھی دیکھی وہ درد کے تصوف سے بھی آشنا تھے۔ جرأت کی معاملہ بندی۔ مصحفی اور انشا کی چولوں کا نظارہ بھی انہوں نے کیا۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کے مرکزوں سے دور رہ کر اپنی ایک الگ شاہراہ تیار کی جس پر خود ہی چلے۔ دوسرا کوئی ادھر ادھر قدم نہ بڑھا سکا

نظیر ایک قناعت پسند طبیعت لے کر آئے تھے، درباروں سے وابستگی نہ تھی۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور اس حلقہ میں امیر و غریب، عالم و جاہل پیشہ ور اور غیر پیشہ ور، ہندو مسلمان کسی کی قید نہ تھی۔ اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثرات کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا تھا۔ نہ گئے اور تقریباً عمر بھر آگرہ ہی میں لالہ بلاس رام کے یہاں معلمی کر کے شاعری کرتے رہے۔ کلام کا زیادہ حصہ بھی لالہ بلاس رام ہی کے یہاں سے ملا ورنہ نظیر کو خود اس کے جمع کرنے کا خیال نہ تھا۔ ضعیفی میں فالج سے انتقال کیا۔

نظیر کی آزاد زندگی میں شاعری کو نئی راہوں پر جانے کا موقع خوب ملا پابندیوں کی کمی، معیار کی قید سے آزادی، زبان کی لطافتوں کے جھگڑے سے نجات حاصل ہونے کی وجہ سے نظیر کو اپنی شاعری کی دنیا وسیع کرنے کا موقع بھی مل سکا

اور انہوں نے غزل سے ہٹ کر نظموں پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی۔ غزلوں میں تغزل اور کیفیت بہت ہے لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو کا یہ کہنا کہ لکھنؤ کا قدیم طرز چھو بھی نہیں گیا ہے۔ شاید نظیر کی غزلوں کے ان اشعار کے پڑھنے کے بعد زیادہ صحیح نہ ثابت ہو جن میں خارجیت اور رعایت لفظی ہے۔

کلیات نظیر کی کچھ نظمیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جو پیشہ ور دوستوں کی فرمائش پر لکھی گئیں اور کچھ وہ ہیں جو ممکن ہے لالہ بلاس رام کے لڑکے یعنی اپنے شاگرد کو خوش کرنے کے لئے جانوروں اور چڑیوں کے بارے میں لکھی گئیں لیکن انہیں میں بعض نظمیں ایسی بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن میں تصوف کا کوئی مسئلہ اشاروں کنایوں میں بیان کیا گیا ہے۔

ان نظموں کا ذخیرہ بھی کافی ہے جو جوانی اور جوانی کی سرمستیوں کا ذکر کرتی ہیں۔ اگرچہ لہجہ اور انداز بیان کہیں کہیں غیر مہذب ضرور ہو گیا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے کہ بہت زیادہ ناگوار ہو۔ پھر ان نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں افلاس کی زندگی کو فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یا زندگی کی تکلیفوں کی تصویر کھینچی گئی ہو چاہے وہ غریبی اور بڑھاپے کی وجہ سے ہو یا عشق یا کسی اور سبب سے لیکن جن نظموں کی وجہ سے نظیر کا نام زندہ رہا وہ ان کی واعظانہ اور ناصحانہ نظمیں ہیں۔ جن میں کہیں تمثیل کی مدد سے اور کہیں صاف صاف نظموں میں زندگی کی بے ثباتی اور موت کا یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جوانی میں جتنی زندگی اور سرمستی کا منظر پیش کیا تھا۔ یہ بڑھاپے میں اسی کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی نظموں میں جہاں اسلام کے بعض

رہنماؤں کا ذکر ہے وہاں گرونانک بھی آتے ہیں اور ان کے کلیات کا اچھا خاصہ حصہ ہندو مذہب کی روایات اور تہواروں کے رنگین اور دلکش بیان کے لئے وقف ہے۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا اُن کا تعلق کسی مرکز سے نہ تھا اس لئے وہ عوام کے قریب آئے۔ اسی لئے ان کو وہ زبان بھی اختیار کرنی پڑی جو عوام کے لئے قابل فہم ہو۔ شاعری کی صناعانہ تکمیل تو ان کے یہاں نہ ہو سکی لیکن انداز بیان کے لحاظ سے انہوں نے اپنے فنی شعور کا پورا پتہ دیا ہے۔ انہوں نے نظم کی زبان موضوع کے اعتبار سے اختیار کی ہے۔ چنانچہ نظیر کے کلیات کا مطالعہ کرنے والا مختلف قسم کی زبانوں کے حلقے دیکھے گا۔ جو موضوع کی مناسبت سے اس کے گرد کھنچے گئے ہیں۔

نظیر کے یہاں جو شاعرانہ واقعیت اور بیان کی صداقت ملتی ہے اس میں اگرچہ خیال کی گہرائی اور تاثیر کے تیز نشتر نہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم نظیر کو ایسا شاعر مانیں جس نے اپنی نظم کا مواد روزانہ کی زندگی سے حاصل کیا اور اسے اپنے رنگ میں پیش کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مقامی رنگ کافی ملتا ہے۔ وہ کسی وقت خالص مثالی چیزیں نہیں پیش کرتے بلکہ اپنے گرد وپیش کے مناظر اور واقعات کو ایک پُرخلوص سادگی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔

ان کی زندگی اور شاعری میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے جو نظم لکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔ نظیر کے بارے میں نقادوں نے مختلف قسم کی رائیں قائم کی ہیں کسی نے انہیں شاعر ہی نہیں مانا ہے اور کسی نے انہیں انیس وغیرہ سے بڑا شاعر سمجھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعر تھے مگر صف اوّل کے

نہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ نے مختصر لفظوں میں بہت صحیح لکھا ہے۔ کہ نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشاء کی ظرافت، انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُن میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

امام بخش نام، ناسخ تخلص تھا۔ پیدائش فیض آباد میں ہوئی۔ بعد میں لکھنؤ چلے آئے۔ ان کے خاندانی حالات پر مختلف ارباب قلم نے مختلف باتیں قائم کی ہیں۔ لیکن ان باتوں کو نہ تو تاریخ ادب سے تعلق ہے اور نہ بحث اتنی خوشگوار ہے کہ اسے یہاں چھیڑا جائے۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے۔ کہ دنیائے ادب میں ان کی ہستی ذاتی تھی۔

ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا خوراک کی مقدار کچھ کم نہ تھی پانچ سیر پختہ کھاتے تھے۔ جس پھل کو جی چاہتا گلن اور سینیاں بھر کر سامنے منگاتے اور دم کے دم صاف کر جاتے مگر یہ سب باتیں ان کے جثہ کے لحاظ سے نامناسب نہ تھیں۔ نہایت قوی ہیکل تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ۔ اور

منڈا ہوا سر۔ سیاہ رنگ۔ کھاروے کا لنگ باندھے شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔

لکھنؤ میں انھوں نے عربی، فارسی پڑھی تحصیل علم کے بعد اصلاح کلام کے لئے میر کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن انھوں نے اصلاح کی زحمت نہ کی۔ خواجہ عشرت لکھنوی مصنف "آب بقا" کا خیال ہے کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور عیسیٰ خاں تنہا سے ناسخ اصلاح لیتے رہے۔ لیکن عام طور سے یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی خود ہی اپنا کلام دیکھتے رہے۔ ناسخ کو ترقی کے لئے میدان صاف ملا۔ بہت قلیل مدت میں مشہور شعرا مثلاً میر، سودا، جرأت، مصحفی سب کے سب یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ناسخ اپنے کمالات کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔ امرا و رؤسا میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی، آغا میر وزیر سلطنت اودھ ناسخ کے خاص سرپرستوں میں تھے۔ انھوں نے چاہا کہ دربار سے ملک الشعرا کا خطاب بھی دلا دیا جائے ناسخ نے نواب غازی الدین حیدر کی اہمیت اتنی نہ سمجھی کہ ان کا عطا کیا ہوا خطاب قبول کریں صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب کو یہ رویہ ناپسند ہوا۔ وہ ناسخ سے خفا ہو گئے

نواب صاحب کی خفگی سے ناسخ کو جان کے لالے پڑ گئے گوشۂ عافیت تلاش کرنے کے لئے الہ آباد آنا پڑا۔ اور بار بار آنا پڑا یہاں آ کر دائرہ شاہ اجمل میں قیام کرتے اسی مناسبت سے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

دہلی اُجڑ چکی تھی وہاں کے باکمال شعرا ہسر پرستی کی تلاش میں لکھنؤ آ رہے تھے اپنی خصوصیات کی وجہ سے اب ادب کا مرکز لکھنؤ ہو گیا تھا۔ آتش و ناسخ نے اپنے کمالات کی بنا پر لکھنؤ اسکول کی بنا ڈالی۔

ناسخ نے شاعرانہ انفرادیت کے علاوہ ایک خاص علمی حیثیت بھی حاصل کرلی۔ شاعری سے زیادہ انہوں نے قواعد، عروض پر زور دیا۔ ایسے الفاظ و افعال وغیرہ جو اپنی ساخت کی وجہ سے بھدے اور ثقیل معلوم ہوتے تھے ان کو شاعری سے باہر کرنا ناسخ نے اپنا فرض منصبی سمجھا۔ مثلاً کا ہلی سے کہلاتا سمجھنا سے سمجھا جائے۔ وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اسی طرح پیٹ کے بجائے بہت ٹک کے بجائے ذرا، تجھ سوا، کے بجائے ترے سوا وغیرہ کو رواج دینے پر زور دیتے رہے۔ ابھی تک عربی، فارسی، ہندی الفاظ کے لئے تذکیر و تانیث کا کوئی خاص قاعدہ اردو میں نہ تھا۔ ناسخ نے اس کی طرف بھی توجہ کی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ناسخ سے پہلے کسی اور کو ان تبدیلیوں کا خیال نہ تھا۔ مگر جس شدت کے ساتھ ناسخ نے محسوس کیا غالباً اردو کی حیات میں کسی اور نے نہیں کیا تھا۔

انہوں نے اپنے قاعدوں پر خود بھی عمل کیا اور شاگردوں کو بھی اس کی تقلید پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی ہوئی یعنی تمام اردو کی فضا ناسخ کی شاعری سے متاثر نظر آنے لگی جتنا اثر ان کے رویہ کا ہوا غالباً اردو میں کبھی کسی ایک شاعر کا نہ ہوا ہو گا۔

ناسخ نے ان اصطلاحات پیدا تنی زیادہ توجہ کی کہ ان کے اشعار بے کیف ہو گئے۔ زبان کو وسعت عطا کرنے کے لئے نئی تشبیہات، نئے استعارے لانے کی فکر کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ بعض بعض تشبیہیں اور استعارے دور از کار

ہو گئے بعض عامیانہ ہو گئے۔ بلندی تخیل کلام میں کھوسے پھٹکے ملتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا کلام ٹھوس بہت ہے۔ شعر کی مضبوطی محاورات والفاظ کی صحت۔ فن کی واقفیت میں دوسرے کے دلپذیر ان کے کلام کو ترجیح دی جاتی ہے۔

الہ آبادی میں تھے کہ راجہ چندو لال نے دکن بلانے کی خواہش کی اور بارہ ہزار روپیہ کا لالچ دیا۔ لیکن وطن کی محبت نے ناسخ کو باہر نہ جانے دیا۔ ہمیشہ وطن کی یاد میں تڑپتے رہے۔

نواب غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد پھر لکھنؤ جانا نصیب ہوا لیکن اس بار بھی زیادہ نہ رہ سکے۔ دربار کا رنگ دیکھ کر پھر وطن کو خیر باد کہا بالآخر ۱۲۴۸ھ میں لکھنؤ آ کر گھر میں ایسا رہے کہ مر کر نکلے۔

ان کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا۔

آتش

آتش تخلص۔ خواجہ حیدر علی نام دہلی کا خاندان تھا۔ آتش کے والد خواجہ علی بخش دہلی سے فیض آباد آئے۔ آتش کی ولادت کا فخر فیض آبادی کو حاصل ہے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ لہذا تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ بعد میں فارسی و عربی کسی حد تک پڑھ لی تھی۔

آتش کے خاندان میں پیری مریدی کا بھی سلسلہ چلا آتا تھا لیکن انہوں نے خاندان کی روش چھوڑ کر شاعری اختیار کی۔ شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اتنا نام پیدا کیا کہ مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔ بلکہ سیکڑوں شاگرد

کو اُستاد کر دیا۔

اسّی روپے ماہانہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتے تھے پندرہ روپے گھر میں دیتے تھے اور باقی راہ خدا میں غریبوں کو تقسیم کر دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مہینے میں ایک آدھ فاقہ بھی ہو جاتا۔ اکثر شاگرد امیر زادے تھے لیکن کوئی سلوک کرنا چاہتا تو مشکل سے قبول کرتے۔ گو فقیری چھوڑ دی تھی لیکن فقیرانہ انداز انکی طبیعت سے کبھی نہ گیا۔ آزاد ان کی طرزِ معاشرت کے متعلق لکھتے ہیں "ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کئے تھے بوریا بچھا رہتا تھا اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ اور عمرِ چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز دلے پروا فقیر تکیہ میں بیٹھا ہو کوئی متوسط الحال اشراف یا کوئی غریب آتا تو متوجہ ہو کر باتیں بھی کر لیتے تھے۔ امیر آتا تو دھتکار دیتے تھے وہ سلام کر کے کھڑا رہتا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے۔ یہ کہتے "ہوں! کیوں صاحب! بوریئے کو دیکھتے ہو۔ کہ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ یہاں مسند تکیہ کہاں؟

ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کے ساتھ رہے۔ گیروا تہمد باندھتے تھے ایک ڈنڈا کبھی ہاتھ میں ہوتا تھا۔ پیر میں سلیم شاہی جوتا ہمیشہ دیکھا گیا۔ بھنگ پینے کا شوق عمر بھر نہ گیا۔ آخر وقت میں بینائی جاتی رہی تھی۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی۔

آتش ناسخ کے ہمعصر تھے جن سے مشاعروں میں ہنگامہ آرائی رہتی مگر صرف نوکِ زبان تک محدود رہی۔ سودا اور انشا کی طرح ہاتھا پائی کی نوبت نہ آئی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس جوش کو آدابِ دربار بھی دبا نہیں سکتا تھا۔

کبھی کبھی سیر در بار لوک جھونک ہو جاتی - آتش کا کارنامہ صرف ایک دیوان غزلوں کا ہے جو ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا - دوسرا تتمہ ہے جو ان کے بعد مرتب ہوا -

لکھنؤ اسکول کا سب سے بڑا کام زبان کی درستی تھی - چمنستان اردو کو خس و خاشاک سے پاک کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا اور انصاف یہ کہتا ہے کہ اس معرکہ میں اس اسکول کو بہت کچھ کامیابی ہوئی -

ناسخ نے خاص طور پر اصول مرتب کئے کہ کون سے الفاظ رکھے جائیں اور کون سے نکالے جائیں - آتش نے صفائی زبان کو اپنے یہاں آئینہ کر کے دکھایا - چنانچہ سب سے پہلی خصوصیت جو آپ کو خواجہ آتش کے یہاں ملے گی وہ زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین صرف ہے -

روزمرہ اور بول چال کا لطف آتش کے کلام میں بیحد مزا پیدا کر دیتا ہے رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی دلکشی دوبالا کرتی ہے - اور پھر اس پر لطف یہ کہ اختصار کے ساتھ مضمون ادا ہوتا ہے - جو سونے میں سہاگا کا کام دیتا ہے - مثلاً :-

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھئے

کہا جاتا ہے کہ آتش کے کلام میں صرف باتیں ہی باتیں ہیں - علو تخیل و بلند پروازی مفقود ہیں مگر یہ خیال محض ان کے مخالفوں کا ہو سکتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ان کا دیوان مضامین بلند سے خالی نہیں - فقیرانہ اور آزادانہ رنگ آتش کو انفرادی حیثیت دے کر دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے - اور شعر میں جان پیدا کر دیتا ہے - ایک جگہ کہتے ہیں :-

ؔ منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

کام ہے شیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب رُخ پر درد سے غرض!

آتش کے یہاں تصوف کی چاشنی اس مزے اور آزادی کے ساتھ ہے کہ بے جا نہ ہوگا اگر ان کو اردو کا حافظ کہا جائے۔ مستی کا عالم ملاحظہ ہو:۔

ؔ جہاں ز کارِ جہاں سے ہوں بے خبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

آتش ثقیل الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں اور جہاں کہیں ایسے الفاظ آجاتے ہیں۔ وہاں طرز ادا اور نشست الفاظ کی وجہ سے ان کو بھی محبوب بنا دیتے ہیں۔ مثلاً "احسن القصص" کی ساخت کو دیکھئے تو غزل کیلئے ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر آتش نے کس مزے کے ساتھ اس کو نظم کیا ہے۔

حافظ رخ کتابی محبوب کے ہیں ہم
یہ "احسن القصص" ہے ہمیں یاد ہوگیا

حسن کے خارجی لوازمات کی تعریف اس زمانہ میں مقبولِ عام تھی مگر کہنے والے کبھی کبھی تو اُلجھ کر رہ جاتے تھے۔ معنویت اور سادگی تو دور شعر بھول بھلیاں ہو جاتا تھا۔ مگر خواجہ آتش نے کمال کیا ہے کہ اس رنگ میں بھی دلچسپی اور معنی آفرینی قائم رکھی ہے۔

آتش تشبیہات کو بھی نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔
مثلاً کہتے ہیں:۔

اب کی بہار میں تو مجھے پار اُتار دے
کشتیٔ دو دآبہ امیدّ و بیم سے

آتش کے یہاں چند کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی عامیانہ مضمون نظم کر جاتے ہیں جن کو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ باتیں ہی باتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ الفاظ صحیح طور پر بعض وقت نظم نہیں ہوتے خواہ آپ اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا یہ کہہ کر چپ ہو جائیے کہ عوام کی زبان پر یہ لفظ ایسے ہی رائج تھا جس کو آتش نے نظم کیا اس قسم کی مثالیں اور لوگوں کے یہاں بھی ملتی ہیں مثلاً میر مسجد کو مسیت کہتے ہیں اسی طرح آتش نے بھی چند الفاظ لکھ دئے ہیں مثلاً تمشک کو تمش اور المضاعف کو المضاف۔ حلوا کو حلوہ وغیرہ ان کے یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ناہمواری کلام ہے۔

ماحول سے مجبور ہو کر آتش نے بھی بنوٹ و رعایت لفظی پر زیادہ توجہ کی چنانچہ کلام کا کافی حصہ اس خصوصیت سے مجروح نظر آتا ہے۔ ایسے موقع پر کیف و تاثیر دونوں کی کمی نظر آتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کے لئے یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

لیکن یہاں کہیں آتش روایتی شاعری سے الگ ہو کر کیف و مردانگی و خودداری کے ساتھ جذبات قلمبند کرتے ہیں۔ وہاں ان کی امتیازی خصوصیت ان کو اردو کے بہترین شعرا کی صف میں جگہ دلاتی ہے۔

پنڈت دیاشنکر نسیم سنہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا۔ جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا اردو فارسی میں تعلیم پائی۔ شعرائے اردو فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرض کہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصا مذاق پیدا کر لیا۔

خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن و آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی، اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی مگر افسوس کہ موت نے بے وقت حملہ کیا۔ بتیس ۳۲ سال کی عمر میں ہیضہ کی بیماری نے دفعتہً سنہ ۱۸۴۳ء میں خاتمہ کر دیا۔

نسیم پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے سلسلہ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے۔ تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا۔ حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ ان ہی صفات خاص نے ان کا وقار ہمعصر شعرا میں قائم کیا۔

نسیم کی غزلیات میں آتش کے کلام کی طرح دنیا سے بے پروائی خودداری، زندگی کی بے ثباتی اور بے باکی ہر جگہ نمایاں ہے۔ زبان کا لطف عام طور سے آتش کے کلام کا مزہ دے جاتا ہے۔ نسیم اپنے زمانے کے مذاق کے اعتبار سے تناسب لفظی کے بہت دل دادہ نظر آتے ہیں مگر معنویت و

---

[1] ماخوذ از مضامین چکبست۔

پاکیزگی کا بھی کافی خیال ہے۔ ان کے کلام میں برجستگی و اختصار کی وجہ سے شعر میں خاطر خواہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ استعاروں کی ندرت اور تشبیہوں کی دلکشی سے کلام میں ایک نمایاں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

نسیم کے متعلق چکبست کا یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ "گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمیِ سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود تصنع کے جو اس رنگ کا خاص جوہر ہے۔ نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے"[1]

نسیم کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے جس میں علاوہ غزلوں کے چند مخمس و ترجیع بند بھی ہیں۔ مگر ان کی حیات جاودانی کا باعث یہ دیوان نہیں بلکہ وہ مثنوی ہے جس کا نام "گلزار نسیم" ہے۔

اس مثنوی کا خاص جوہر اختصار، پختگی کلام۔ تناسب لفظی بندش کی چستی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسب لفظی کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اردو شعرا کو قریب قریب ہمیشہ اس صنعت سے کم و بیش دلچسپی رہی ہے۔ لیکن آتش اور ناسخ کے زمانہ میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کو اس کا چسکا ہو گیا تھا۔ بعض لوگوں کا یہ ذوق جنوں کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ بغیر رعایت لفظی کے کوئی شعر اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

امانت کا نام کس نے نہ سنا ہوگا ان کو اس صنعت سے خاص شغف تھا لیکن لطافت و متانت ان کے شعروں میں تناسب لفظی کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے۔ نسیم کا احسان ہے کہ انہوں نے اس رعایت لفظی کو اپنی مثنوی

---

[1] مضامین چکبست ص ۱۴۷

ہیں لوگوں کے مذاق کا خیال کرتے ہوئے اس لطافت و متانت کے ساتھ جگہ دی کہ گویا دنیا کو راستہ بتا دیا ہے کہ اس میدان میں یوں قدم اٹھایا جائے۔ تو بجائے پاؤں لڑکھڑانے کے خرام ناز کا لطف پیدا ہو سکتا ہے۔ گلزار نسیم کا دامن آورد سے پُر ہے لیکن روانی و برجستگی کی وجہ سے آورد بھی آمد کا لطف دے جاتی ہے۔ عموماً یہی معلوم ہوتا ہے کہ تناسب لفظی کو موزونیت نے ضرورت کے لحاظ سے بے ساختہ صرف کر دیئے ہیں [1]

اس مثنوی میں اختصار و معنی آفرینی ہر لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے۔ ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھر دیئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی موقع ایسا ہوتا ہے کہ مفہوم صاف نہ ہو۔ نسیم کے یہاں رنگین بیانی کی وجہ سے سوز و گداز مثنوی میں بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن بقول چک بست "نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔

نصیر

نصیر الدین نام تھا اور نصیر تخلص، سیاہ فام آدمی تھے اس وجہ سے گھر والے میاں کلّو بھی کہتے تھے۔ ان کے والد کا نام شاہ غریب تھا وطن خاص دہلی تھا۔ خاندان میں فقیری اور پیری مریدی عرصہ سے چلی آ رہی تھی شاہ نصیر

---

[1] مضامین چک بست صہ ۱۲۹

چونکہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بڑی ناز و نعمت سے پرورش ہوئی تھی غریب باپ نے استاد و ادیب رکھ کر شاہ نصیر کی تعلیم پر پوری توجہ کی مگر یہ اتفاق تھا کہ علمی استعداد پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔

شاعری میں نصیر نے شاہ محمدی مائل سے اصلاح لی تھی شاہ عالم کے زمانہ میں شاہ نصیر کی شاعری کو فروغ ہوا اور دربار میں وہ بڑی قدر و منزلت سے رکھے گئے۔ ان کو بھی دربار سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ جب انگریزی عملداری ہوئی تو دربار کو چھوڑ کر حیدرآباد اور لکھنؤ کا سفر کرنے لگے مگر وطن کی محبت چین نہ لینے دیتی تھی۔ کئی بار دہلی آئے گئے۔ شاہ نصیر کی ذات اس لئے بھی قابل قدر ہے کہ جو قرض ولی کی وجہ سے دکن کا شمال پر ہو گیا تھا۔ اس کی ادائیگی میں انھوں نے بڑی دلچسپی لی۔ یعنی جب شاہ نصیر دکن پہنچے تو وہاں شعر و شاعری کا چرچا کم ہو چلا تھا لیکن ان کی آمد نے وہی کام کیا جو ولی کی موجودگی نے دہلی میں کیا تھا۔ بزم سخن پھر روشن ہو گئی اور سیکڑوں نے شاہ نصیر کی شاگردی کی۔

شاہ نصیر کئی بار لکھنؤ تشریف لائے اور مشاعروں میں استادوں سے معرکہ آرائیاں رہیں۔ یہاں آنے سے شاہ نصیر نے بھی ناسخ و آتش کا رنگ اختیار کیا۔ اور ان کے کلام میں بنوٹ رنگینی رعایت لفظی کا عنصر غالب ہو گیا۔ جس کے اثر سے دہلی کے اور شعر ابھی نہ بچ سکے تھے بقول میر انیس۔ ع

بچا نہ گرد سے دامن بہت بچا کے چلے

ان کے مزار کا فخر دہلی اور لکھنؤ کو نہیں بلکہ حیدرآباد کو حاصل ہے جہاں سنہ ۱۸۴۰ء میں اس دار فانی سے شاہ نصیر صاحب نے رحلت کی۔

ان کا کلام کمیاب ہے تھوڑا بہت کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ جس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ ظرافت کی چاشنی اور تشبیہات کی دلآویزی ان کے کلام
کی جان ہے۔ زور بھی کافی ہے اور کمال یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی یہ
زور قائم رہتا ہے۔ کبھی کبھی تشبیہ اور استعارے عامیانہ بھی ہو جاتے ہیں
شاہ نصیر کو بدیہہ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ بر سر مشاعرہ غزلیں کہتے تھے
اور برجستہ اصلاح دیتے تھے۔

ذوق

شیخ ابراہیم نام ذوق تخلص تھا۔ شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے ذوق
سنہ ۱۲۰۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے
حافظ غلام رسول کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ حافظ جی شاعر بھی تھے ہر وقت
ان کے یہاں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا۔ وہیں سے ذوق کو بھی شعر
گوئی کا شوق ہوا اور حافظ جی سے اصلاح لینے لگے بعد میں شاہ نصیر کو دکھانے لگے
رفتہ رفتہ مشق سخن نے ذوق کو استاد بنا دیا۔ یہاں تک کہ ولی عہد سلطنت
بھی ذوق سے اصلاح لینے لگے۔

ذوق نے اپنی قابلیت کا وہ سکہ جمایا کہ خاقانی ہند کا خطاب دربار سے
عطا ہوا۔ بعد میں خان بہادر بھی ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ہاتھی
مع ایک حوضۂ نقرئی کے مرحمت ہوا تھا۔

ان کا انتقال سنہ ۱۸۵۴ء میں ہوا۔ مرنے سے تین گھنٹہ پہلے یہ شعر

کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق ذاتاً نہایت نرم دل اور سنجیدہ مزاج تھے خوف خدا دل میں اس قدر تھا کہ عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔ موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ نجوم اور رمل میں بھی کافی دستگاہ تھی۔ طب میں بھی دخل تھا۔ نماز روزہ کے بہت پابند تھے گھنٹوں عبادت خدا میں مصروف رہا کرتے۔

ذوق کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ اختصار، برجستگی اور کسی قدر رنگینی بھی ہے۔ لیکن ذوق کی ایک اہم خوبی جو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ زبان اور محاورات کی کشش ہے۔ زبان کی صفائی اور لطافت میں مشکل سے کبھی فرق آنے پاتا ہے بلکہ ایسے مزے کے ساتھ الفاظ کو شعر کے سانچے میں جماتے ہیں کہ خود بخود ترنم پیدا ہو جاتا ہے محاورہ ہر ایک شاعر صرف کرتا ہے۔ خوبی پیدا ہونا یا نہ ہونا اس کے امکان میں نہیں کہاں اس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان گھر کی لونڈی ہو آورد کی بجائے آمد ہو اور پھر اس کے ساتھ طبیعت میں خداداد نفاست اور مذاق سلیم کا غلبہ ہو تب ہی نظر انتخاب باغ زبان سے وہ پھول چھانٹ کر لائے گی جو نہ صرف شگفتہ اور دیدہ زیب ہوں بلکہ جن کو دماغ کا باغبان سر آنکھوں پر جگہ دے گا دہلی کی زبان جس قدر صاف اور نرم ہے وہ محتاج بیان نہیں اور پھر ذوق کا ایسا مستند اور ثقہ جو محاورہ صرف کرتے ہیں۔ وہ شعر کی جان ہو جاتا ہے اور شعر میں دلاویزی پیدا کر دیتا ہے۔

اخلاق حسنہ جس کثرت کے ساتھ ذوق کے کلام میں ہیں وہ شاید ہی کسی

دوسرے غزل گو کے یہاں دستیاب ہو سکیں تصوّف کی چاشنی غزل میں ایک حد تک ضروری سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ اُن کے یہاں بھی تصوّف کا عنصر آپ کو کافی ملے گا۔ تصوّف کے اکثر مسائل پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ وحدت وجود وصال، فنا، بقا وغیرہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

جہاں کہیں ذوق کے کلام میں شوخی کی جھلک ہے دلکشی کا سرمایہ ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بے وفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اشعار میں ضرب المثل نظم کرنے میں کوئی ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ اس خوبی سے ضرب المثل کا صرف کرتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبردستی لائے ہیں بلکہ شعر میں خود بخود آ گئے ہیں۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی معلومات کا دائرہ وسیع ہے بلکہ علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف اردو، ہندی بلکہ عربی و فارسی کی بھی مثلیں پائی جاتی ہیں۔ تشبیہات اور استعارات پر نظر ڈالیے تو اکثر ان میں نئے اور عمدہ ملیں گے جس کی وجہ سے تاثیر کلام اور تیز ہو جاتی ہے۔

ذوق جب کبھی شعر میں گفتگو کا پہلو پیدا کرتے ہیں تو ایک ادا ایسی ہوتی ہے جو ان کے کلام کی محبوبیت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے کی طرح ان کے یہاں نئے فقرے اور ترکیبوں کا بھی انبار ہے۔ مثلاً تودۂ حسرت، کفِ ہر شاخ، نظارۂ رنگِ بہار، اے میرے چمن وغیرہ

ذوق کے شعر عام طور سے صاف اور سادے ہیں۔ غالب کی طرح

مشکلات کے سرمایہ دار نہیں لیکن جذبات اور مضمون آفرینی عام طور پر مدنظر ہے۔ ذوق کا مذاق خاص یہ ہے کہ کسی قدر ہنوٹ اور اس کے ساتھ رعایت لفظی لیکن ہنوٹ میں بعید از قیاس باتیں نہیں لاتے مجموعی حیثیت سے ان کی غزلیں پُر اثر نہیں۔ سپردگی و ربودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تخیل میں بلندی کلام میں کیف بہت کم ہے۔ مولویانہ ذہنیت کا غلبہ ان کے دیوان میں ہر جگہ ہے۔ اکثر اشعار قافیہ پیمائی کے ذوق میں کہے گئے ہیں اور رعایت لفظی سے آراستہ کئے گئے ہیں۔ مبالغہ کو شاید بلند پردازی کا مرادف سمجھ کر زیادہ زور و جوش کے ساتھ کلام میں صرف کیا گیا ہے۔

قصیدہ گوئی میں ذوق کا پایہ بہت بلند ہے۔ سودا کے بعد اس صنف شاعری کے معیار قائم رکھنے میں انھوں نے بڑی قابلیت سے کام لیا مضامین میں تنوع، بیان میں زور و علمیت خاص طور سے نمایاں ہے۔ الفاظ کا نادر و دلکش ذخیرہ خوبی سے ایک جا کرتے ہیں۔ ترنم کا بہت خیال رکھتے ہیں اور تشبیب میں عموماً ندرت و پرکاری سے کام لیتے ہیں۔ مختلف عنوانات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ مختلف مسائل پر بحث بھی کرتے جاتے ہیں۔ روانی پر سب سے زیادہ توجہ ہے۔ باوجود سنگلاخ زمین و الفاظ کے ذہن کو رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مگر بلندی تخیل کی کمی اور جامعیت و ندرت کا فقدان ذوق کو سودا کے برابر نہیں پہونچنے دیتے۔

غالب

اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ لقب تھا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ شاہی خطاب تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے بعد میں غالب ہو گئے۔ ان کا خاندان، ایران کا تھا۔ اور سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے جس پر مرزا کو بڑا ناز تھا۔ مرزا کے دادا شاہ عالم کے وقت میں دہلی آئے تھے۔ یہاں سلطنت نے اپنے حسب حال ان کی کافی عزت کی اور پہاسنو کا علاقہ بطور جاگیر کے دیا مگر شاہ عالم کے بعد ملک میں کچھ ایسی بدنظمی ہوئی کہ وہ علاقہ بھی جاتا رہا۔

غالب کے باپ عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ سے حیدر آباد گئے بالآخر الور آکر راجہ بختیاور سنگھ کی ملازمت کی اور یہاں کسی لڑائی میں ۱۸۰۱ء میں مارے گئے اس وقت مرزا کی عمر صرف پانچ برس کی تھی باپ کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے مرزا کے سر پر ہاتھ رکھا یہ اکبر آباد کے صوبہ دار تھے ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک کا عمل ہوا تو مرزا نصر اللہ کو سواروں کے بھرتی کا حکم ہوا اور سترہ سو روپیہ ذات کا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر حین حیاتی دی گئی مگر یہاں بھی غالب کو سکون نہ نصیب ہوا ابھی صرف نو برس کی عمر تھی کہ ایسے شفیق اور مقتدر چچا کا بھی انتقال ہو گیا جو ورثا تھے ان کی پنشن ہوئی۔ غالب کو بھی سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا بہادر شاہ نے بھی غالب کو پچاس روپیہ ماہوار اور خلعت مقرر کر دئے تھے۔ لیکن غدر کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہو گئی اور نہایت تکلیف سے بسر

ہونے لگی۔ مجبوراً رام پور چلے آئے اور یہاں ایک سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا مگر وطن کی محبت نے وہاں بھی چین نہ دیا دہلی واپس آئے تین سال کے بعد پنشن جاری ہو گئی اور آخر عمر تک دہلی ہی میں گزاری ۷۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا۔

غالب کو فارسی سے ازلی مناسبت تھی تمام عمر غیر معمولی دلچسپی اس زبان سے لیتے رہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ غالب کی طبیعت میں ظرافت اور ساتھ ہی ساتھ متانت فطرت نے ایک جگہ جمع کر دی تھی۔ اخلاق و شگفتگی مزاج کی وجہ سے مرزا کثیر الاحباب ہو گئے تھے۔ چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں ایک بے نظیر خطوں کا مجموعہ ہو گیا۔ جس سے اردو کے طرز بیان پر کافی اثر پڑا۔

غالب کا کلام تین دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جس میں برائے نام اردو کے الفاظ ہیں۔ لیکن کچھ تو لوگوں کی نکتہ چینیوں اور کچھ مولوی فضل حق کی دوستی نے مرزا غالب کو رنگ بدلنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ یہ عام شکایت تھی کہ ان کا طرز بیان نامانوس اور شعر بعید الفہم ہوتے ہیں۔ دوسرا دور وہ ہے جس میں زبان کسی قدر صاف ہو گئی ہے اور ترکیبیں بھی سہل ہو گئی ہیں۔ تیسرا دور وہ ہے جب فارسی ترکیبیں اور پیچدار باتیں قریب قریب بالکل جاتی رہی تو اس دور میں ان کی شاعری میں مزا زیادہ ہو گیا ہے۔ سلاست اور روانی خاص طور سے نمایاں ہے۔

جدت اور ندرت سے کلام کسی دور کا خالی نہیں۔ غالب نے پامال راستہ کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا اور چاہا کہ اہل ہند کو پوری طرح فارسی کی سیر کرا دیں مگر ہندوستانی پھر بھی ہندوستانی رسوم کی پابندیوں نے اس کی اجازت نہ دی

غالب آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ پلٹ کر دیکھا تو سمجھے کہ زمانہ کو میری
روش پسند نہیں لوگوں کی دل شکنی کا خیال ہوا۔ ناچار خود اس راستہ کو چھوڑ دیا۔
مگر پامال راستہ سے ملی ہوئی ایک پگ ڈنڈی نکالی جس پر عمر بھر گامزن رہے اور
رفتہ رفتہ زمانے کو اس پر چلا کر چھوڑا۔

خیال میں بلندی اور مضامین کی ندرت کو مرزا نے اپنا حصہ بنا لیا تھا۔
جس کا ایک زمانہ گرویدہ نظر آتا ہے ان کے یہاں جدید اور پاکیزہ تشبیہیں کام میں
لائی گئی ہیں۔ علو تخیل اور معنی آفرینی ان کے طائر کلام کے پر پرواز ہیں۔ جو مضمون
کو کنگرۂ عرش تک پہنچا دیتے ہیں۔

بڑے بڑے مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کر دیتے
ہیں۔ ان کے کلام کی معنویت اور بلندی عام سطح سے بہت بلند ہے۔ غالب کی سی ہموار
غزلیں مشکل ہی سے کسی اور دیوان میں نظر آ سکتی ہیں۔ ان کا کلام کئی لحاظ سے
دماغ پرور ہے منجملہ ایک عنوان یہ بھی نہایت پرلطف ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان کے
اشعار میں دو ایک باتیں ایسی محذوف ہوتی ہیں جن کو پڑھنے والا اپنی طرف سے
نہیں پورا کرتا بلکہ اشعار ہی میں بعض الفاظ ایسے لطیف اشارے کرتے ہیں کہ
کہ پڑھنے والے کا ذہن خود بخود اسی ماحول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو غالب کے
پیش نظر تھا۔

یہ ذہنی کاوش ایک کیف پیدا کرتی ہے۔ غور کرنے سے سب کچھ ذہن میں
آ جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی شعر میں موجود تھیں۔ درد و غم کی داستان
نہایت مؤثر اور مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ غالباً یہ طرز ادا میر کے یہاں سے
حاصل کی ہے۔ غالب کی تیز نگاہ زندگی کے حقیقی اور عملی پہلو پر پڑتی ہے۔ وہ
تصوف کے اکثر رموز و مسائل نہایت لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں

کہیں ان کے کلام میں شوخی ہے وہ نہایت دلکش ہے۔ ابتذال کی جھلک کہیں نہیں آنے پاتی "تنگنائے غزل" میں جتنا تنوع غالب کے یہاں ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حیات وموت، جبر و اختیار، سوز و ساز، گناہ و ثواب سب فلسفیانہ عمق کے ساتھ ان کے کلام میں جگہ پاتے ہیں۔ حسن و عشق کے چھوٹے چھوٹے مسائل زندگی کا راز بن جاتے ہیں۔

غالب تجربات و واردات قلب کو ہو بہو بیان کر دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنی فلسفیانہ کاوشوں اور لہجہ کی بلندی سے اردو ادب کو دفعتاً بلند کر دیا زبان کی سطح ہمیشہ سے زیادہ بلند ہو گئی۔

مومن

ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ مومن خاں کے دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دہلی آئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے اسی سلسلہ میں کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی۔

مومن خاں کی ولادت سنہ ۱۸۰۰ء میں ہوئی ان کے والد کو شاہ عبدالعزیز سے عقیدت تھی۔ چنانچہ یہ نام شاہ صاحب موصوف ہی نے رکھا تھا ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندان میں طب کی کتابیں پڑھیں۔ ذکاوت اور حافظہ قسام ازل نے مومن خاں کو خاص طور سے عطا کیا تھا۔ نجوم میں وہ مہارت حاصل کی کہ بڑے بڑے منجم

منہ دیکھا کرتے تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخ گوئی میں کمال تھا۔ بات بات میں تاریخ کہتے تھے۔

مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدّت بیان کے لحاظ سے اردو میں کم شعرا اس پایہ کے گزرے ہیں، فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے سادی بات کو بھی شاندار بنا سکتے تھے۔ کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی تھی۔

مومن کا دل عشق کی لذت سے خوب واقف تھا اس وجہ سے درد اور مزا کلام کو دلکش اور پر لطف بنا دیتا ہے۔ اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز تشبیہ اور استعارے کی ندرت ان کی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں اور فرسودہ خیال کو بھی اسلوب بیان کے زور سے نیا کر لیتے ہیں جس سے پر لطف معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ واردات قلب اور محبت کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر شعر کہتے تھے۔ ان کی غزلیں فلسفیانہ مباحث سے بھی خالی نہیں حیات و موت کی کشاکش مختلف طریقوں پر بیان ہوتی ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں ان کے الفاظ ان کے تخیل کا مفہوم پورا نہیں کرتے اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن خود ان کے خیال تک نہیں پہنچتا۔

مومن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل ہوئی ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں جن میں جذبات کی آمد اور زبان کی سلاست اور روانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قصائد کے اعتبار

سے وہ قصیدہ لکھنے والوں کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں۔ مگر طبیعت کی خودداری کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ لکھنے سے مانع رہی بزرگان دین کی شان میں متعدد قصیدے کہے۔ صرف دو قصیدے دیوان میں ایسے ہیں جو راجہ اجیت سنگھ اور فرمانروائے لونک کی تعریف میں ہیں لیکن وہ بھی صلہ کی امید پر نہیں۔ ان کے واسوخت بھی عشق مجازی کے ایک رخ کو واضح کرتے ہیں۔

۵۳ برس کی عمر میں کوٹھے سے گرے، پانچ مہینہ بیمار رہ کر ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔

دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں ایسی دو ذہنیتوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی راہیں بالکل الگ سی معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) غالب، مومن اور آتش خیالات اور معنویت کی طرف زیادہ مائل تھے ذوق، نصیر اور ناسخ کا رجحان زیادہ تر زبان اور عروض کی طرف تھا۔

(۲) غالب نے فلسفیانہ، حکیمانہ، خیالات کا اردو شاعری میں سنگ بنیاد رکھا جس کا نتیجہ اس وقت تو نہیں مگر بعد کو ظاہر ہوا لیکن خیالات میں تنوع اور انداز بیان میں جدت اسی وقت لوگوں کے سامنے آگئی۔

(۳) زبان کی صفائی، تشبیہات و استعارات کی رنگینی ہر دور سے زیادہ بڑھ گئی۔

(۴) رعایت لفظی اور خارجی پہلو پر بعض شعرا نے اتنا زور دیا کہ پورے دور کو متاثر ہونا پڑا بلکہ اس کے بعد آنے والے دور کو بھی انہی کی تقلید

کرنی پڑی۔

(۵) شاعری کا دائرہ زیادہ تر غزل تک محدود رہا، قصیدہ و مثنوی پر کم توجہ کی گئی جن لوگوں نے اس طرف توجہ بھی کی وہ اپنے پیشروؤں سے آگے نہ بڑھ سکے

(۶) فارسی و عربی کے الفاظ و تراکیب اردو شاعری میں تیزی کے ساتھ جگہ پانے لگے۔ ان پر پہلے سے زیادہ توجہ کی جانے لگی۔

(۷) چونکہ سلطنت کا نقشہ بدل رہا تھا، دہلی اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ یعنی آباد ہو رہا تھا اس وجہ سے اس دور کے کلام میں رجائیت و قنوطیت شاعری کے میدان میں دوش بدوش نظر آتی ہیں، دہلی کے شعرا کے یہاں ایک گونہ یاس و اضمحلال، لکھنؤ کے شعر میں شاعرانہ بے بسی کو چھوڑ کر احساس میں شگفتگی نظر آتی ہے۔

باب ۸

امیر

امیر احمد نام اور امیر تخلص تھا۔ مولوی کرم محمد لکھنوی کے صاحبزادے تھے
۱۷ شعبان ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا
لکھنؤ فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا۔ علما اور مجتہدین علم کے دریا بہا رہے تھے۔
ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی۔ امیر طب
نجوم۔ جفر وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف
مائل تھی اور پھر اس وقت لکھنؤ کی فضا ایسی تھی کہ ہر طرف شاعری برس رہی تھی
امیر نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد اسیر کے شاگرد
ہو گئے۔ اسیر نے امیر کے سنبھالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چنانچہ جب
واجد علی شاہ کا دور آیا اور امیر کو دربار میں رسائی نصیب ہوئی تو اپنے ساتھ

امیر کو بھی وہاں لے گئے۔

امیر کو بھی رفتہ رفتہ فروغ ہوا۔ دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" لکھ کر بادشاہ کے دربار میں پیش کیں اور صلے میں خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔

امیر کے کلام میں واجد علی شاہی دربار اور لکھنؤ کے اس وقت کے رنگ کی جھلک اکثر نظر آتی ہے یعنی معشوقوں کی محفل۔ ادائیں گفتگو۔ چھیڑ چھاڑ قیصر باغ کی صحبتیں سب کا نقشہ نظر آتا ہے۔

صحبتیں منتشر ہو چکی مگر امیر ان چیزوں کو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

لکھنؤ کی رونق واجد علی شاہ کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی۔ رہی سہی بہار بھی غدر کے ہنگامہ میں ختم ہو گئی بلکہ وہ مصیبت آئی کہ شہر کے اہل کمال بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ ناچار امیر کو بھی کبھی کاکوری کبھی ہمیرپور کبھی مین پوری جانا پڑا۔ بالآخر رامپور میں آکر چین نصیب ہوا اور یہیں شیخ وحید الزماں لکھنوی کی لڑکی سے عقد ہوا۔ نواب رامپور امیر سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ امیر کی قدر و منزلت رامپور کے دربار میں ایسی ہوئی کہ ۴۳ سال تک یہیں رہے۔ داغ کے بلانے سے حیدرآباد کا سفر کیا لیکن جاتے ہی بیمار پڑے اور ایک مہینہ نو دن بیمار رہ کر سنہ ۱۹۰۰ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

امیر اپنی قابلیت کے لحاظ سے فخر روزگار تھے ان کے کارناموں کی فہرست کافی لمبی چوڑی ہے۔ دو کتابوں کے نام پہلے آچکے ہیں لیکن اور بہت سی تصنیفات

ان کے علاوہ ہیں منجملہ دو مثنویاں، نورِ تجلّی، اور ابرِ کرم، اور مسدّس میں صبحِ ازل شامِ ابد، لیلۃ القدر، ذکرِ شاہِ انبیا مشہور ہیں۔ واسوخت بھی ہیں جو اپنے ماحول کی تصویریں ہیں۔ دیوان مراۃ الغیب ۱۲۹۰ھ میں اور صنم خانۂ عشق ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئے کچھ اور کلام بھی ہے جو ان کے سامنے شائع نہیں ہو سکا۔ ایک کتاب سرمۂ بصیرت ہے جس میں عربی اور فارسی کے وہ الفاظ دیے ہیں جو اردو میں عام طور پر غلط استعمال ہوتے تھے۔ ان الفاظ کو صحیح طور سے استعمال کر کے اس کتاب میں دکھایا گیا ہے۔

امیر کی تصنیفات میں امیر اللغات ایک عدیم المثال لغت ہے۔ امیر کا ابتدائی کلام ایک بڑی حد تک ناسخ کے رنگ میں ہے۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ نہ تو تمثیلی شاعری خشک ہونے پاتی ہے اور نہ تصنع کی شاعری بے کیف ہوتی ہے۔ تکلّف میں امیر نے ایسی لطافت و رنگینی بھر دی ہے کہ نزاکت اور لوچ کے علاوہ ایک خاص مزا پیدا ہو گیا ہے۔ جو ان کے کلام کو دوسروں کی ایسی شاعری سے بہت زیادہ دلکش اور پُر لطف بنا دیتا ہے۔ برخلاف اس کے جب وہ داغ کی سادگی اور بے تکلفی اختیار کرتے ہیں تو کبھی کبھی سوقیت اور ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔

امیر کے کلام میں فصاحت اور ترنم خاص طور پر نمایاں ہیں شوخی کلام کے لطف کو دوبالا کرتی ہے اور عام طور پر متانت قائم رہتی ہے۔ صحتِ زبان اور روزمرّہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتے یہ ضرور ہے کہ شوخی کبھی کبھی متانت کے جامہ سے باہر نکل آتی ہے لیکن جب اس زمانہ کے مذاق پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ عیب کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں معلوم ہوتا۔

امیر کا کلام عام طور سے صاف اور سلیس ہے۔ بول چال اور محاورات

کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ تصوف کی جھلک اُن کے کلام میں وسیع النظری کا ثبوت ہے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا کلام ایک بڑی حد تک مستیوں کی کہانی کا ذخیرہ ہے جو ممکن ہے کہ موجودہ روشنی والوں کو ناپسند ہو لیکن اس زمانہ میں دل کی شگفتگی و جذبات کی بقا کے لئے اسے ضروری سمجھا جاتا تھا۔

داغ

نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ابھی چھ سات سال کے رہے ہوں گے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ماں نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو سے شادی کر لی۔ اس سلسلے سے داغ کو بھی لال قلعہ میں رہنا نصیب ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی لال قلعے کے تعلق سے ذوق سا استاد ملا انہی سے اصلاح لیتے تھے اور انہی کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے۔

۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال کے بعد ان کو معہ اپنی ماں کے قلعہ چھوڑنا پڑا۔ اس سے بڑھ کر یہ مصیبت ہوئی کہ اگلے سال غدر کا ہنگامہ رونما ہوا اور داغ مصائب میں مبتلا ہو گئے اس کے بعد رام پور آئے نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا وہ نہایت علم دوست تھے لکھنؤ اور دہلی کے بعد شعرا کا ٹھکانہ رام پور ہی رہ گیا تھا۔ یہاں داغ کی بڑی قدر ہوئی کلب علی خاں ولیعہد کے مصاحب خاص مقرر ہو گئے ان کی زندگی میں

داغؔ کہیں نہ گئے ان کے انتقال کے بعد حیدرآباد آئے یہاں بھی قدر و
منزلت نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً
انعامات سے بھی سرفراز ہوتے رہے۔ حیدرآباد ہی میں فالج گرا زبان
بند ہوگئی اور کچھ دنوں بیمار رہ کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا اور وہیں دفن
ہوئے۔

تین دیوان گلزارِ داغ، آفتابِ داغ اور مہتابِ داغ یادگار ہیں ایک
مثنوی فریادِ داغ اور چند قصائد اور رباعیات بھی موجود ہیں۔ داغؔ کے کلام
پر نظر ڈالنے سے چند باتیں صاف نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز زبان کی صفائی اور
روانی ہے ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انہوں نے بڑی حد تک گریز
کیا ہے پیچ در پیچ استعارے اور بعید از فہم خیالات ان کے یہاں نہیں پائے
جاتے۔ چلبلاپن اور شوخی ان کے کلام کی جان ہے لیکن یہی شوخی کبھی ابتذال
تک پہنچ جاتی ہے اور رنگین بیانی عامیانہ پن کی جھلک لئے ہوئے محفلِ ادب
میں نمودار ہوتی ہے۔ معاملہ بندی، شباب اور سرمستی کی تصویریں
کہیں کہیں اپنی بے ساختگی اور شوخ لطافت سے مزہ پیدا کر دیتی ہیں اور
کبھی مذاقِ سلیم پر بار ہو جاتی ہیں۔

داغؔ کے کلام میں عشق کم ہے محبت کی ترجمانی بیشک اس انداز سے ہے
کہ ہر شعر پر کیف ہے لیکن درد و گداز زیادہ نہیں تشبیہ و استعارات میں
ندرت کی کمی ان کے اختراع پر داغ ہے۔ ان کی غزلوں میں رطب و یابس
بہت پایا جاتا ہے کچھ اشعار انہوں نے اپنے رنگ سے الگ ہو کر صرف
مروجہ شاعری کی تقلید میں لکھے جو عموماً خشک اور بے کیف ہیں لیکن ان کی
شوخی ایسے اشعار کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ لفظ "تیور" اور

تیکھا پن کا صحیح اطلاق اگر شعر پر ہو سکتا ہے تو وہ داغؔ کے اشعار ہیں۔ جہاں حسن اور محبت دونوں شوخ اور بے حجاب ہیں۔

جلالؔ

سید ضامن علی نام تھا۔ ۱۲۵۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حکیم اصغر علی کے بیٹے تھے۔ فارسی و عربی کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کی آبائی پیشہ کا بھی خیال رکھا طبابت کی بھی قابلیت بہم پہنچائی مگر شعر و شاعری میں زیادہ انہماک رہا۔ ان دنوں لکھنؤ میں ناسخؔ کے مشہور شاگرد رشکؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ جلالؔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح لینے لگے مگر کچھ عرصہ بعد رشکؔ زیارت کی غرض سے عراق چلے گئے تو جلالؔ برقؔ کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

لکھنؤ کا ماحول اس زمانہ میں شعر و شاعری کے لئے بہت موزوں تھا مشاعروں میں بڑے بڑے سخن فہم و صاحب کمال جمع ہوتے خود بھی غزلیں پڑھتے دوسروں کی بھی ہمت افزائی کرتے۔ قلقؔ، بحرؔ، اسیرؔ، امیرؔ، تنویرؔ وغیرہ سب کے سب شریک بزم سخن ہوتے جلالؔ بھی اسی دبستان میں طبع آزمائی کی غرض سے حاضر ہوتے۔ گویا ابتدا ہی سے بڑے بڑے صاحبانِ فن کی صحبت نصیب ہو گئی تھی طبیعت پر زور دینے کا کافی موقع ملتا رہا۔

لکھنؤ کی یہ بزم نشاط زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ یہ کہتا ہوا سر پر آ پہنچا۔ ع

اُٹھئے کہ اب وہ لذتِ خواب سحر گئی

محفل درہم برہم ہوگئی جس کو جدھر راہ ملی بھاگ نکلا۔ جلالؔ نے حکمت کے دامن میں پناہ لی لکھنؤ میں بخشی تندرائے وقار کے مکان میں مطب قائم کیا اور گذر اوقات کا انتظام کرنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے ان کو اپنے یہاں بلالیا جلالؔ ان کے بعد بھی کوئی بیس سال تک عزت و احترام کے ساتھ رام پور میں رہے۔ نواب کلب علی خاں نے اپنے دربار کو دہلی و لکھنؤ کا خاکہ بنانا چاہا اور امیرؔ، داغؔ، تسلیمؔ وغیرہ کو اکٹھا کرلیا جلالؔ کو یہاں بھی معرکہ آرائیوں سے فرصت نہ ملی کلب علی خاں کے مرنے کے بعد یہ صحبت بھی منتشر ہوئی کوئی حیدر آباد گیا کوئی کہیں گیا۔ جلالؔ کو حسین میاں ریاست منگرول کے نواب صاحب نے اپنے یہاں بلالیا مگر یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہ رہ سکا۔ واپس چلے آئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ۷۷ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

جلالؔ نے زبان و شاعری میں ناسخؔ کی پوری تقلید کرنے کی کوشش کی قواعد پر خاص توجہ کی لفظی بحث تذکیر و تانیث کا جھگڑا محاورات و عروض کا مسئلہ ہر وقت پیش رہتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ کچھ اچھا ہی ہوا۔ کئی ایک لغت، قواعد، عروض کی کتابیں جلالؔ نے مرتب کردیں جو ادب کے لئے مفید ثابت ہوئیں گو یا زبان کو ہر علمی نقطۂ نظر سے منظم کرنے میں جلالؔ نے بڑی کاوش سے کام لیا اس لحاظ سے جلالؔ نے اردو ادب میں اپنی ایک نمایاں جگہ پیدا کرلی اپنے عہد میں اردو کے باکمال اُستاد اور خاص سرپرست سمجھے جانے لگے۔ علمی قابلیت کی وجہ سے ان کا سکہ تمام دنیائے اردو میں اس وقت رائج ہوگیا۔

شاعری میں انہوں نے ابتداءً پرانی لکیر پر قدم رکھا۔ خارجی عناصر رنگینیٔ بیان پر زیادہ زور دیا۔ علو، تخیل و پر جوش انداز بہت کم ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا کلام غلطیوں سے پاک ہے۔ اشعار، زبان و محاورات و عروض کے لحاظ سے بہت صحیح و مستند ہیں۔

ایک حصہ جلالؔ کے کلام کا ایسا ہے جس میں انہوں نے میرؔ کی تقلید کی ہے۔ جس میں تاثیر، سادگی و معنویت نہایت خوبی سے نمایاں ہیں۔ ان کی اکثر غزلیں اپنے بزرگوں کی روش کے برخلاف مختصر و صاف ہیں رعایت لفظی بنوٹ وغیرہ ضرور ہیں لیکن لطافت و کیف سے خالی نہیں اس لئے تصنع کا اثر زیادہ برا نہیں پڑتا اور جہاں کہیں معنویت و سادگی کی طرف جلالؔ نے توجہ کی ہے وہ اشعار اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

جلالؔ نے قصائد پر بھی کافی توجہ کی۔ شکوہ الفاظ مضمون آفرینی کبھی کبھی تشبیب میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے عالم و ہمہ داں ہونے کا صاف پتہ چلتا ہے لیکن اس صنف شاعری میں کوئی خاص شہرت نہ حاصل کر سکے۔ صرف اپنے زمانہ کے معیار قصیدہ گوئی کو حسن و خوبی کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ جلالؔ کی علمی قابلیت کا اندازہ کرنے کیلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی ایک فہرست بھی بتا دی جائے۔

۱۔ دیوان اوّل۔ شاہد شوخ طبع
۲۔ دیوان دوم۔ کرشمہ جات سخن
۳۔ دیوان سوم۔ مضمون ہائے دلکش

۴۔ دیوان چہارم ۔ نظم رنگین

ان کے علاوہ لغت و قواعد وغیرہ پر حسب ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

۵۔ سرمایہ زبان اردو ۔ محاورات کا لغت ہے
۶۔ افادہ تاریخ ۔ تاریخ گوئی کے متعلق ہے۔
۷۔ منتخب القواعد
۸۔ تنقیح اللغات
۹۔ گلشن فیض (لغت ہے)
۱۰۔ مفید الفصحار

دور کی خصوصیات

(۱) شاعری میں رنگینی، معاملہ بندی، شوخی زیادہ ہوتی گئی۔

(۲) لکھنؤ اور دہلی اسکول ایک دوسرے سے اب بھی متاثر ہو رہے تھے شعرائے لکھنؤ دہلی کی طرف زیادہ مائل تھے۔

(۳) اب سے پہلے دور کی تصنع، دور دراز کی تشبیہات، پیچیدہ استعارات کم ہو چلے۔ لطافت و کیف کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی سادگی بھی کلام میں جگہ پانے لگے۔

(۴) ابتذال و مبالغہ و قافیہ پیمائی کا اس دور میں بھی چسکا رہا۔

(۵) زبان، قواعد صحت کا زیادہ خیال رہا۔ مختلف لغات و کارآمد رسالے لکھے گئے۔ گویا شعرا نے بھی نثر کی طرف توجہ کی اور اپنی تحریروں سے

زبان کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے کی فکر کی ۔

(۶) مرثیہ کی وجہ سے حسن و عشق کے علاوہ دوسری راہیں بھی شاعری کو مل گئیں ۔ رزم و بزم کی داستان واقعات کی منظر نگاری ماں باپ کی محبت بھائی بھائی کی محبت ۔ بھائی بہن کی محبت ، امیر غریب کا کردار ، غرضکہ مختلف و متعدد موضوعات اردو شاعری کے ساتھ آگئے ۔

یہاں مرثیہ سے مراد وہ نظمیں ہیں جو واقعاتِ کربلا کے متعلق وقتاً فوقتاً کہی گئیں امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہی سے ایسی نظمیں عربی میں آنے لگیں بعد میں فارسی نے بھی اثر لیا اور اچھا خاصا ایک ذخیرہ تیار ہو گیا۔ اردو میں ابتدائی عہد سے یہ چیز آ گئی تھی۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی لیکن یہ فیصلہ زیادہ اطمینان بخش نہیں۔ بہرحال قطب شاہی دور میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

شروع میں مرثیہ بہت مختصر ہوتا تھا۔ کوئی خاص شکل بھی معین نہ تھی۔ کبھی مربع کی شکل میں۔ یا کبھی غزل کی شکل میں۔ مضمون کے لحاظ سے زیادہ تر مصائب و واقعات پر مبنی ہوتا۔ عموماً مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا اور ثواب کے لئے پڑھا جاتا۔ شمالی ہند میں میر و سودا کے مرثیے مشہور ہوئے اور

اسی عہد میں اس کی شکل مسدس کی ہو گئی جو رفتہ رفتہ اتنی مقبول ہوئی کہ مستقل طور پر مسدس مرثیوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔

ابھی تک فنی اعتبار سے مرثیہ کو نمایاں حیثیت نصیب نہیں ہوئی تھی میر ضمیر نے اس طرف خاص توجہ کی۔ اس کے اجزائے ترکیبی معین کئے۔ یعنی مرثیہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱) چہرہ (۲) سراپا

(۳) رخصت (۴) آمد

(۵) رجز (۶) جنگ

(۷) شہادت (۸) بین

ان کے بعد والوں نے بھی اسی راستہ پر قدم رکھا اور ان خصوصیات کو برابر نباہتے رہے۔ اس وقت سے مرثیہ میں وہ چیزیں لائی گئیں جو اس سے پہلے اردو ادب میں مفقود تھیں۔ اب تک اُردو شاعری حسن و عشق کی داستان تک محدود تھی اب مرثیہ نے محبت کی دنیا کو وسیع کر دیا۔ نہ صرف عاشق و معشوق کے جذبات دکھائے بلکہ مختلف طرح کی محبت اور مختلف اشخاص کی محبت کا نقشہ پیش کیا باپ بیٹے کی محبت۔ میاں بیوی کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، بہن بھائی کی الفت، چچا بھتیجے کی الفت، آقا و غلام کا اُنس۔ دشمنوں پر شفقت، جانوروں کے جذبات غرضکہ متعدد و مختلف افراد کی محبت کا خاکہ پیش کر دیا۔

منظر نگاری کے اعتبار سے بھی مرثیہ نے وہ خدمات انجام دیں کہ اب تک اردو شاعری کی کسی ایک صنف میں ایسی مثالیں نہ تھیں صبح کا منظر شام کا منظر، دوپہر کا منظر، دوپہر کی گرمی، دریا کی روانی، گھوڑوں کا دوڑنا، الف ہونا، فوجوں کا آپس میں ٹکرانا، تلواروں کا چلنا، پہلوانوں کا آپس میں تیغ آزمائی

کرنا۔ غرضکہ اس قسم کے صدہا منظر پیش کر کے اردو کی وسعت کو مرثیہ نے بڑھا دیا۔ مرثیہ کی یہ ہیئت وادبی سرمایہ داری نہ عربی میں تھی نہ فارسی میں مجموعی لحاظ سے ہر ایک پر فروغ تھا۔ اس سے پہلے اردو میں جتنی علمی وادبی چیزیں آئی تھیں وہ سب کی سب تقلیدی تھیں۔

مرثیہ نے آکر اردو کو سر اٹھانے کا موقع دیا اور ادبی دنیا کو دکھا دیا کہ ایک غمناک موضوع اور تاریخی واقعہ بھی ادب کی جان بن سکتا ہے مرثیہ نے فنی اعتبار اور ادبی لحاظ سے وہ اہمیت حاصل کی کہ اردو میں بالکل اپنی چیز سمجھا جانے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اس حسن و کمال کے ساتھ یہ صنف نہ عربی میں تھی نہ فارسی میں۔

میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ طرز بیان، مشاہدات، زبان، شدّتِ احساس۔ سب اس خوبی سے ایک جا ہوئے کہ اس سے آگے بڑھنا آیندہ نسل کے لئے ناممکن ہوگیا۔ ان لوگوں کے بعد بھی لوگ مرثیہ کہتے رہے مگر نفسیاتی تحلیل و فنی خصوصیات پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

دبیر

مرزا سلامت علی نام اور دبیرؔ تخلص۔ مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مگر باپ کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تحصیل علم میں مصروف ہوگئے یہاں تک کہ علمی استعداد فاضلانہ حد تک پہنچ گئی۔

شعر و سخن کا چسکا روز ازل سے لے کر آئے تھے۔ مشاعروں میں اکثر شرکت کیا کرتے تھے۔ ذوق سخن میں جب تیزی ہوئی تو خود بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہو گئے یہاں تک نام پیدا کیا کہ اُستاد سے زیادہ شہرت ہو گئی۔ مرثیہ کو اپنا خاص فن بنا لیا گو ان کے استاد میر ضمیرؔ نے فرسودہ مرثیہ گوئی میں چند عنوانات قائم کر کے چار چاند لگا دئے تھے۔ یعنی چہرہ۔ آمد، رجز لڑائی وغیرہ کو خاص طور پر الگ کر کے ایک مخصوص حصہ قرار دے دیا تھا۔ لیکن صرف راستہ تیار ہوا تھا آرائش اور پختگی کا کام ہونہار شاگرد کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

مرزا دبیرؔ نے یہی نہیں کیا کہ اپنے استاد کی بنائی ہوئی عمارت کو قائم رکھا بلکہ بقول آزادؔ مرحوم جو کچھ اُستاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا جب شہرت کا ستارہ بلند ہوا تو دربار اودھ نے بھی سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا۔ مرزا دبیرؔ نہایت پُرگو تھے کم از کم تین ہزار مرثیے کہے ہوں گے۔ رباعی، سلام نوحے ان کے علاوہ ہیں۔ مرزا صاحب کی خصوصیات میں شوکت الفاظ۔ جدید تشبیہات، استعارے اور زور کلام داخل ہیں۔ ان کا کلام علمی زبان اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ عیوب سے مبرا ہے اور فن عروض کے پرستاروں کا بہترین دلچسپ چمنستان ہے کیونکہ صنائع بدائع سے مرصع ہے۔ مرزا صاحب نے محرم ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور اپنے گھر ہی میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیرؔ نے واقعات کربلا کی تفصیلات پر اتنا زور دیا ہے کہ اختصار کی خوبی بہت کم ہو گئی ہے پوری پوری روایتوں اور حدیثوں کو بنیاد قرار دیکر مرثیوں کو اتنا طول دے دیا ہے کہ شاعرانہ لطافت و ذہنی کاوش کو بلند ہونے کا پورا موقع نہیں ملتا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے مرزا دبیرؔ کے کلام

میں بہ نسبت میر انیس کے کلام کے یکسانیت و ہمواری بھی کم ہے
مرزا دبیر کے یہاں آپ کو اس زمانہ کے مذاق کے مطابق رعایت لفظی و مبالغہ بھی پُر زور طریقہ پر ملتا رہے گا۔ لیکن عالمانہ انداز و استادانہ رنگ سے ان کا کلام کہیں خالی نہ ملے گا۔

انیس

میر ببر علی نام اور انیس تخلص۔ میر خلیق کے صاحبزادے تھے ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آ رہے۔ انیس کا خاندان سالہا سال سے زبان کی خدمت کر رہا تھا کئی پشت سے شاعری سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام زمانے میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی صاحب سے حاصل۔ شاعری میں باپ سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے باپ میر خلیق مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کے ہم پایہ تھے۔ میر انیس نے بھی باپ کے قدم بہ قدم رکھا اور باپ کے زمانہ ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ جب میر ضمیر اور میر خلیق سے زمانہ خالی ہوا تو مرزا دبیر اور انیس نے ان کی جگہ لی اور دونوں حضرات میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ لیکن بجائے کسی خرابی کے کلام میں ترقی ہوتی چلی گئی۔

انیس کو زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر جن الفاظ سے جس موقع پر جو کام لینا چاہتے ہیں وہ خادمانہ اطاعت کے ساتھ حکم

بجالاتے ہیں۔

مرثیے میں بچے بوڑھے، عورت، مرد۔ آقا۔ خادم۔ دوست، دشمن سبھی کا کارنامہ نظر آتا ہے۔ انیس کا کمال ہے کہ ہر ایک کے جذبات کو حفظ مراتب کے لحاظ سے اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ان کے کردار کی پوری تصویر نمایاں ہو جاتی ہے مناظر قدرت کے بیان کرنے میں انیس کو یدطولےٰ ہے۔ دریا۔ جنگل۔ صبح۔ شام۔ دوپہر۔ وغیرہ کا سماں الفاظ سے ایسا کھینچتے ہیں کہ مصوّر کا بھی قلم اسی کیفیت اور نمونہ پیش کرنے سے عاری ہے۔ رزم کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو تلواروں کا چلنا، تیروں کا چمکنا۔ گھوڑوں کا جمنا اور حریف کے دست و بازو کی صفائیاں ہو بہو نظروں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا میدان جنگ میں کھڑے ہو کر خود دیکھ رہے تھے۔ غرضکہ جس مضمون کو لیا ہے اُسے ایسا نبا ہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص رنگ ہے۔

زبان کی لطافت، محاورات کی دلاویزی اور مضمون کی دلکشی کسی وقت پڑھنے والے کی طبیعت کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی سیکڑوں بند کے مرثیے ہیں پڑھتے چلے جایئے مگر کیا مجال کہ ذرا بھی طبیعت اکتائے۔ آزاد نے سچ لکھا ہے دونوں (انیس و دبیر) باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون۔ ہر قسم کے خیال ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کی جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں۔ چاہیں رُلا دیں چاہے ہنسا دیں۔ چاہیں تو حیرت کی مورت بنا دیں۔

سلاست، فصاحت اور روانی میر انیس کے یہاں قدم قدم پر نمایاں ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی دوسرا شاعر اس معاملہ میں مشکل سے ان کا شریک نظر آتا ہے ادق مضامیں کو بھی انیس نہایت آسان لفظوں میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ

مضمون کی دقت مشکل سے محسوس ہوتی ہے۔ متانت وسنجیدگی ان کے کلام کی جان ہیں۔ ابتذال سے سخت نفرت ہے۔ مکالمہ میں کوئی شاعر انیس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اگر ان کے تمام کلام پر نظر ڈالیے تو وقار و تمکین کے ساتھ اخلاقِ حسنہ کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں نولکشور پریس سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن نظامی پریس نے بچپن۔ جوانی۔ اور بڑھاپے کے لحاظ سے کلام کو تین حصوں میں الگ کر کے شائع کیا ہے۔ ہر دور میں تدریجی ترقی نظر آتی ہے۔ میر انیس نے بہتر سال کی عمر پائی سنہ ۱۸۷۴ء میں عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

جب تک لکھنؤ آباد رہا زیادہ تر یہیں رہے۔ لیکن غدر کے بعد جب لکھنؤ تاراج ہوا تو میر انیس اور مرزا دبیر کی زیارت کا موقع دوسرے شہروں کو بھی نصیب ہوا عظیم آباد۔ بنارس۔ حیدرآباد اور الہ آباد کو بھی ان کی زیارت اور کلام سننے کا موقع ملا۔

دورِ جدید

غدر کے ہنگامہ کے بعد نہ صرف ہندوستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ہوا۔ انگریزی ادب سے روشناس ہوتے ہی اس کے گوناگوں اصنافِ شاعری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامہ۔ مناظر اور مختلف عنوان کی کارآمد نظموں کی ابتدا ہوئی۔ حالانکہ اُردو میں جن لوگوں نے اس راستہ کو دکھایا انہوں نے خود باقاعدہ کبھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن صحبت کا اثر اور زبان کی محبّت نے دلوں کو اُبھارا اور رفتہ رفتہ انہوں نے وہ رہنمائی کی کہ زمانہ کی آنکھیں کھُل گئیں۔ ایک وسیع میدان سامنے دیکھ کر پامال راستے اور فرسودہ خیالات سے گھبرا کر اُردو کی دنیا نے نئی منزل کی طرف قدم اُٹھایا۔

نثر کی اصلاح فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوگئی تھی۔ سرسیّد اور انکے

ساتھیوں نے علمی مضامین اور اخلاقی بحثیں مدلّل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک نیا راستہ کھول دیا تھا۔ البتہ نظم کی ترقی کے لئے شاید زمانہ آزاد و حالی کا منتظر تھا۔ آزاد نے پنجاب میں رہ کر ایک علمی انجمن قایم کی جس کا مقصد اُردو شاعری کی اصلاح اور ترقی تھا۔ جس میں بجائے مصرع کے عنوان نظم دیا جاتا تھا۔ اسی انجمن میں حالی نے اپنی مشہور اور ہر دلعزیز نظمیں "برکھا رت" وغیرہ پڑھیں۔ جو ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گئیں اور عام طور سے مقبول ہوئیں۔

حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ یہیں سے اس دور کی بنا پڑی جس کا عہدِ حاضر بھی ممنون ہے۔ شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اُردو کا شاعر حسن کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوا یعنی مبالغہ سے گریز اور محبت کی تنگ دنیا سے باہر نکل کر کورانہ جذبات نگاری کو ترک کرنے لگا۔ کارآمد موضوع پر مختلف شکلوں میں نظمیں نمایاں ہونے لگیں رفتہ رفتہ سیاسی مضامین بھی اردو شاعری کے احاطہ میں آگئے اور عہد حاضر میں تو اس کثرت کے ساتھ معاشرتی و سیاسی پہلو پر نظمیں آنے لگی ہیں کہ دوسری چیزیں پسِ پشت رہ گئی ہیں۔ حقیقت نگاری اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

آزاد

محمد حسین نام اور آزاد تخلص تھا ان کے والد کا نام محمد باقر تھا خاص دہلی کے رہنے والے تھے سنہ ولادت ۱۸۳۲ء ہے مولوی محمد باقر اور ذوقؔ سے

ایسے مراسم تھے کہ عزیزداری بھی پیچ تھی۔ جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے بیٹے کو ذوق کے سپرد کیا جن کے سایۂ عاطفت میں آزاد کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

غدر کے ہنگامہ میں آزاد پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی مولوی محمد باقر شہید ہوئے گھر بار لٹ گیا۔ کچھ دنوں تک آزاد کس مپرسی کی حالت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے۔ آخر میں لاہور پہنچے اور سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ مگر قابلیت کے زور سے رفتہ رفتہ وہ شہرت حاصل کی کہ پنجاب گورنمنٹ کی نظروں میں ان کے سوا کوئی سماتا ہی نہ تھا گورنمنٹ نے ان سے قصص ہند اور مختلف ریڈریں لکھوائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک مرتبہ علمی خدمات کے لئے کابل اور بخارا بھی گورنمنٹ کی طرف سے بھیجے گئے۔

آزاد کے کارنامے اردو ادب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں انہوں نے نہ صرف مختلف کارآمد نظمیں لکھ کر اردو شاعری کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی بلکہ نثر میں بھی ایسی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتی تھیں۔ رمزیہ افسانہ، اردو ادب کی باقاعدہ تاریخ، علم اللسان پر سخندانِ فارس وغیرہ ایسے کارنامے ہیں جو اردو میں اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے۔ آزاد کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔

آزاد کی شاعری کی خصوصیات

آزاد چونکہ جدید اردو شاعری کے بانی تھے اس لئے ان کے یہاں شاعری کی تمام خوبیاں نہیں پیدا ہو سکیں بعض جگہ تعقید بھی ہے چستی بھی کم ہے

علو تخیل کا بھی فقدان ہے لیکن عموماً منظر نگاری اور نادر کلام کو جس طرح آزاد نے نبھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ لطیف اور نازک جذبات کو نہایت خوبی سے ابھارتے ہیں ان کے کلام کا خاص جوہر جوش اور درد ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کی تہہ میں معنی خیز مطالب نہایت خوبی سے بیان کر جاتے ہیں

آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں "آزاد کی شاعری پژمردہ دلوں کو بہلا سکتی ہے دامن دل سے گرد افکار کو دھو سکتی ہے لیکن خیال کو عروج اور ذہن کو قوت پرواز عطا نہیں کر سکتی۔ شگفتگی، لطافت، ترنم اور نفیس تشبیہوں اور طویل استعاروں کا استعمال آزاد کی شاعری کے اثر کا خاص راز ہے۔ اس رنگ میں انکی شاعری منفرد ہے"۔ [۱]

اسی لائق مصنف نے آزاد اور حالی کا جا بجا جو موازنہ کیا ہے اس کا اقتباس ہم کہیں کہیں سے پیش کرتے ہیں "حالی کے برخلاف آزاد کے سامنے کوئی تلقینی یا اخلاقی مقصد شعر لکھتے وقت موجود نہیں رہتا تھا۔ اس لئے ان کے کلام میں حالی کی نسبت زیادہ فطرت ہے"۔ [۲]

صفحہ ۱۰۵ پر لکھتے ہیں کہ "آزاد کے کلام میں جو جوش ہے وہ ہمارے جذبات کو حالی کے کلام سے زیادہ متاثر کرتا ہے"

آزاد اپنی شاعری کو ذریعۂ اصلاح نہیں بناتے۔ پند و نصائح سے گریز کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام خشک اور پھیکا نہیں ہونے پاتا۔ جو موضوع ان کو پسند آجاتا ہے اس پر طبع آزمائی کرکے بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

---

[۱] جدید اردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری صـ ۱۰۹

[۲] جدید اردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری صـ ۱۰۳

ان کی یادگار کئی ایک مثنویاں ہیں مثلاً شبِ قدر، صبحِ اُمید، گنجِ قناعت، وداعِ انصاف، دادِ انصاف خوابِ امن وغیرہ ان سب میں خوابِ امن، طرزِ بیان، روانی، استعارے وغیرہ کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔

حالی

الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جب نو برس کے ہوئے تو سر سے سایۂ پدری جاتا رہا زمانہ قدیم کی رسم تھی کہ بچے کو پہلے قرآن پڑھاتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کے بعد فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی ۱۷ سال کے تھے کہ ان کے خلاف رائے شادی کر دی گئی مگر انہوں نے کتب بینی کے مشغلے کو جاری رکھا۔ علمی استعداد روز بروز ترقی کرتی رہی۔

دہلی میں آکر مرزا غالب کے شاگرد ہوئے مگر غالب کی صحبت سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع نہ ملا۔ غدر کے ہنگامے نے کئی سال تک گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا۔ تین چار برس کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے فیض صحبت حاصل ہوا۔ ان کی صحبت سے حالی کے خیالات پر بہت کچھ اثر پڑا۔ شیفتہ مبالغہ سے گریز کرتے تھے۔ سچی باتیں اور سیدھے سادے خیالات کو نظم کرنا ان کے نزدیک شاعر کا فرض اوّلیں تھا۔ یہ باتیں ایسی تھیں جو حالی کی جدید شاعری کا پس منظر ہو گئیں۔

شیفتہ کے یہاں آٹھ برس رہ کر لاہور گئے۔ وہاں گورنمنٹ بکڈپو میں ایک جگہ ملی جہاں اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا کام سپرد ہوا۔ چونکہ

اس کام میں انگریزی ادب سے واقفیت کا موقع ملا اس وجہ سے حالی کی طبیعت پر مغربی خیالات کا کافی اثر پڑا اُردو کی پستی دیکھ کر اس کی شاعری اور انشا پردازی کے نقائص پر اصلاح کے لئے کمر باندھی۔ رفتہ رفتہ حالی کو بھی اس انجمن میں باریابی ہوئی جہاں آزاد نغمہ سنجی کر چکے تھے۔

حالی نے بھی جدید طریقے پر عمل پیرا ہو کر چار مثنویاں اس مشاعرے میں پڑھیں۔ پہلی برکھا رت۔ دوسری نشاطِ اُمید۔ تیسری مناظرہ رحم وانصاف چوتھی حبِ وطن۔ یہ مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ بعد میں بھی کارآمد نظمیں لکھتے رہے۔ ایک مسدس مدوجزرِ اسلام کے نام سے لکھا جس میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب دکھائے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

اگرچہ جدید شاعری کی بنیاد آزاد کے ہاتھوں پڑی لیکن حالی کی جنبش قلم نے اس کو مستقل اور نمایاں شکل دے دی۔ سب سے پہلی چیز جس پر نظر پڑتی ہے وہ اُن کی نظموں کی ضخامت اور نئے عنوانوں کی کثرت ہے۔

حالی کا مجموعہ کلام بادی النظر میں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) نظمیں (۲) غزلیں نئے عنوانوں کے علاوہ ان کی نظموں میں سادگی، روانی تسلسل اور ایک بڑی حد تک ہمواری، یکسانیت اور یک رنگی موجود ہے۔

منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قومیت اظہارِ شخصیت، وسعتِ نظر، صداقت پسندی، جذبۂ ہمدردی، اور کہیں کہیں سادگی اور بے تکلف سرمستی کلام میں خاص دلکشی پیدا کر دیتی ہیں۔

حالی کے مجموعہ کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کے یہاں درسِ عمل اور واقعیت وجدانی کیفیات سے ہرگز محروم نہیں

ہیں۔

حالی کی قدیم غزلوں میں شیفتہ کا اثر نمایاں ہے جن میں عاشقانہ جذبات نہایت تیز اور پُر اثر ہیں ۔ سادگی کے ساتھ لطیف کنائے اور حسن و عشق کے رموز اس طرح آجاتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک پرکیف و پاکیزہ فضا میں پہنچ جاتا ہے ۔ اعتدال، اختصار، بے تکلفی ۔ ترنم اور کہیں کہیں سہل ممتنع ان غزلوں کی امتیازی خصوصیات ہیں ۔ جدید غزلوں میں حالی نے نئی مہم سر کرنی چاہی مگر شگفتگی و سلاست اور غزلوں کا فطری لب و لہجہ بہت کم قائم رکھ سکے ان غزلوں کی حیثیت ایک ادبی تجربہ سے زیادہ نہ بڑھ سکی ۔

اسمٰعیل

ان کا وطن میرٹھ ہے ۔ جہاں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ابھی دنیا کو بہت کم دیکھا تھا کہ ملازمت کا بار سر پر پڑ گیا سولہ سال کی عمر تھی جب سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے پہلے دفتر میں کچھ دن تک کام کرتے رہے لیکن علمی قابلیت نے بہت جلد ترقی کے میدان میں کھڑا کر دیا ۔ یہاں تک کہ فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے سہارنپور و میرٹھ میں عرصہ تک اسی خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ گئے اس وقت سے برابر یہیں قیام رہا ۱۸۹۹ء میں پنشن لی ۔ اپنے وطن میں آکر بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی ۱۹۱۷ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی ۔

مولوی اسمٰعیل کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ اردو ریڈریں ہیں ۔ جو

بچوں کے لئے انہوں نے لکھی تھیں۔ یہ کتابیں کچھ ایسے انداز اور مزاج شناسی کے ساتھ لکھی گئیں کہ بہت عرصے تک کورس میں داخل رہیں۔ اگر انکی پانچویں ریڈر تک کوئی شخص توجہ کے ساتھ پڑھ لیتا تو اس کو اچھی خاصی اردو آ جاتی۔ مولوی اسمٰعیل کو سررشتہ تعلیم میں رہ کر بچوں کے دل و دماغ سے آشنا ہونے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ جس سے انہوں نے وہ فائدہ اٹھایا کہ دوسروں کو نصیب نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہی کتابوں کی بدولت ان کو اردو دنیا نے شاعر کی حیثیت سے بھی جانا۔ بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ کر انہوں نے کچھ اس انداز سے نغمہ سرائی کی کہ پیران کہن سال کی بھی نظریں اٹھنے لگیں۔ پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں کم و بیش یکساں متاثر ہونے لگے۔

اسمٰعیل کا کلام تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے ایک تو وہ حصہ جو بچوں کے لئے ہے اور دوسرا وہ جس میں نظمیں ہیں اور تیسرا حصہ وہ جس میں عاشقانہ و صوفیانہ مضامین ہیں بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اسمٰعیل نے بہ نظر غائر کیا تھا۔ ان کے مذاق کا صحیح اندازہ تھا چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرنا مولوی اسمٰعیل کا خاص کارنامہ ہے ایسی نظموں میں روانی، لطافت اور زبان کی سادگی خاص طور پہ پائی جاتی ہیں۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو شعر کے جامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ہر قدم پر ایک امنگ ایک ابھار اور ایک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

منظر نگاری میں بھی اسمٰعیل کو خاص ملکہ ہے وہ تفصیلات میں تو زیادہ نہیں جاتے مگر حقیقت و کیفیت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں تشبیہات اتنی پر لطف لاتے ہیں کہ ایک تازگی محسوس ہوتی ہے اور طرز بیاں کی خوبی سے

منظر کی دلاویزی نہایت پرکیف و پااثر ہو جاتی ہے۔

اسمٰعیل کی قومی نظموں کا رجحان زیادہ تر اصلاحی ہے۔ اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ کام کرنے اور پاک باز رہنے کی تلقین زیادہ ہے اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے کبھی کبھی وہ عہد ماضی کا عروج اور عہد حاضر کی پستی کا موازنہ کرکے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اکبر کی طرح انگریزی فیشن سے گریز پر بھی زور دیتے ہیں۔ اور سماجی کمزوریوں کی طرف پراثر انداز میں اشارے کرتے ہیں۔ وہ اپنا اصلاحی مقصد قصائد وغیرہ میں بھی نہیں بھولتے۔ کبھی کبھی کار آمد نصیحت اس میدان میں بھی کر جاتے ہیں۔ غزلوں میں وہ زیادہ تر تصوّف کے مسائل نظم کرتے ہیں عشقیہ مضامین بھی پُرزور انداز میں بیان کرتے ہیں مگر شوخی اور تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ لب و لہجہ کے لحاظ سے غزلیات میں غالب کا اثر نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں پر غزلیں بھی اسمٰعیل نے لکھی ہیں یوں بھی کلام سے غالب کی تقلید نمایاں ہے۔ وہ غالب کو اپنا استاد بھی بتاتے تھے مگر ان کی سوانح عمری سے یہ پتا نہیں چلتا کہ شاعری کے لئے وہ کسی استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے یا نہیں۔

مولوی اسمٰعیل کو انگریزی نظموں کے ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ جہاں کہیں انہوں نے نظم کا ترجمہ نظم میں کیا ہے وہاں محاورہ اور سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ان کا عام انداز بیان نہایت سیدھا سادہ ہے۔ ہندی الفاظ مثلاً کھیت، سکت، ملیامیٹ۔ دلبر، وغیرہ کے استعمال میں تکلف نہیں کرتے۔

ان کے کلیات میں مختلف اصناف شاعری نظر آتے ہیں، غزل، رباعی قصیدہ کے علاوہ سلام و مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مولوی اسمٰعیل ہر حال

ہیں بچوں کا خیال رکھتے ہیں ایک غزل کہی ہے جو مومن کی مشہور غزل ہے
"تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے جواب میں ہے اس میں خالق باری کی طرح بچوں
کے لئے لغت کا مجموعہ اکٹھا کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہی کارواں وہی قافلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن
اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی خوار ہے جو ذلیل ہے وہی دوست ہے جو خلیل ہے
بد و نیک کیا ہے بُرا بھلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سُرور

منشی[1] درگا سہائے سُرورؔ حکیم پیارے لال کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت دسمبر ۱۸۷۲ء میں جہاں آباد ضلع پیلی بھیت میں ہوئی۔ آپ کے بزرگ اس قصبہ کے قدیم رئیس و زمیندار تھے۔

سُرورؔ کی ابتدائی تعلیم جہاں آباد کے تحصیلی اسکول میں ہوئی وہیں سے انہوں نے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا ابتدا ہی سے وہ اپنی جماعت میں ذہانت کی وجہ سے ممتاز رہے اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ نے مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ شعر و سخن کا شوق بھی اسی وقت سے پیدا ہوا لکھنے پڑھنے سے جس قدر وقت بچتا تھا شعرگوئی اور شعرا کا کلام دیکھنے میں صرف کرتے تھے۔ آپ اصلاح بھی مولوی صاحب موصوف سے لیا کرتے تھے۔

عرصہ کے بعد سرورؔ کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا جہاں آباد میں اس کے لئے کوئی اسکول نہ تھا۔ لہذا ایک پوسٹ ماسٹر سے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ دو سال کے عرصے میں آپ نے انگریزی مڈل کا بھی امتحان پاس کر لیا شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا۔ ابتدا میں وحشتؔ تخلص اختیار کیا لیکن پھر سرورؔ ہو گئے۔

۱۸۹۹ء سے آپ کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہونے لگا ادیب و مخزن میں آپ کا کلام خاص طور سے جگہ پاتا رہا سرورؔ نہایت

---

[1] ماخوذ از جام سرور

امنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی خوش دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً ان کا اکلوتا بیٹا جس کی ماں اُسے ایک سال کا چھوڑ کر مری تھی انتقال کر گیا اس حادثہ نے سرورؔ کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ ہر وقت غم زدہ رہنے لگے اور غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اختیار کر لی حالانکہ کہتے ہی تھے کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

لیکن آخر آخر میں اس قدر پینے لگے تھے کہ کئی کئی روز تک مست و بیہوش رہتے تھے۔ ۳ر اپریل ۱۹۱۰ء کو سرورؔ نے اپنا مجموعۂ کلام مرتّب کرنے کی غرض سے الہ آباد کا سفر کیا۔ ۲ر جون کو آپ الہ آباد سے وطن آئے دوبارہ پھر اسی سلسلہ میں الہ آباد آ رہے تھے کہ یکایک بخار اور درد سینہ میں مبتلا ہو گئے اور دو ہی روز میں ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو رحلت کر گئے۔

سرورؔ نہایت نیک طینت، حلیم اور راست باز تھے۔ گفتگو کا انداز خاص تھا جس میں منکسر مزاجی ایک قسم کی شیرینی پیدا کر دیتی تھی طبیعت میں ظرافت اور زندہ دلی بھری تھی "بندہ نواز" ان کا تکیہ کلام تھا۔ شاعری کے اثر سے طبیعت میں درویشی پیدا ہو گئی تھی اور تنہائی زیادہ پسند کرتے تھے۔

سرورؔ کے یہاں نظموں کا ذخیرہ غزلیات کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ آپ نے گوناگوں مسائل سے کلام میں ندرت و تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں امتیازی خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ محض ایران و عرب ہی کے دریا و جانور وغیرہ کو جذبات انگیزی کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ہندوستان کی بھی چیزوں کو سامانِ صد بہار، خیال کر کے کلام میں نہایت ممتاز جگہ دی ہے۔ بلبل۔ قمری۔ دجلہ۔ فرات۔ لیلیٰ و شیریں کے پہلو بہ پہلو ہندوستان

کی کوئل۔ بھونرا۔ ہنس۔ سارس، مرغابی، گنگا، جمنا، دمن و پدمنی کو جگہ دی ہے گویا سودیشی پیداوار کو بدیسی مال کے پہلو بہ پہلو سجا دیا ہے۔

سرور کے پہلو میں ایک ایسا حساس دل تھا جو پھول وغیرہ میں بھی وہی نزاکت و جذبات ڈھونڈھتا تھا جو انسان کے دل میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ سرور کی نگاہ نہایت وسیع ہے۔ درس لینے کی اہلیت اس درجہ ہے کہ غیر مادی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی زندگی سے سبق لیکر حقیقت کے رموز حاصل کرتے ہیں۔ گویا مادی چیزوں سے روحانی منزل تک بالعموم پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں خاک وطن سے محبت کے اظہار میں ایک ایک لفظ سے عقیدت و اُنس کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی سلسلہ میں اس قدر جوش آجاتا ہے کہ جن کو وطن سے محبت نہیں ان پر لعنت کے تیر برسا دیتے ہیں۔

سرور کا کلام نہ صرف مبالغہ سے پاک ہے بلکہ اس کی جگہ حقیقت لئے ہوئے ہے۔ خیالی باتوں کی جگہ عموماً زندگی کے روزمرہ کے واقعات دلچسپ طریقے سے جگہ پاتے ہیں۔ طرز بیان میں فارسی تراکیب سے چستی درد آئی پیدا کر دیتے ہیں الفاظ کے انتخاب میں عموماً بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے شعر میں ایک ترنم اور ساتھ ہی ساتھ کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے وحدت کے خشک مضمون میں دل کشی پیدا کر دیتے ہیں۔ گھریلو زندگی کا بھی جب نقشہ کھینچتے ہیں تو تاثیر ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ تغزل کی چاشنی دے کر نظموں کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔

سورج نرائن مہر

مہر کی خدمات یوں بھی قابل قدر ہیں کہ جب اُردو کی فضا میں غزل کا نغمہ گونج رہا تھا مستقل نظموں کی طرف لوگوں کا التفات بہت کم تھا۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ طبع زاد موضوع پر نظمیں لکھی ہوں بلکہ انگریزی کی نظموں کو شعر کا جامہ پہنا کر زبان میں حتی المقدور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نظمیں زیادہ تر لفظی ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ "کلام مہر" کے دیباچہ میں خود رقم طراز ہیں انگریزی نظموں کے ترجمے خاکسار نے ۱۸۹۲ء میں کئے تھے نظمیں انگریزی نظموں کے تقریباً لفظی ترجمے تھے۔ اُن میں میرا کچھ نہیں ہے۔ کہیں کہیں ضرورت وزن یا محاورۂ زبان کے لحاظ سے چھوٹی موٹی تبدیلی بے شک عمل میں آئی ہے۔ ورنہ یوں سمجھیے کہ اردو میں انگریزی نظمیں ہیں ان میں ہر قسم کے مذاق کے نمونے شامل ہیں۔ مزاح، سوز، تصور، بیان، اخلاق، فلسفہ وغیرہ کئی عشقیہ کہانیاں بھی ہیں۔ لیکن یہ عشق زبان اُردو کے عشق سے کچھ علیحدہ چیز ہے۔

ان ترجموں کے علاوہ مہر نے اپنی طبیعت سے بھی اخلاق و نیز دیگر عنوانوں پر طبع آزمائی کر کے مختلف نظمیں کہی ہیں جن کا ذخیرہ کافی بڑا ہے ان نظموں میں دنیا سے بیزار ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں۔ یہاں رہنے کے لئے نفس کشی کی زبردست تعلیم دیتے ہیں۔

مہر کے کلام میں تصوف بھی کافی ہے۔ راہِ سلوک کی اکثر باتیں ایسی لکھی ہیں کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اقوال رسمی نہیں ہیں بلکہ ایک

ایسے دل سے نکلے ہیں جو خود بھی سالک راہ فنا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مہر نے اکثر مستقل عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً رموز عشق، رموز عرفان ترک خودی، ہمہ اوست، وصال وغیرہ۔

مہر عرصۂ دراز تک سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے اس لئے انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں بھی کہی ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی طرح ان کو اردو ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اکثر ترنم ریز بحریں اختیار کی ہیں۔ یہاں زبان خاص طور سے نرم و شیریں ہے۔ بچوں کے لئے سبق آموز و کارآمد موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کا فیض صرف بچوں تک محدود نہیں تھا بلکہ جوان اور بوڑھوں کی بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جو دماغ پرور اور سبق آموز ہیں۔ مثلاً زن کامل تدریج حیات انسانی کے لئے ناٹک اور بیراگ وغیرہ۔

مہر نے اردو ادب کے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے قصیدہ غزل، مسدس، مخمس، مثنوی، مستقل نظمیں، قطعات وغیرہ سب ہی ان کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ کلام ابتذال سے یک قلم پاک ہے۔ سادگی و صفائی خوب ہے۔ شعریت البتہ کہیں کہیں کم ہو جاتی ہے، طرز بیان نہایت صاف و ستھرا ہے۔ کلام خلوص کا آئینہ ہے اور زبان و محاورات کا منتخب ذخیرہ ہے

نوبت رائے نظر

آپ لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان نہایت معزز کائستھ

خاندان تھا جس کے اکثر افراد شاہی زمانے میں معزز عہدوں پر مامور تھے۔ نظرؔ کی تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ علمی ذوق بچپن ہی سے تھا۔ اور سن شعور کے پہنچتے ہی شعر گوئی کا بھی شوق ہوا۔ آغا مظہر لکھنوی سے اصلاح سخن لینے لگے اور رفتہ رفتہ وہ مشق بہم پہنچائی کہ خود بھی استاد سمجھے جانے لگے۔

زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کے لئے نظرؔ نے وقف کر دیا تھا۔ نثر و نظم دونوں میدانوں میں توسن فکر رواں رہتا۔ اردو کو ترقی دینے کیلئے مختلف رسالوں کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ "خدنگ نظر" ماہانہ نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ دراصل اردو غزلیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا اس وقت ملک میں اس قسم کے گلدستوں کے نکالنے کا عام رواج تھا۔

نظرؔ نے اس میں ایک اضافہ یہ کیا کہ نثر کے مضامین بھی لکھنا شروع کر دئے کچھ عرصہ تک یہ رسالہ نہایت کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا مگر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔

۱۹۰۴ء میں نظرؔ رسالہ زمانہ کے نائب مدیر مقرر ہوئے ان کی خدمات کی وجہ سے زمانہ کی ابتدائی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جنوری ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد سے اردو کا مشہور رسالہ ادیب بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ اس کی ایڈیٹری کے لئے جناب نظرؔ منتخب کئے گئے اس رسالہ کو آپ نے اس حسن و خوبی کے ساتھ شائع کیا کہ دنیائے ادب میں ادیب کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ممتاز جگہ نصیب ہو گئی۔ افسوس کہ چند وجوہ سے نظرؔ کو ادیب سے

ماخوذ از زمانہ جنوری ۱۹۲۷ء

علیحدگی اختیار کر لی پڑی اور ۱۹۱۱ء میں وہ پھر زمانہ کے دفتر میں چلے گئے اور وہاں تقریباً دو سال تک قیام رہا۔ ۱۹۱۲ء میں نظر بسلسلہ ملازمت نولکشور پریس لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے اودھ اخبار نکالتے رہے اس اخبار سے ۱۹۲۳ء تک تعلق رہا۔ ۱۹۲۳ء میں بعارضہ ضیق النفس آپ کا انتقال ہوا

نظر کی شہرت کا دامن نظموں سے زیادہ غزلیات سے وابستہ ہے انکی غزلوں میں سوز و گداز ہے پہلی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتی ہے۔ بندش کی چاشنی محاوروں کی خوبی سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ غزل کے اشعار عموماً نہایت صاف اور سادے ہوتے ہیں معنویت اس خوبی سے جگہ پاتی ہے کہ تاثیر کے ساتھ معنی آفرینی نظر کی غزلیات کی ایک امتیازی شان ہو گئی ہے۔ کلام کی پختگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی بھی ان کی غزلیات میں الفاظ کا انتخاب نہایت پسندیدہ ہے۔ فارسی عربی کے ملائم و شیریں الفاظ و محاورات سے شعر کے حسن میں نہایت خوبی سے اضافہ کرتے ہیں۔

نظر نے مستقل نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا فطری ذوق غزلیا کی طرف معلوم ہوتا ہے زمانہ کی رفتار دیکھ کر انہوں نے بھی نیچرل اور دوسری نظموں کے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ مگر وہ خوبی نہیں پیدا ہو سکی جو غزل میں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی نظموں کا کوئی مرتبہ نہیں ہے اور ضرور ہے مگر غزل کے مقابلہ میں پست نظر آتی ہیں۔ ہاں جہاں کہیں انہوں نے نظموں میں تغزل کی چاشنی پیدا کر دی ہے وہاں تاثیر کافی ہو جاتی ہے۔ نظمیں عموماً صفائی و سادگی کی سرمایہ دار ہیں، متانت و سنجیدگی ہر جگہ ہے۔ ان ہی وجوہ سے دلکشی بھی قائم رہتی ہے۔ بعض اوقات منظر نگاری میں ان کا قلم مصور

کے قلم کی طرح مختلف صورتوں کو نہایت حسن و خوبی سے تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اکبر

سید اکبر حسین نام تھا اور اکبر تخلص۔ میر تفضل حسین کے بیٹے تھے۔ اکبر کی ولادت کا فخر الہ آباد کو حاصل ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے۔ اکبر ابتدائی تعلیم میں بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا کچھ دنوں کے بعد نائب تحصیلدار ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کرکے ہائی کورٹ کی وکالت پاس کرکے منصف ہو گئے آخر میں جج خفیفہ کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ بالآخر ۱۹۰۳ء میں پنشن لے کر علمی زندگی بسر کرنے لگے۔

اکبر کی ترقی اور شہرت کی اہمیت سرکاری خدمات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے نئے انداز بیان، وطرز تخیل میں مضمر ہے۔ ان کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے جو خواجہ آتش کے بیک واسطہ شاگرد تھے ابتدا میں اکبر بھی اسی رنگ میں شعر کہتے جو اس زمانہ کا خاصہ تھا یعنی مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں نظم کرتے تھے۔ اس رنگ میں بھی جو کچھ اکبر نے کہا ہے وہ آسانی سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ جذبات کو یوں ادا کرتے ہیں جیسے کسی پر خود گزر رہی ہو، صفائی اور سادگی اس زمانہ

میں بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔

اکبر کی شہرت اس وقت سے ہوئی جب انہوں نے قدیم رنگ کو خیرباد کہہ کر اپنے لئے ایک نہایت کارآمد میدان تلاش کیا۔ بچپن سے اکبر کی طبیعت میں شوخی و ظرافت موجود تھی۔ جب انہوں نے نئے میدان میں قدم رکھا تو یہی دونوں باتیں ان کے طائر کلام کے لئے پرواز ثابت ہوئیں۔

ملک اور قوم کی حالت کو تباہ ہوتے دیکھ کر ان کا دل بھر آیا مگر انہوں نے آہ و فریاد سے زمانہ کو چونکانا مناسب نہ سمجھا۔ کبھی چٹکیاں لے کر کبھی طنز آمیز باتیں کہہ کر دلوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔ مغرب کی کورانہ تقلید دیکھ کر اہل مشرق کو طرح طرح سے سمجھاتے ہیں کہ آنکھ بند کر کے یورپ کی ہر بات کو قبول نہ کرو بلکہ وہ جوہر پیدا کرو کہ جس سے تمہاری اور ملک کی حالت بہتر ہو۔ روزمرہ کی زندگی کی اصلاح چھوٹی چھوٹی نظموں میں اس طرح کرتے ہیں کہ فلسفی اور واعظ کی لمبی لمبی تقریریں اور تحریریں ہیچ ہیں۔ سیاسی معاملات کو بھی دوراندیشی کی عینک سے دیکھتے اور اپنے اشعار سے لوگوں کو نتائج کی خبر دیتے۔ ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی کسی نہ کسی تبلیغی مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان کی نصیحت کبھی ناخوش گوار نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے طرز بیان سے وہ تلخ باتوں کو بھی شربت کا گھونٹ بنا دیتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری میں اکبر نے تصنع اور نازک خیالی سے کبھی مشکل سے کام لیا ہوگا۔ سامنے کے مضامین کو نئے الفاظ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا ہے کہ سنتے ہی دلوں پر ان کا جادو چل جاتا ہے۔ ان کے مخصوص الفاظ کی فہرست پر نظر ڈالئے تو بظاہر مکروہ معلوم ہوں گے مگر جب اکبر اپنی طباعی اور ذہانت سے ان ہی الفاظ کو شعر کے جامے میں پیش کرتے ہیں تو ہزار معنویت کا

سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ بدّھو۔ جمّن۔ کلّو۔ شیخ۔ اونٹ۔ ٹٹو۔ ریل گاڑی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ جو سبک اور معمولی نظر آتے ہیں۔ مگر اکبر انہی سے وہ کام لیتے ہیں کہ دقیق اور بھاری بھرکم فقروں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اکبر کی شاعری کا مقصد زیادہ تر اصلاح قوم و ملک ہے جس میں وہ ہندو اور مسلمان سب ہی کو مخاطب کر لیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہوتا ہے۔

اکبر نے انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن میں بیشتر بظاہر ثقیل اور ناقابل قبول ہیں مگر اکبر کے کلام میں یہی الفاظ نہایت بامزہ معلوم ہوتے ہیں افسوس کہ اس طرح پر ہنسا ہنسا کے کام لینے اور اصلاح کرنے والا سنہ ۱۹۲۱ء میں راہی ملکِ بقا ہوا۔

اکبر کا یہ کارنامہ وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے وجود میں آیا جس میں اصلاحی مقصد تمام تر پیشِ نظر رہا۔ ممکن ہے کہ ادب اکبر کو اس کارنامہ پر حیات جاوید عطا نہ کرے مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اپنے ماحول کی ترجمانی اور سماج کی درستی بھی شاعر کا ایک بڑا فریضہ ہے۔ وہ اکبر نے پوری طرح انجام دیا اکبر کی وہ نظمیں جو کسی تبلیغی مقصد کے تحت میں نہیں کہی گئیں ہیں ان کی اہمیت سے نہ ادب انکار کر سکتا ہے اور نہ کوئی بڑے سے بڑا نقّاد۔ ایسی نظمیں کلیات اکبر میں بہت کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں نہایت قابل قدر و لازوال منجملہ جلوۂ دربار دہلی، پانی کا بہاؤ، برق کلیسا ہر بلند پایہ شاعر کے لئے باعث افتخار ہو سکتی ہیں۔

شاد

شادؔ کے والد سید عباس مرزا کی ولادت کا بھی فخر ضلع الہ آباد ہی کو حاصل ہے چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ یہاں سے عظیم آباد چلے گئے جہاں شادؔ کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ شادؔ کا خاندان عرصۂ دراز سے اپنے کمالات و شاہی خدمات کی وجہ سے مشہور و معروف رہا ہے۔

شادؔ کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ کئی ایک مولویوں نے ابتدائی کتابیں پڑھائیں لیکن تربیت سر سید مرحوم کے ذمہ تھی جو اردو زبان کے بہت بڑے محقق تھے ان ہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شادؔ کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا تھا کہ وہ اپنے وقت کے میر سمجھے گئے عربی۔ فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد ایک بزرگ کے اصرار سے انگریزی بھی شروع کر دی لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھوڑے ہی عرصہ میں اس تعلیم سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

شادؔ نے کلام پر اصلاح شروع میں دو شخصوں سے لی ناظر ذریعلی عجرقی اور مولانا میر تصدق حسین زخمی۔ ادبیات و فنون شاعری کی اکثر کتابیں انہی دونوں بزرگوں سے پڑھیں لیکن اس کی تکمیل سید شاہ الفت حسین فریادؔ سے کی جو خواجہ میر دردؔ کے شاگرد تھے۔

شادؔ کی ہمہ گیر طبیعت نے ان کو محض اسلامی علوم پر اکتفا نہ کرنے دیا بلکہ عیسائیوں کے عہد نامجات عتیق و جدید، پارسیوں کی زند و پازند اور ہندوؤں

لہ ماخوذ از گلشن حیات

کی رامائن وگیتا وغیرہ کی سیر کا بھی موقع دیا۔

شاد نے اپنی کل عمر اردو ادب کی خدمت میں گزاری کئی ایک تصنیفات یادگار ہیں۔ ان کی علمی خدمات کا صلہ گورنمنٹ کی طرف سے بھی ملتا رہا چنانچہ مؤلف گلشن حیات رقم طراز ہیں "کہ آپ کے کمالات وریاضت اور ان علمی خدمات کے عوض میں جو آپ نے اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعہ ابنائے وطن کی انجام دی ہیں۔ گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۹۱ء میں "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا سرکار سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا رہا۔ شاد نے ۱۳۴۵ھ میں اس دنیا سے رحلت کی۔

شاد کے کلام کی سب سے ممتاز خوبی زبان کی صفائی وسادگی ہے نہایت شیریں و منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اشعار کو اتنا پُرتاثیر بنا دیتے ہیں کہ فوراً دل ودماغ متاثر ہو جاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ روزمرہ عام فہم الفاظ میں وہ ادق سے ادق مضامین نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں جو ان کی استادی و کہنہ مشقی کا بین ثبوت ہے ان کے کلام میں اخلاق، فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے۔ عموماً انداز بیان میر سے بہت کچھ ملتا ہے محاورات اس خوبی سے لاتے ہیں کہ رنگ میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف مذاہب کی روحانی تعلیمات کے مطالعہ سے نہ صرف شاد کی نظر بہت وسیع ہو گئی تھی۔ بلکہ تمام کلام میں ایک ایسا کیف پیدا ہو گیا تھا جس کو پڑھ کر خود بخود ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شاد نے بہت سے کہنہ مشقوں کی صحبت اٹھائی تھی۔ جس کی وجہ سے کلام میں پختگی اور مضبوطی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ میر انیس و مونس کی آنکھیں

دیکھ چکے تھے لہذا کلام میں ان لوگوں کی زبان و بیان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس اعتبار سے ان کا تعلق عہد قدیم سے بہت کچھ ہے۔

یوں تو شاد نے اردو کے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ اور غزل کے میدان میں انہوں نے خاص جوہر دکھائے ہیں۔ مرثیہ میں زبان و خیال وغیرہ کے اعتبار سے میر انیس کا تتبع کیا ہے فصاحت، سلاست مضمون آفرینی۔ بلند پردازی۔ کردار نگاری منظر نگاری شاد کے مرثیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۱۹۳۸ء؁ میں شاد کی غزلوں کا دیوان ان کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کرکے نغمۂ الہام کے نام سے شائع کیا ہے دیوان مرتب کرنے والے اگر غالب کے طریقۂ انتخاب پر عمل کریں تو شاید نقصان میں نہ رہیں۔ دیوان شاد میں یہ رویہ نہیں رکھا گیا نتیجہ یہ ہے کہ رطب و یابس سب کچھ ایک جگہ جمع ہوگیا ہے اور مجموعی حیثیت سے کلام اتنا پُر اثر نہیں ہوسکا جتنا انتخاب سے ہوجاتا

نظم طباطبائی

ان کے والد کا نام میر مصطفٰے حسین طباطبائی تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے شاید پڑپوتے یا پوتے ہوتے تھے ملتا ہے۔ نظم ۱۶ ؍ محرم روز جمعہ ۱۲۶۹ھ؁ کو بمقام حیدر گنج لکھنؤ پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر تک آپ نے اپنے وطن میں رہ کر ملا طاہر نحوی سے عربی

ماخوذ از "زمانہ کانپور" اگست ۱۹۲۳ء؁

فارسی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ ان ہی ایام میں پنڈت لال زار سے علوم متداولہ اور فن سخن حاصل کرتے رہے۔

نظم اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے شاہ اودھ کے شاہزادوں کی اتالیقی کے لئے منتخب کئے گئے۔ مٹیا برج پہنچ کر استادی شاگردی دونوں کا سلسلہ ایک ہی وقت میں قائم رکھا یعنی شاہزادوں کو تعلیم دیتے رہے اور خود علامہ قائمۃ الدین مرزا محمد علی مجتہد سے منقولات کا درس لیا کرتے تھے۔

جب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو نظم نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر کی حیثیت سے طلب کئے گئے جہاں کچھ دنوں تک قائم مقام رہے لیکن سال بھر کے بعد مستقل ہو گئے۔ تقریباً تیس سال تک آپ طلبائے نظام کالج کو اپنے چشمۂ علم و فضل سے سیراب کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو نظام سرکار سے حسن خدمت کے صلہ میں وظیفہ مل گیا لیکن نظام نے قدر دانی فرمائی اور ولی عہد کی تعلیم کے لئے نظم کو مقرر فرمایا انہوں نے یہ خدمت بھی کچھ اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ سرکار نظام سے نواب حیدر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا۔

جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو قدردانوں نے نظم کو دارالترجمہ کی طرف کھینچا جہاں ناظر ادبی کی حیثیت سے آپ نے کام شروع کیا جتنی کتابیں اس محکمہ سے ترجمہ ہوتیں آپ ان کو شائع ہونے سے پہلے ایک بار ادبی نقطۂ نظر سے دیکھ لیا کرتے ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو اس قابل قدر ہستی کی خدمات سے اردو ادب ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

طباطبائی کی ذات فضل و کمال کے لحاظ سے اس زمانہ میں عدیم المثال تھی باوجود اس کے کہ آپ پرانے لوگوں میں سے تھے مگر پھر بھی مغربی

خیالات و ادب سے متاثر ہو کر جدید قسم کی نظموں میں آپ نے وہ نام پیدا کیا کہ گھر گھر شہرہ ہو گیا۔ کچھ نظمیں تو ایسی ہو گئی ہیں جن کا جواب مشکل سے ہو سکتا ہے۔ انگلستان کے مشہور شاعر ''گرے'' کی ایک نظم (گریز ایلیجی) کا ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے نام سے اس خوبی سے کیا ہے کہ اُن کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ کسی زبان سے دوسری زبان میں نظم کا ترجمہ کرنا یوں بھی آسان کام نہیں چہ جائے کہ اس کی تمام خوبیاں منتقل کرنا۔ اسی نظم کے متعلق عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ ''ایسی مقبول روزگار اور ایسی سرمایۂ ناز نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ شاعر جناب مولوی علی حیدر صاحب نے کیا ہے۔ مگر کس خوبی سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے ایسی جانگداز اور موثر نظمیں اور بجنبل طور پر بھی اردو میں کم کہی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا چوتھے مصرع سے انگریزی میں ملتا ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اپنی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کے اردو میں ملایا ہے'' آپ اگر اصل انگریزی میں دیکھ کے اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوتا ہے۔ سوز و گداز کے علاوہ قبرستان کا منظر درسِ عبرت حقیقت جملہ خوبیوں کے ساتھ گورِ غریباں میں جلوہ افروز ہیں۔ اور اردو کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا۔ محاورات انداز بیان مصرعوں کی ساخت۔ ترقی۔ غرضکہ پورا ماحول اردو کا ہے۔

نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں مثلاً مناظر قدرت اخلاقیات، تاریخ وغیرہ، اور ہر ایک میں خیال و حقیقت کے ساتھ شاعری کا مزہ پوری طرح قائم رکھا ہے گلاب کا پھول ایک مختصر سی نظم ہے مگر دنیا کی بے ثباتی اور انجام کا بہترین مرقع ہے۔ ساقی نامہ شفقشقیہ نے اپنے طرز بیان اور تاثیر کی وجہ سے

کافی شہرت پائی اس نظم میں روانی اور برجستگی کے علاوہ شراب کی مذمت نہایت پُراثر طریقہ سے کی گئی ہے ۔

نظم کے کلام میں عام طور پر روانی اور نشست الفاظ کی وجہ سے ترنم پیدا ہوتا ہے جو ہر کلام کے لئے باعث دلکشی ہو سکتا ہے چہ جائے کہ جب اس میں دوسری خوبیاں بھی موجود ہوں۔ اس معرکہ میں وہ نظم جو شاہزادہ البرٹ کے ورود پر لکھی گئی ہے غالباً سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ علاوہ اور خوبیوں کے مولانا اپنے کلام میں محاورات کے صرف سے ایک خاص دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ تشبیہات میں ندرت و شگفتگی کافی ہے۔ بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بات کو سینکڑوں تشبیہوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور بے لطفی نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ رغبت بڑھتی جاتی ہے "طلوع آفتاب" پر جو نظم لکھی وہ خاص طور سے اس بیان کی تائید کرتی ہے ۔

نظم نے اردو ادب میں نظموں کے ترجمہ کرنے والوں کی خاص رہنمائی کی۔ نظموں کا ترجمہ کر کے یہ بتا دیا کہ اردو میں کس طرح ترجمہ کرنا چاہیے محض خیالات کو لے کر اسالیب بیان محاورات اور ترکیبیں اردو کی اس خوبی سے صرف کی ہیں کہ نظموں کا لطف دوبالا ہو گیا اور وہ اردو کی دنیا میں اجنبی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اُسی کی چیز ہو گئیں ۔

نظم نے قصیدوں کو ایک نئی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ان میں تاریخی عنصر کا اضافہ کیا۔ ان کے قصیدوں سے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اسلامی جنگیں جو مسلمانوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھیں ان کے قصیدوں میں جگہ پاتی ہیں معرکہ آرائیوں کا ذکر اس وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے کہ نہ صرف جنگ کا نقشہ پیش نظر ہوتا ہے بلکہ واقعات پر

بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کی سیرت کا بھی پورا اندازہ ہوتا ہے۔
نظم کی عربی۔فارسی دانی اپنا غلبہ اردو شاعری میں بھی دکھاتی جاتی ہے
کبھی ایک مصرعہ فارسی یا عربی کا آجاتا ہے۔کہیں کہیں عربی وفارسی کے ادق
وثقیل الفاظ بھی اردو کے اشعار میں مل جاتے ہیں۔جو خوش گوار نہیں معلوم
ہوتے۔

نصیحت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے مگر جہاں کہیں نظم نے ناصحانہ انداز سے
قلم اٹھایا ہے وہاں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ نہ صرف تلخی دور ہو جائے
بلکہ اثر اور دلکشی بھی پیدا ہو جائے۔

اُن کی جدّت پسند طبیعت نے اردو میں "بلینک ورس" بھی کہا۔
نظم کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد دیوان شائع ہوا اس دیوان میں زیادہ
تر غزلیں ہیں۔تھوڑی سی رباعیاں اور کچھ تاریخیں ہیں۔مصنف نے جو اس
مجموعہ پر تبصرہ کیا ہے اس کا یہاں لکھ دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔لکھتے
ہیں "یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض
احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں۔خود سے کبھی غزل نہیں کہتا۔ردیفیں پوری
نہیں ہیں اور الف، بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں۔غزل
میں مقطع کا ہونا میرے نزدیک یکساں ہے دیوان برسوں سے مرتب
ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا۔میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے
میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل
کردیں۔ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھینچی گئی
ہیں"۔

متانت وسنجیدگی کے ساتھ اشعار نظم کرنا اُن کا خاص حصّہ ہے اُنکا

شمار عہد قدیم میں اگر کیا جائے تو بیجا نہیں مگر ان کی شاعری بالکل موجودہ زمانہ کی شاعری ہے۔ مبالغہ سے بہت کم کام لیا ہے۔ ابتذال کا کہیں نام بھی نہیں۔ محاورات و روزمرہ کا صرف نہایت دلکش ہے۔ اشعار کو دیکھ کر اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ سامنے کے مضمون کہے گئے ہیں۔

غزلوں میں عشق و جذبات کی کمی نمایاں ہے۔ دور متوسط کے شعرا کی طرح اکثر غزلیں قافیہ پیمائی کے ذوق میں شعر کہنے کا نمونہ ہیں۔ سپردگی کی کمی نے غزلوں میں تاثیر ابھرنے نہیں دی اشعار کی تعداد بھی غزلوں میں ضرورت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور قنوطیت ان کی غزلوں کی خاص خصوصیت ہے۔

نظم کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا

باب ۱۱

دورِ حاضر

عزیز

مرزا ہادی عزیز کے بزرگوار شیراز سے پہلے کشمیر آئے تھے۔ شاہان اودھ کے دورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے۔ عزیز کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی علم وفضیلت اس خاندان میں موروثی تھی کئی پشتوں سے علمی خدمت انجام دی جارہی تھی۔ عزیز نے اپنے خاندان کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے تحصیل علم میں بلیغ کوشش کی نتیجہ یہ تھا کہ اپنے عہد کے ممتاز صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔

عزیز کی ولادت ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ سات برس کا سن تھا کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ لیکن فطری شوق نے تحصیل علم سے منہ نہ موڑنے دیا

اور کتب بینی کا مشغلہ آخر تک ذوق و شوق کے ساتھ جاری رہا اساتذہ کے دواوین اور مطالعہ کتب نے ان کی شاعری میں اُستادانہ رنگ پیدا کر دیا۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں حافظ۔ عرفی۔ نظیری کا رنگ مرغوب تھا اردو میں عام طور پر میرؔ اور غالبؔ کی تقلید کرتے تھے۔ عزیزؔ کا شمار اُردو کے اُن چند شعرا میں ہے جنہوں نے دورِ جدید میں غزل کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

عزیزؔ کے اشعار میں الفاظ اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ خود بخود ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے کلام کی دلکشی اور بڑھ جاتی ہے۔ طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے انکے دل میں اتنا سوز و گداز ہے کہ عام طور سے غزلیں واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی سرمایہ دار ہو گئی ہیں۔ زبان کے اعتبار سے کلام نہایت صاف اور سلیس ہے ایک اور خاص بات آپ کے کلام میں یہ نظر آتی ہے کہ تصنع سے پاک ہے۔ آپ کے کلام پر عام طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ غزل میں اس قدر مرنا۔ رونا اور ماتم کا عنصر نامناسب ہے کیونکہ طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزیزؔ کبھی کبھی معنویت میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ الفاظ انکے خیالات کا پورا مفہوم نہیں ادا کرتے جس کی وجہ سے کلام میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور اشعار بعید الفہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی مثال شاذ و نادر ہی ہو گی اردو میں عزیزؔ نے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے۔ جو ہر طرح قابل داد ہے۔ شکوہ الفاظ تسلسل معنویت، علو تخیل، ان کے ہر قصیدہ میں آپ کو خاص طور پر دکھائی دیں گے۔ نظمیں بھی خوب کہتے تھے جن میں سے بعض ایسی ہیں جو ہر شاعر کے

لئے باعثِ افتخار ہو سکتی ہیں۔

گل کدہ (آپ کی غزلوں کا مجموعہ) اور قصائد عزیز آپ کی یادگار ہیں آپ کی وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔

رواںؔ

چودھری جگت موہن لال رواںؔ ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کے تھے کہ ان کے والد چودھری گنگا پرشاد کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات کے بعد رواں کے بڑے بھائی بابو کنھیا لال نے پرورش کی۔ رواںؔ بہت ذہین تھے۔ جب سے پڑھنا شروع کیا امتحانوں میں برابر امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے پاس کیا اور ۱۹۱۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی۔ کر کے اناؤ میں وکالت شروع کی جلد ہی وہاں کے مایہ ناز وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔ شاعری کا لگاؤ بچپن ہی سے ساتھ رہا اور مرتے دم تک قایم رہا ان کا انتقال اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ہوا۔

رواںؔ اپنے کلام پر عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے جس کا اثر ان کی غزلوں پر خاص طور سے نمایاں ہے رواںؔ کے دیوان "روحِ رواں" میں غزل و قطعہ و رباعی کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ غزلوں میں رواںؔ نے زبان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ عامیانہ الفاظ و لہجہ سے ان کو ایک قلم گریز ہے، جس کی وجہ سے کلام میں تازگی اور زبان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے ان کے تمام کلام میں اور خاص کر غزلوں میں برجستگی نہایت نمایاں طور پر نظر آتی

ہے جو دلکشی اور تاثیر میں کافی اضافہ کر دیتی ہے ان کا رجحان بالعموم فلسفہ اور معنویت کی طرف ہے لیکن لطف یہ ہے کہ کلام میں خشکی نہیں آنے پاتی اور چونکہ اثر لے کر کہتے ہیں اس لئے کلام میں درد و کیفیت کی وجہ سے ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

رواںؔ کے کلام میں ایک زور اور سنجیدگی ہر جگہ نمایاں ہے۔

رواںؔ اپنی نظموں میں غزل کی چاشنی دے کر نہایت خوبی سے تاثیر کا اضافہ کر لیتے ہیں ان کی بعض نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں صاف گوئی و صحیح کردار نگاری ان کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ واردات حسن و عشق کو جہاں کہیں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود انؔ ہی کے دل پر کیفیتیں گزر رہی ہیں مناظر فطرت کے بیان میں خاص امور کو نہایت پراثر انداز و الفاظ میں نظم کرتے ہیں۔ غیر مادّی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت بلند مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں نظموں میں عام طور سے روانی و فارسی ترکیبیں ہیں لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔

رواںؔ نے رباعیاں بہت کافی کہیں جن میں زندگی کے مختلف عنوانات پر دلچسپ طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ ادق مضامین کو بھی نہایت سہل کر کے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میدان میں بھی انہوں نے لطیف استعارے اور پسندیدہ تشبیہوں سے اپنے کلام کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

چکبست

ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر یہ فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس پیشہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ لکھنؤ کے ممتاز وکلا میں شمار ہونے لگے۔

۱۹۲۶ء کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے سہ پہر تک بحث کی اور پھر لکھنؤ واپس آنے کے لئے اسٹیشن آئے ریل میں بیٹھے تھے کہ فالج گرا زبان بند ہو گئی اور چند گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر انتقال ہو گیا ۱۱ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لوگ لکھنؤ لائے

کاظم حسین محشر لکھنوی نے چکبست ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات کہی۔

اُن کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست بچپن ہی سے شاعری کے دلدادہ تھے اساتذہ اردو کے کلام کا بغور مطالعہ ان کی روحانی غذا تھی جس نے ان کے جذبات پر صیقل کر دی تھی ۔ آتش۔ غالب اور انیس نے اپنی لاتعداد خوبیوں سے انہیں اپنا گرویدہ بنالیا تھا جس کا اثر آج بھی ان کے کلام پر صاف نظر آرہا ہے۔ مسدّس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا اندازِ بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔

چکبست کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں بہت خوب ہیں ایسے موقعوں پر وہ غالب کی تقلید کرتے ہیں لیکن ظلم ہوگا اگر ان کی ذاتی ذہانت و سخنوری کی داد نہ دی جائے اور محض تقلید ہی تک ان کی فکر رسا کو محدود کر دیا جائے۔ غالب۔ انیس اور آتش کے انداز بیان سے چکبست نے وہ کار نمایاں کیا جو ان کے لئے ایک انفرادی خصوصیت ہو گئی۔ کیونکہ ان ہی بزرگوں کے چمنستان کلام کے رنگ و بو سے انہوں نے سیاسی قومی تحریکوں اور اصلاحوں اور سانحوں کی متعدد شاندار نظموں کو ایک نئی کیفیت عطا کر دی۔

چکبست کے یہاں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں ان کی شاعری کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے۔ چنانچہ غزلوں میں بھی اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں ان کو مغرب کی کورانہ تقلید سے گریز ہے مشرقی تہذیب و تمدن کا سررشتہ چھوڑے بغیر وہ ترمیم کے ساتھ میدان ترقی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں کلام میں بجائے بے اثری کے ایک وارفتگی اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چکبست کی شاعری کا ایک دوسرا دلفریب پہلو ان مناظر میں نظر آتا ہے جہاں وہ ہندوستان ہی کے واقعات اور فطری مناظر سے استعارات و تشبیہات پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ ان چیزوں سے ہماری طبیعتیں آشنا ہیں لہذا کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

چکبست نے اپنے احباب اور جاننے والوں کے اکثر مرثیے کہے ہیں جن میں اپنے جذبات کا نہایت دردمند پیرائے میں اظہار کیا ہے اس سلسلہ میں سرداران قوم کا جہاں کہیں بیان ہے اس میں ان کی سچی

سیرت اور انفرادی حیثیت کو نہایت خوبیوں سے نمایاں کیا ہے۔ایک اور خوبی اُن کے کلام میں نہایت آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے جو کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی۔موجودہ زمانہ کے سیاسی قومی واقعات کو نہایت کامیابی اور شاعرانہ تاثیر کے ساتھ بیان کرنا چکبست کا خاص حصّہ ہے جس میں وہ رسمی لفظ پروری نہیں کرتے بلکہ اپنی آزادیٔ رائے کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں۔افسوس ہے کہ جس پیمانے پر یہ خوبیاں چکبست کے یہاں پائی جاتی ہیں اتنی گہرائی ان کے کلام میں نظر نہیں آتی لیکن بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے زمانے نے ان کی کافی قدر دانی کی اور آج ان کی جگہ اردو شعراء کے بزم اول میں نظر آتی ہے۔ہمارا ادب چکبست کے اس کارنامہ کو نہیں بھلا سکتا کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے سیاسی حالات کو اردو شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔

اقبال

آپ کی ولادت ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی ابتدا میں عام بچوں کی طرح ایک مکتب میں پڑھنا شروع کیا پھر مدرسہ میں داخل ہوئے رفتہ رفتہ انگریزی اسکول کی باری آئی تو انٹرنس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا۔اسکاچ مشین کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا بی۔اے کی تعلیم کیلئے لاہور آنا پڑا۔ڈگری حاصل کرنے کے بعد چند دنوں کیلئے اورینٹل کالج لاہور اور بعد میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہوگئے ۱۹۰۵ء میں تکمیل علم کے لئے انگلستان گئے اقبال کو فلسفہ سے خاص شغف تھا ولایت جاکر اس شوق میں اور ترقی ہوئی یہاں تک کہ فلسفہ کے ڈاکٹر ہوگئے اور ساتھ ہی ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا ابتدائی زمانۂ تعلیم ہی سے طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں داغ کی شاعری کا تمام ہندوستان میں چرچا تھا۔ اقبال نے بھی بذریعہ خط و کتابت ان سے اصلاح لینی شروع کی جس کا اثر اقبال کی زبان پر خاطر خواہ پڑا۔ صفائی و سلاست کا فیض غالباً داغ ہی کی اصلاح کا نتیجہ ہے۔ اقبال کی جدّت پسند طبیعت کے لئے مشکل تھا کہ داغ کے محدود دائرے میں مقید رہتی۔ ان کی فکر کو بلندی و پرواز کی ضرورت تھی جس کا سامان بجز غالب کے کسی کے یہاں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ موصوف نے غالب کی تقلید میں کہنا شروع کیا۔

قابلیت و جوہر نے وہ شہرت بہم پہنچائی کہ اعلیٰ طبقہ بھی اقبال کا اچھے الفاظ میں ذکر کرنے لگا اقبال کی قومی شاعری کی ابتداء انجمن "حمایت اسلام" سے ہوتی ہے جہاں دوستوں کے اصرار سے ان کو مختلف نظموں کے پڑھنے کا موقع ملا چنانچہ "نالۂ یتیم" "فریادِ امت" "شکوہ" وغیرہ اسی انجمن کی یادگار ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے لوگوں کے دل میں بڑی جگہ پیدا کرلی۔ قوم نے اقبال کو اور اقبال نے قوم کو پہچان لیا۔ اسلام کی گرتی ہوئی حالت سنبھالنے کے لئے لوگوں کی نظر انتخاب اس ہونہار شاعر پر پڑی جس کے دردمند دل نے اپنی شاعری کو ایک نسخۂ کیمیا بنا کر مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لئے پیش کیا ان کے نسخہ کے اجزاء میں مایوسی و رشک کے بجائے ہمت افزائی اور خودداری ہے جس کو وہ مسلمانوں کے ہر رگ و پے میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان کا پیام "عمل" ہے۔ ناامید ہو کر بیٹھ جانے والوں کو وہ برادرانہ شفقت کے ساتھ امید دلا کر پھر میدان عمل میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یورپ کی کورانہ تقلید سے بچا کر مادّہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کی طرف لے جانا

چاہتے ہیں۔

اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ رفتہ رفتہ ان کا کلام اس قدر مقبول عام ہوا ہے کہ دورِ حاضر میں مشکل سے کسی شاعر کو یہ فخر حاصل ہے۔ ان کا کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران، افغانستان، امریکہ اور انگلستان میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا یہ قدردانی پبلک تک محدود نہ رہی بلکہ گورنمنٹ نے بھی علم دوست ہونے کا ثبوت دیا اور اقبال کو معزز خطاب "سر" سے سرفراز کیا۔

ایک عرصہ سے ڈاکٹر اقبال کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک طویل علالت کے بعد اردو کے اس مایۂ ناز شاعر کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ ان کی موت سے ملک کو کئی حیثیتوں سے نقصان پہنچا۔ لیکن انہوں نے اتنا گہرا نقش چھوڑا ہے کہ موجودہ نسل کے بہت سے شاعر اور ادیب انہی کے یہاں سے اپنی شمع روشن کرتے ہیں۔

اقبال اُردو کے ان شعراء میں ہیں جو مغربی خیالات سے متاثر ہو کر اردو میں کامیابی کے ساتھ نئے مضمون کو جگہ دیتے ہیں۔ اور فلسفیانہ تخیل سے مضمون کو نہایت بلند و شاندار بنا دیتے ہیں۔ اپنے عمیق مشاہدے سے مناظرِ قدرت مثلاً چاند، تارے، وغیرہ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی انہوں میں سے ہیں۔ اس رویہ نے اردو شاعری کو ایک نیا میدان دے دیا ہے۔

اقبال نے اردو شاعری میں نہ صرف خیالات کا اضافہ کیا بلکہ نئی اور عمدہ تشبیہوں سے بھی چمن اُردو کو شاداب کرنے کی کوشش کی ہے فارسی کی ترکیبوں سے کلام میں زور پہنچاتے ہیں کبھی کبھی الفاظ ثقیل ہو جاتے ہیں۔ مگر زبان میں جب سادگی پیدا ہو جاتی ہے تو بہت زیادہ پُرلطف ہو جاتی ہے

منظر نگاری میں ان کا قلم کسی اچھے مصوّر کے قلم سے کم نہیں ہے۔ جو منظر لکھتے ہیں نہایت دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے اشعار میں الفاظ کی ترتیب اس خوبی سے ہوتی ہے کہ ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی وہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان سے بھی رموز خداوندی کا کوئی خاص مقصد بیان کر جاتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کی شاعری میں بڑی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ "بانگ درا" اور "بال جبریل" کے مصنف میں نہ صرف انداز بیان کے لحاظ سے بڑا فرق ہے بلکہ تخیل اور تصوّر کے لحاظ سے بھی بال جبریل، ضرب کلیم، اور ارمغان حجاز میں نظموں کا اختصار، تمہید کی کمی اور خیال کی گہرائی ہمیں بغیر متوجہ کئے نہیں رہ سکتی وہ اقبالؔ جنہوں نے ہمیں بانگ درا کی رنگینیوں میں غرق کر دیا تھا آہستہ آہستہ تلوار کی تیزی نشتر میں بھرنے لگے۔ اس اختصار نے ان کے فکر کی دنیا بھی کسی قدر محدود کر دی۔ اِدھر ان کے انتقال کے بعد سے اُن پر نہ جانے کتنی کتابیں نکلی ہیں نہ جانے کتنے رسالوں نے "اقبال نمبر" شائع کئے ہیں۔ لیکن ان کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے پوری طرح تنقید نگاری کے فرائض انجام نہیں دئے ہیں۔ بلکہ اقبالؔ کی عظمت کا احساس اپنے اوپر طاری کر لینے کے بعد انہیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک دو مضمون ایسے بھی دیکھنے میں آئے جو دوسری جانب انتہا پر ہیں۔ ان کے متعلق متوازن رائے غالباً اب قائم کی جائے گی

حسرت موہانی

نام سید فضل الحسن ہے اور حسرت تخلص لیکن تخلص اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ بہت کم لوگ نام سے واقف ہیں چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

جب سے کہا عشق نے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

آپ ضلع اناؤ قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جہاں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن علم و ادب کی آخری منزل کے لئے علی گڑھ میں قیام کرنا پڑا اور وہیں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ان کی ذہنی تربیت کی نشو و نما زیادہ تر اسی سرزمین پر ہوئی۔ کچھ عرصہ تک ان کا رجحان بیشتر علمی ادبی خدمات کی طرف رہا مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے اس وقت سے پوری توجہ کے ساتھ یکسو ہو کر علمی خدمات نہیں کر سکے مگر پھر بھی غزل گوئی میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند و امتیازی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اردو کی موجودہ غزل کو نکھارنے اور سدھارنے میں آپ نے بڑا کام کیا ہے بے کیفی کو دور کر کے تغزل کو تیز کرنا آپ کا خاص کارنامہ ہے۔

حسرت، لکھنؤ کے مشہور شاعر تسلیم کے شاگرد تھے جن کو نسیم دہلوی سے تلمذ تھا اور وہ مومن کے خاص شاگرد تھے۔ حسرت کو قدیم استادوں کے کلام سے فطری شغف تھا چنانچہ قدما کی تقلید کا اثر ان کی طبیعت میں کئی لحاظ سے نمایاں ہے۔ ساقی و پیمانہ شمع و پروانہ، گل و بلبل وغیرہ

اُن کے خاص موضوع کلام تھے کبھی کبھی پرانے لوگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں بھی کہتے تھے۔ قریب قریب ہر ردیف پر الف سے لے کر ی تک طبع آزمائی کی ہے خواہ ایک ردیف میں ایک ہی غزل کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بعض بعض پرانے الفاظ بھی روا رکھے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً "دیجیو، آن پہنچے، یارے"، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کلام الجھاؤ اور بیکار باتوں سے پاک ہے۔ صفائی۔ شیرینی خاص طور پر ان کے یہاں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں۔

ابتذال اور مکروہات کو حسرت نے قریب قریب بالکل نہیں آنے دیا اشعار میں درد، دائر کے ساتھ پاکیزگی خیال کا زیادہ لحاظ رکھا ہے ساتھ کا کلام نہ تو سراپا یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش و نشاط کی محفل اگر آپ کو ان کے اشعار میں دکھ درد کا ذخیرہ ملے گا تو مسرت و شگفتگی بھی جابجا نظر پڑے گی۔ جس کی وجہ سے طبیعت اُکتا نہیں سکتی ذہنیت کے لحاظ سے حسرت زاہد خشک نہیں ان کے کلام میں رنگینی بھی ہے۔ لیکن کہیں کہیں شوخی متانت کے جامہ سے باہر ہو گئی ہے۔

حسرت کو زبین کے انتخاب کا خاص ملکہ تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں روانی اور شگفتگی بہت پیدا ہو جاتی ہے، بول چال کا بھی کافی لطف رہتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے عام طور سے ملائم اور عام فہم لفظوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی فارسی کی ایسی ترکیبیں بھی لاتے تھے جو بعض لوگوں کے نزدیک پسندیدہ نہیں غالباً یہ غالب کی تقلید کا اثر ہو۔ دل شدگان خود فراموش، وجہ نومیدی بسیار۔ فریاد ز دستِ عشق۔ باہزاراں آرزو وغیرہ

جا بجا ان کے اشعار میں ہیں۔ جہاں کہیں کلام میں برجستگی ہے وہ نہایت ہی لطیف و دلکش ہے۔ مومن کی طرح اکثر اشعار میں تھوڑی سی ایسی پیچیدگی پسند کرتے ہیں جو طبیعت میں اُلجھاؤ نہ پیدا ہونے دے ۔ بلکہ معنویت ولطف زیادہ کردے۔

حسرت نے غزل کو محض حُسن وعشق کی واردات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اور جس عنوان کا خیال ان کے دل پر اثر کرجاتا اس کو وہ غزل میں جگہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ ان کے یہاں دوستوں کا شکوہ احباب کا ماتم سیاسی و مذہبی عقائد وغیرہ سب ہی کچھ پائیں گے۔ ان سب میں جہاں کہیں ملکی معاملات کا تذکرہ علانیہ آگیا ہے وہاں زور توضرور ہے مگر شعریت کی کمی تاثیر کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ لیکن اس قسم کے اشعار بہت کم ہیں۔ حسرت ان چند مخصوص شعراء میں ہیں جو غزلوں میں تغزل کا بہت خیال رکھتے تھے یہ خصوصیت اُن کے کلام کا امتیازی پہلو ہے۔

حسرت تمام عمر سیاست سے دلچسپی لیتے رہے مگر تعجب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی مستقل سیاسی خیالات کا اظہار نہیں کیا اس کی وجہ یا تو تغزل سے بے پناہ اُنس ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ سیاست کو انہوں نے شاعری کا اتنا اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بناکر کچھ کہتے ۔

حسرت کا انتقال ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو ہوا۔

فانی بدایونی

شوکت علی خاں نام ہے فانی تخلص ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو ہوئی آبا و اجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ میں آپ کے جدِّ امجد نواب بشارت خاں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کی۔ موصوف صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ ان کی جائداد ایک سو چوراسی مواضعات معافی پر مشتمل تھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ بھی باقی نہ رہا۔ فانی کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں نے اپنی قوت اور قابلیت کے بل پر عزت و آبرو کی زندگی بسر کی آپ محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ مگر ملازمت کو غلامی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کوئی آزاد پیشہ اختیار کرے۔ چنانچہ انہوں نے فانی کو وکالت کے امتحان کے لئے مجبور کیا۔

فانی نے انٹرنیس تک بدایوں میں تعلیم حاصل کی بریلی کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد اور محمڈن کالج علی گڑھ میں ایل ایل بی کی تکمیل کی لیکن وکالت کے پیشے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف باپ کے مجبور کرنے پر آپ نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا طبیعت اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ پہلی غزل ۱۸۹۰ء میں کہی تھی ان کے والد ہمیشہ شعر کہنے سے روکا کرتے تھے۔ چنانچہ جو کچھ فانی کہا کرتے تھے وہ نہایت پوشیدہ طور پر۔ اس سے ظاہر ہے کہ فانی کو کسی صاحب فن سے مستفید ہونے یا اصلاح لینے کا موقع بھی نہ مل سکتا تھا۔ ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت داغ سے اصلاح لینی چاہی مگر یہ راز بھی افشا ہوا

اور پھر کبھی والد کے خوف سے کوئی غزل اصلاح کے لئے بھیجنے کی جراءت نہ ہوئی۔ اصلاحِ شعر کا کام آپ کو خود اس مذاقِ شعری سے لینا پڑا۔ جو آپ کی فطرت میں ودیعت تھا۔

۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۸ء تک جو نام تھا وہی تخلص بھی تھا مگر ۱۸۹۹ء میں ایک حادثۂ جانکاہ سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنا تخلص فانی رکھا فانی نے تین دیوان، تین مثنویاں جن میں سے ایک بہ زبان فارسی اور دو بہ زبانِ اردو تھیں۔ اور دو ڈرامے جن کے پلاٹ مشہور انگریزی ڈراموں سے اخذ کئے گئے تھے لکھے مگر عدم توجہی سے وقتاً فوقتاً ذخیرہ تلف ہوتا رہا۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ "باقیاتِ فانی" کے نام سے موسوم ہے۔

اسی ضمن میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب فانی شعر سے بیگانہ ہو گئے تھے یہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۷ء کا زمانہ ہے یعنی پورے گیارہ سال شعر نہیں کہے۔ بعد ازاں احباب کے سخت اصرار سے مجبور ہو کر پھر روشِ قدیم اختیار کرنی پڑی[1]۔

فانی کے کلام میں یاس و حزن و ملال اس کثرت کے ساتھ ہیں کہ باقیاتِ فانی کا مقدمہ لکھتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "غالب کی مانند فانی کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ان کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی ان کو غالب کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ مگر بہر حال الفضل للمتقدم، علاوہ

---

[1] ماخوذ از نیرنگِ خیال فروری ۱۹۲۷ء

برین وہ غالب کی مانند متنوع نہیں یعنی انہوں نے غالب کی طرح زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطۂ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے"

باقیات فانی کے بعد جدید و قدیم رنگ کے کلام کا ایک نیا مجموعہ "عرفانیات فانی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی شاعری کی وہی خصوصیات ہیں جو باقیاتِ فانی میں پائی جاتی ہیں۔ قطعات و رباعیات میں البتہ ہمہ گیری و جدّتِ بیان سے کام لیا گیا ہے۔

فانی کے کلام کی ایک خاص خوبی شدّتِ اثر اور معنویت ہے ان کے دیوان کا کوئی صفحہ ایسا نہ ملے گا جس میں دو چار اشعار قابل قدر نہ مل جائیں فنی اعتبار سے وہ شعر کو اتنا سجاتے اور بناتے ہیں کہ تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے اور موجودہ دور کے بہت کم غزل گو شعرا ان کے قریب دکھائی دیتے ہیں

ناصری

آپ کی جائے ولادت لکھنؤ ہے جہاں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے چونکہ طبیعت میں خداداد ذہانت اور غیر معمولی سمجھ تھی لہذا چودہ برس کے سن میں اردو، فارسی، عربی کی تعلیم سے ایک بڑی حد تک فراغت حاصل کر لی۔ لیکن تمام عمر مطالعۂ کتب سے استعداد علمی کو بڑھاتے رہے۔ انگریزی تعلیم کا بھی بچپن ہی سے شوق ہوا چنانچہ سن ۱۹۰۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور سن ۱۹۱۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے خانگی طور پر ایف اے کا

امتحان پاس کیا اسی سن میں مُلا کا امتحان بھی پاس کر لیا اس کے دوسرے سال فاضل کے امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کر لی لیکن اس سے پہلے ہی یعنی سنہ ۱۹۰۷ء میں اپنی قابلیت کی وجہ سے تھو برن کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے اور وہیں سے پڑھتے پڑھاتے سنہ ۱۹۱۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کر لیا۔ اس کے ایک سال بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی و فارسی مقرر ہوئے اور یہاں سے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا۔ چھ برس تک الہ آباد میں رہ کر انہوں نے نہ صرف عربی و فارسی کی خدمت کی بلکہ اردو کی ترقی میں بھی ہمہ تن کوشاں رہے۔

کالج اور اسکولوں میں مشاعروں کا رواج دے کر لوگوں میں مذاق سلیم پیدا کرنے کی کوشش کی اردو شاعری کے عیوب و محاسن کو سمجھا کر ایک شائستہ اور صحیح راستہ طلباء کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا جس کا اثر اب تک باقی ہے سنہ ۱۹۲۲ء میں الہ آباد سے ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول بجنور میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر کے ہوا۔ وہاں سے دو سال کے بعد ضلع بارہ بنکی کے گورنمنٹ اسکول میں تشریف لے گئے۔ سنہ ۱۹۲۹ء تک وہیں رہے بعد ازاں علی گڑھ تبادلہ ہو گیا۔ اور وہیں سنہ ۱۹۳۱ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوتے۔

زندگی میں اپنے ذاتی اخلاق اور علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اتنے ہر دل عزیز تھے کہ اس صوبہ کی مختلف علمی درسگاہوں میں بہ حیثیت ممبر کے منتخب ہوتے رہے ان کی قیمتی رائے سے الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیاں فیض یاب ہوتی رہیں۔ انٹرمیڈیٹ بورڈ تو جب سے وجود میں آیا تھا، ہمیشہ ان کی ذات سے مستفیض ہوتا رہا اور گورنمنٹ نے ہمیشہ ان کو

اس بورڈ کا ممبر نامزد کیا۔

ناصری کی قابلیت صرف اسلامی علوم تک محدود نہ تھی بلکہ جرمن، عبرانی فرانسیسی زبان سے بھی ایک بڑی حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف عربی اور فارسی کے ادیب تھے بلکہ اردو کے بھی ایک زبردست انشاء پرداز شاعر اور محقق تھے۔

ناصری کی ایک خاص خدمت آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتی وہ پرانے اسکول اور نئے اسکول کو ایک منزل پر جمع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ان کے کلام میں اگر پرانے وقت کی خصوصیات یعنی زبان کی صفائی شعر کی مضبوطی اور آرٹ موجود ہیں تو موجودہ زمانے کی شائستگی بلندئ خیالی اور حقیقت بھی پائی جاتی ہے

یہی نہیں کہ ناصری نے درس و تدریس کا سلسلہ اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنالیا تھا بلکہ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ متعدد کارنامے آپ کی یادگار ہیں منجملہ چند کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سرور انبیاء

۲۔ مخزن الفوائد

۳۔ حرارت

۴۔ زینتِ وحش و طیر (جانوروں کے متعلق ہے)

۵۔ صنادیدِ عجم (تاریخ زبانِ فارسی)

۶۔ منصور کی سرگزشت

۷۔ دیوان حصہ اول (نذرِ احباب)

۸۔ دیوان حصہ دوم

۹۔ مجموعۂ قصائد

اخلاق و عادات

جن لوگوں کو ناصری کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ کبھی کسی شخص کا اُن کے پاس سے مغموم ہو کر اُٹھنا تو کیا معنی بلا مسرور ہوئے جانا بھی مشکل تھا۔ آپ کے حلقۂ احباب میں ہر مذہب و ملّت کے لوگ یکساں بلا تکلف شریک ہوتے اور خوش ہو کر جاتے اپنے شاگردوں کو اولاد سے کم نہ سمجھتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا ان کی فلاح کی صورت پیدا کیا کرتے

ناصری کو خود نمائی و خود ستائی سے ہمیشہ تنفر رہا یہ جذبہ کبھی کبھی ضرورت سے بھی زیادہ بڑھ جاتا تھا یہاں تک کہ اپنا کلام بھی شائع کرنا عار سمجھا کئے لیکن جب فارسی کا دیوان چوری گیا تو احباب کے سخت اصرار سے اردو کا کلام جمع کرنے لگے کیونکہ اردو کا دیوان بھی ضائع ہو چکا تھا جس کی صورت بقولِ پروفیسر سید ضامن علی صاحب یہ تھی کہ "کچھ غزلیں کتابوں میں رکھی ہوئی ملیں کچھ قدر شناس احباب کے پاس نکلیں اور کچھ حافظہ نے پیش کیں ان سب کو اکٹھا کرنے کے بعد گم شدہ کلام کی جانب توجہ ہوئی جو اشعار یاد آئے ان کو قلمبند کر کے اس مجموعہ کو مرتب کیا[1] افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ ابھی یہ مجموعہ مسودہ کی صورت میں پوری طرح صاف بھی نہ ہو چکا تھا کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ ان کی وفات کے بعد نذرِ احباب کے نام سے دو حصّوں میں کلیاتِ ناصری نہایت خوبی کے ساتھ انڈین پریس الہ آباد میں چھپا"

ناصری صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو پیارے صاحب رشید سا

---

[1] تمہید دیوانِ ناصری

کامل استاد نصیب ہوا۔ ان کی رہنمائی سے ناصری صاحب کے کلام میں صفائی اور سادگی خاص طور سے آئی۔

ناصری نے اپنے اسلوبِ بیان میں اصولِ بلاغت کا خاص طور سے خیال رکھا ہے اکثر اشعار میں کیف کا کوئی ایسا جزو بیان کرتے ہیں جس سے اثر و نتیجہ بہ ظاہر اگرچہ پوری طرح بیان نہیں ہوتے مگر تصور طرح طرح کے نتائج خود نکال کر روح کو کیف سے سرشار کر دیتا ہے۔ کبھی "خدا جانے"، کبھی "الاماں"، کبھی "الوداع"، کبھی "معاذ اللہ"، یا اس قسم کے ٹکڑوں سے ان کے کلام میں معنویت کافی پیدا ہو جاتی ہے۔ سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ اور لطف اٹھاتے ہیں۔

عشق کی شدت وانتہائی کیف کو پورے مزے کے ساتھ معمولی الفاظ میں بیان کر دینا اُن کا معمولی جوہر ہے۔ وہ فارسی کے اَدق الفاظ اور ثقیل ترکیبوں سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں لیکن فارسی کی پُراثر ترکیبیں اور دلکش الفاظ کے استعمال سے کبھی انہوں نے دریغ بھی نہیں گیا۔ چنانچہ تا بہ زندانِ جفا۔ نظر فریبیٔ دردِ جگر، کاروان دل بیتاب، وغیرہ سے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے تغزل اور روزمرّہ ان کے کلام کے دل و جان ہیں۔ نواب جعفر علی خاں صاحب اثر ایک جگہ مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ "درد بھرے الفاظ میں ماجرائے عشق بیان کرنا ان کی شاعری کا نصب العین تھا اور بیشتر حصہ کلام تاثیر کا طلسم ہے"۔

وہ قدماء کے اصول کی تقلید کرتے تھے۔ مگر کورانہ نہیں۔ پیچ در پیچ استعارے اور تشبیہوں کو ترک کر کے پاکیزہ و دلفریب پھولوں کو چن لیتے تھے۔ محاورات کے صرف میں ان کو پورا عبور تھا۔ جہاں کہیں استعمال

کرتے ہیں۔ ایک خاص خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو چاہے آپ قدما کی تقلید کہئے یا الفاظ کی دلکشی کہ معشوق کو مری جان، اور صنم کہہ کر اب تک یاد کیا کرتے تھے۔

ناصری کا کلام حسرت و حرماں کا آئینہ ہے مگر اس میں جھوٹ موٹ کی ہائے وائے نہیں ہے بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے جو سننے والے کے تارِ رگِ جاں کو مضراب سے چھیڑ دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو فلسفۂ حزن کا ماہر ہے نفسیات کے راز و لگداز نغموں میں دہرا رہا ہے۔ اور سننے والوں کے جسم در روح میں سنسنیاں بھر رہا ہے کہیں کہیں خوشی کی ترنگ بھی ہے مگر اس کا انتشار صرف اس قدر ہے کہ الم کی اور اجاگر ہو جائے جس طرح راگ کی دل آویزی سرگم سے بڑھ جاتی ہے۔

ناصری نے اپنی زندگی ہی میں شامِ جوانی و صبحِ پیری کو موت کا پیام سمجھا تھا چنانچہ ان کی رباعیوں اور غزلوں میں اکثر آپ کو اس قسم کے اشعار ملیں گے کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قبل از وقت موت کا انتظار کر رہے تھے ۵۴ برس کے سن میں فالج کے عنوان سے علی گڑھ میں موت کا پیام آ ہی گیا میں نے ایک مرثیہ اور اس کے ساتھ تاریخ وفات کہی۔

ناصری خلدِ بریں کو پہنچے

۱۳	ھ	۴۹

ضامن

آپ کی ولادت ۱۸۸۸ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی۔ آپ نے علوم مشرقیہ کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی آپ کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا البتہ انگریزی تعلیم کے لیئے دوسرے شہروں کو بھی جانا پڑا۔ چنانچہ ایف۔اے آگرہ سے پاس کیا اور بی۔اے وایم۔اے کی ڈگری الہ آباد سے حاصل کی۔

ضامن صاحب کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رہی ۱۲ برس کے سن سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ میر علی عباد صاحب نیساںؔ الہ آباد میں بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ ضامن صاحب کے جوہر دیکھ کر خود بخود اصلاح کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ استاد کی شفقت اور طبیعت کے خداداد جوہر نے کلام میں پختگی اور دلکشی پیدا کر دی۔ نیساںؔ کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ آپ کے کلام میں ایک خاص تبدیلی شروع ہو گئی جس کی طرف آپ خود ارشاد فرماتے ہیں :۔

حضرت نیساںؔ کے دم تک لطف تھا اس رنگ کا

اب کہو ضامن غزل اس میں جو رنگِ عام ہے

گویا اس وقت سے آپ نے رنگِ ناسخؔ کو ترک کر کے صفائی کے کوچے میں قدم رکھا۔ آپ کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشہبِ طبع شاعری کے ہر میدان میں رواں ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مخمس سلام وغیرہ پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں۔

الفاظ کے انتخاب، محاورات کے برمحل صرف فارسی تراکیب کی دلآویز آمیزش نے آپ کی شاعری میں ایک خاص مزہ پیدا کر دیا ہے تشبیہات اور استعارات کی زیادتی سے غزل میں قدیم رنگ کی جھلک بھی آجاتی ہے۔

آپ کے قصائد میں تخیل کی پرواز اور معنویت کی فراوانی ایک خاص رفعت پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ سوداؔ، انیسویں صدی کا ایک زبردست شاعر ہے اور شاید یہی سوداؔ کی محبت تھی جس نے قصائد میں آپ کو اس باکمال شاعر کو اپنا ہادی بنانے پر مجبور کیا۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

چونکہ آپ کے کلام کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے جو آسانی سے ہر شخص کو فی الحال دستیاب نہ ہو سکے گا لہذا نہایت اختصار کے ساتھ چند غزلیں اور متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں

دنیا میں پھر وہ کام کے قابل نہیں رہا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

اس رشکِ گل نے بزم میں الٹی ہی جب نقاب
گلشن میں پھر ہجومِ عنادل نہیں رہا

رخنے نگاہِ قیس نے اتنے بنا دیئے
حاجب نظر کا پردۂ محمل نہیں رہا

کشتئِ اشک آ کے کنارے ہوئی تباہ
ساحل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

ٹکرائی جب ہے کشتیٔ طوفاں زدہ کوئی
خاموش اس گھڑی لبِ ساحل نہیں رہا
خوں زیبیوں کا ذکر ہی کیا ہے کہ عمر بھر
زیرِ نیامِ خنجرِ قاتل نہیں رہا

جھکا ہے سر در پہ اک صنم کے زباں پہ لیکن فغاں نہیں ہے
نماز پڑھتا ہوں اہل دل کی کہ جس میں بانگِ اذاں نہیں ہے
عبث ہے دیر و حرم کا جھگڑا وہ ہر جگہ ہے کہاں نہیں ہے
عیاں ہے جتنا وہ چھپنے والا نظر سے اتنا نہاں نہیں ہے
تری نگاہوں نے لیا دل مگر خلش درد کی ہے باقی
طلسم طرفہ ہے یہ محبت مکیں تو ہے یاں مکاں نہیں ہے
پڑے ہوتے ہیں ہزار ہا دل کہ جیسے چھٹکے ہوئے ہوں تارے
یہ کون کہتا ہے کوئے جاناں زمیں ہے آسماں نہیں ہے
پڑے ہیں سب چین سے گھروں میں کوئی نہیں ہو ستانے والا
عدم عجیب ملک ہے کہ جس میں زمیں تو ہے آسماں نہیں ہے
ضرور دیکھی ہے تیری صورت ہوئی جو یہ ناصحوں کی حالت
سب اس طرح سے ہیں چپ کہ گویا کسی نے منہ میں زباں نہیں ہے
کلی کلی مسکرا رہی ہے ترانے قمری بھی گا رہی ہے
تمہیں کو کیا ہو گیا ہے ضامنؔ جو بندۂ آہ فغاں نہیں ہے

رخ کی زردی ضبطِ الفت سے فزوں ہوتی گئی
رازِ دل جتنا چھپایا اتنا ہی افشا ر ہوا

کھل جائے حال آپ ہٹادیں نقاب اگر
وہ اور ہوں گے غش جنہیں آتا ہے ہم نہیں
کرتی ذلیل وخوار ہے حاجت فقیر کو
داغِ برص ہے دست گدا میں درم نہیں

شمع حیات ساتھ لئے ساری زندگی
گرداں تلاشِ موت میں ہم کو بکو رہے

میں اب دل کو نثار بانی بیداد کرتا ہوں
بڑی دولت تھی جس کو عشق میں برباد کرتا ہوں

شوق دیدار رخ یار الٰہی توبہ
آج ہم غیر کا پیغام لئے جاتے ہیں

آثر

١٢ر جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے بی۔اے پاس کیا اور ۱۹۱۹ء میں عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہوئے۔

آثر کے اکثر بزرگوار اپنی قابلیت اور کمال کی وجہ سے سربلند و ہردلعزیز رہے شعر و سخن کا بھی چرچا عرصے سے گھر میں رہا۔ آپ کے والد بزرگوار حکیم مرزا افضل حسین خاں صاحب بھی اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے۔

آثر نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ بچپن ہی سے شعر و سخن کا مذاق پیدا ہو گیا تھا لیکن شعر کہنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ جوانی میں شعر کہنا شروع کیا۔ اب آپ کا مجموعۂ "بہاراں" ایک خاص وقعت کے ساتھ دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے۔

آثر کے اشعار کو اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کہنے والا دربارِ عشق کا بہت بڑا رمز شناس و نکتہ داں ہے جو اکثر معمولی الفاظ و اشارہ میں ایسی تہہ کی باتیں بیان کر جاتا ہے کہ سمجھنے والے سمجھتے ہیں اور بےخود ہو جاتے ہیں۔ آپ جذبات کی تصویر الفاظ میں اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ احساس کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ روزمرہ و صفائی زبان کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے جس کی وجہ سے کلام میں دلکشی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ نرم و شیریں الفاظ صرف کرتے ہیں، غالباً یہ خوبی اس وجہ سے اور زیادہ ہو گئی ہے کہ آپ کو میر کے کلام سے نہایت درجہ شغف ہے اور اکثر اسی بزرگ کی تقلید کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ ہندی الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر بہت مزے کے ساتھ، مدبھری آنکھ، بول بالا، روگ وغیرہ جو فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہیں

۱۹۲۷ء میں آثر کی نظموں کا مجموعہ "رنگ بست" شائع ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو جتنی غزل کہنے پر قدرت ہے۔ اتنی ہی مہارت نظموں میں بھی ہے۔ مناسب الفاظ کے ساتھ تسلسل، جوش اور زور ان نظموں کی خصوصیت ہے۔ موجودہ زمانے میں آثر کی وہ ذات ہے۔ جو پرانے رنگ کی غزلوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسی نظمیں لکھتے ہیں جن میں جدید و قدیم طرزِ سخن کی خصوصیات یکجا نظر آتی ہیں۔

زبان و بیان کے لحاظ سے آثر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تقلید نے ان کو میر کے قریب پہنچا دیا ہے۔

آثر نثر میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہیں جسے تنقید کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری زبان و بیان کی دیکھ بھال سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس معرکہ میں بڑی کاوش و نکتہ رسی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'چھان بین' شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں دوسری کتاب میر انیس کی مرثیہ نگاری ہے۔

نام جلیل حسن ہے۔ مولوی حافظ عبد الکریم کے بیٹے ہیں۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ۲۰ برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ عرصہ دراز تک بلکہ امیر کے آخر زمانہ تک دفتر امیر اللغات کے سکرٹیری رہے۔ اپنے بزرگ استاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے اور ان کے انتقال کے بعد وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ اب آپ امیر کے بہترین شاگرد خیال کئے جاتے ہیں۔ آپ کی فارسی، اردو کی قابلیت مسلم الثبوت ہے۔ عروض و قوافی میں خاص دخل ہے۔ سلطنتِ آصفیہ نے بجا قدر دانی کی ہے اور

آپ کو فصاحت جنگ کا خطاب دیا ہے۔

جلیل کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت خوبی کے ساتھ آپ اپنے استاد امیر مینائی کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ انہی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ وہی شوخی وہی سادگی جو امیر کے کلام کا جوہر تھی۔ یہاں بھی ایک عام فہم صورت میں کچھ اس طرح چمکی کہ جلیل کی غزلیں ہر طرف چشم زدن میں پھیل گئیں۔ ان کے کلام کی اس مقبولیت نے اردو اور صحیح اردو کا ذوق عوام الناس میں پیدا کر دیا۔ اردو زبان ہمیشہ اس کی رہین منت رہے گی۔ ان خوبیوں کے علاوہ جلیل کی عام مقبولیت کے دو خاص وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) غزلوں میں نشست الفاظ سے ایسا ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا یہ غزلیں موسیقی ہی کے لئے کہی گئی تھیں۔

(۲) حسن و عشق کے اظہار میں اس قدر سلاست اور روزمرہ ہے کہ خود بخود دل کھنچ جاتا ہے۔

اس طرح جلیل نے شاعری کو عوام الناس کے لئے بہت کچھ دلچسپ بنا دیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں شعر و شاعری کی وہ بلندیاں نہیں جو شاعری کو دوسرے فنون پر فوقیت دیتی ہیں اور شاعری کا رتبہ عوام سے بلند تر کر دیتی ہیں۔

ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی شاعرانہ عظمتوں کا پتہ چلتا ہے اکثر اخلاقی اور ناصحانہ مضامین کو انھوں نے غزل میں اس طرح جگہ دی ہے کہ عوام و خواص دونوں یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔ صوفیانہ رنگ بھی جا بجا ان کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ ان کا خاص مذاق نہیں۔ جلیل کا اصل رنگ جذبات عشق اور اظہار الفت میں زیادہ نمایاں ہے گویا تغزل میں ان کو خاص ملکہ ہے

جس کو انھوں نے اپنی سادگی اور دلکش انداز بیان سے سراہا، لطف زبان سے دلآویز بنایا، محاورات کے زیور سے آراستہ کیا۔ غرض جلیل کا کلام سادہ اور زود اثر ہے مجموعۂ کلام "تاج سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جوش

آپ لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو عرصہ سے علمی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور اس حیثیت سے سب سے پہلے فقیر محمد خاں گویا کا نام آتا ہے جنھوں نے ابتدا میں تیغ آبدار کی بدولت نواب امیرالدولہ بہادر کی فوج میں رسالداری حاصل کی اور تیغ زبان کے جوہر میدانِ ادب میں دکھا کر ایک دیوان اور ایک نثر کی مشہور کتاب بستانِ حکمت یادگار چھوڑی۔ گویا کے فرزند ارجمند محمد خاں احمد بھی صاحب دیوان تھے۔

شبیر حسن خاں جوش گویا کے پڑپوتے ہوتے ہیں۔ آپ ۱۸۹۴ء میں ملیح آباد (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ خداداد ذہانت و سلیم الطبعی اور فطری ذوق نے راہ راست سے کبھی قدم ہٹنے نہ دیا۔ علمی مذاق کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہا۔ شاعری کا چسکا بچپن ہی سے رہا۔

جوش کچھ عرصہ تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ادبی نقاد کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ یہ وہ اہم خدمت ہے جس پر کبھی طبا طبائی بھی مامور تھے۔ حیدرآباد میں آپ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک رہے۔

جامعہ عثمانیہ سے الگ ہو کر آپ نے دہلی سے ایک رسالہ "کلیم" شائع کرنا

شروع کیا جو باوجود اپنے ممتاز اوصاف کے بھی زیادہ نہ چل سکا۔

"کلیم" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ شاعری کے جوش میں نثر نگاری کی بھی بے نظیر صلاحیت موجود ہے۔ دلیل کے ساتھ تنقید اور اثر کے ساتھ زور ہر جگہ نمایاں ہے۔ صرف جذبات تک جوش کی دنیا محدود نہیں بلکہ اپنی صحافت نگاری سے جوش نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ان کو سیاسیات، اقتصادیات وغیرہ پر بھی کافی عبور ہے

جوش کا ادبی کارنامہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) غزل۔ (۲) نظم اُن کی مستقل نظمیں اُن کی حیاتِ جاودانی کا ذریعہ ہو جائیں تو عجب نہیں۔ اس لئے کہ دلکشی جو قبول عام کا شرف دلواتی ہے۔ ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ خیالات کی تہہ میں ڈوب کر مضامین کے نہایت آبدار موتی نکالتے ہیں۔ طرز بیان میں جدت ہے فارسی کی ترکیبوں کا صرف مصرعوں میں اس خوبی سے ہوتا ہے کہ تمام کلام میں جان آ جاتی ہے اور ایک خاص لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوش تشبیہات کے خاص ماہر ہیں علاوہ اس کے کہ ان کی تشبیہات میں مقامی اثر بھی ہوتا ہے وہ زیادہ تر ان چیزوں کو تشبیہات کے لئے چنتے ہیں جو ہمارے مشاہدے میں روزمرہ آیا کرتی ہیں اور اپنی معنویت و برمحل استعمال کی وجہ سے شعر کی جان بن جاتی ہیں۔ بعض وقت جوش تشبیہات ہی سے پوری فضا کو ایک مکمل تصویر بنا دیتے ہیں۔ اور متعدد تشبیہات و استعارات سے مفہوم کو اتنا واضح اور دلکش کر دیتے ہیں کہ اُردو ادب میں کوئی دوسرا شاعر ان کا اس معرکہ میں حریف نہیں۔

ان کے کلام میں ایک اور خاص بات نظر آئے گی کہ جوش اور زور کا دریا ہر جگہ موجزن ہے جس کی وجہ سے پڑھتے وقت ایک خاص امنگ دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے کلام سے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور اقبال کی طرح حسنِ عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلاکر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں مگر بعض وقت لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے عیوب دیکھنے کے لئے آنکھوں کو ضرور استقلال کی عینک کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی شیریں کلامی تلخ نوائی سے بدل جاتی ہے۔ خواہ اسے ان کے شدید احساسات پر محمول کیجئے یا خواب گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھئے۔

مناظر قدرت کی تصویر کشی کے وقت نیچرل حالت کا نقشہ جوش کے جذبات کی رنگ آمیزی میں کسی قدر دھندلا ہو جاتا ہے۔ ان کا پیمانۂ قلب جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ کائنات کے ہر ذرہ پر وہ جذباتی نگاہ ڈالتے ہیں۔ چاہے رات ہو ریل ہو یا "گاؤں کا بازار" نازک اندامانِ کالج سے خطاب ہو یا کسان، ہر نظم میں وہ اثر و کیف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے شاعری میں تاثیر ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن اصلی خدوخال پوری طرح صاف نظر نہیں آتے۔

جوش کے کلام کی یہ بھی امتیازی خصوصیت قابلِ قدر ہے کہ یاس و حرماں نصیبی بہت کم ہے۔ وہ بزدلی کو پاس نہیں آنے دیتے بلکہ اظہار افسوس کے بعد نخت و سست کہہ کر آخر میں ہمت افزائی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ موجودہ پستی کا علاج کیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ ہر مصیبت کے بعد خوشی آتی ہے۔ صرف ہوشیار ہو جانے کی ضرورت ہے۔ اردو میں اشتراکی شاعری کی بنا جوش سے پڑی جس میں مزدور پیشہ کی حمایت۔۔۔ سرمایہ داری کی مخالفت خاص موضوع ہے۔ بیباکی اور نڈر ان کے کلام کی جان ہے۔ معاشرتی یا سیاسی نظام پر نکتہ چینی کرتے وقت وہ نہ کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کی کانیاں کرتے ہیں نہ کسی مذہبی پیشوا یا جماعت کا۔ ہر ایک کی خامیاں بآوازِ بلند پکار کر بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا کلام زیادہ تر تنقیدِ حیات پر مبنی ہے۔ سماج کی خرابی

چاہے مذہب کی غلط ترجمانی سے ہو یا ذاتی اقتدار کی خام خیالی سے ہر ایک کی اصلاح کرنا وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں یہ خصوصیات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

جوش کی ایسی نظمیں بھی کافی دلکش ہیں جن میں تبلیغی انداز کے علاوہ حسن و عشق کے جذبات و واردات ہیں۔ ان میں واقعیت و اصلیت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ مگر جا بجا کسی قدر عریانی آجاتی ہے۔ مناظر قدرت اور دیہات کے بازار، کھیت، ریل وغیرہ کو سادگی و حقیقت کے ساتھ دلچسپ شاعرانہ انداز میں پیش کرنا جوش کا ایک خاص کارنامہ ہے۔

جوش کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں۔ محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں چونکہ وہ خود راہ محبت میں گم ہو چکے ہیں۔ اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ دل کی چوٹ ہوتی ہے۔ دماغ کی کاوش نہیں۔

جوش کے کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے متعدد ایڈیشن بھی نکل گئے ہیں۔ ان میں روح ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، فکر و نشاط، آیات و نغمات، عرش و فرش، سنبل و سلاسل وغیرہ ہیں۔

جوش عموماً اپنے کو مرحوم لکھتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ابھی بقید حیات ہیں قبل ازیں وہ سرکاری جریدہ "آجکل" دہلی کے مدیر اعلیٰ تھے۔ مگر اب مع اہل و عیال، ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے ہیں اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔

صفیؔ لکھنوی

نام علی نقی، اور تخلص صفیؔ ہے۔ آپ سادات میں سے ہیں، سلسلہ نسب حضرت امام زین العابدینؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سیّد نورالدّین شاہ مبارکؒ سلطان التمشؔ کے زمانے میں غزنی سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہیں بالائے حوضِ شمسی ان کا مزار ہے۔ سید احسان علی صفیؔ کے پردادا جاٹوں کے مظالم سے تنگ آکر فیض آباد چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کی نصیرالدین حیدر کے زمانہ میں سیّد سلطان حسین صفیؔ کے دادا فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مقیم ہوئے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں سید فضل حسین صفیؔ کے والد بزرگوار شاہزادہ موصوف کے رفیق خاص مقرر ہوئے۔

صفیؔ ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے دس بارہ سال کے سن تک درسیات فارسی و عربی کی تکمیل مولوی نجم الدّین کاکوروی اور شیخ حافظ علی جہروی سے کی، بارھویں یا تیرھویں برس نائٹ اسکول میں انگریزی شروع کی اور سال بھر کے بعد کیننگ کالیجیٹ اسکول میں داخل ہوکر انٹرنس تک تعلیم انگریزی حاصل کی۔ اسی درمیان میں دو تین سال تک اکثر علوم معقول و منقول کا استفادہ اپنے خسر علامہ مولوی احمد علی اور اپنے چچا سید محمد حسین سے کیا۔ ۱۸۸۳ء سے ملازمت سرکاری میں داخل ہوئے اور محکمۂ دیوانی میں مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں ۴۰ سال کام کرنے کے بعد پنشن پائی۔

صفیؔ کی ذات ان لوگوں میں تھی جنھوں نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبّے سے پاک کیا اور ایک پاکیزہ اور کارآمد جامہ پہنا کر بازار اردو میں

پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے کلام میں نہ تو رعایت لفظی کی بھرمار ہے، نہ مبالغہ سے اشعار کا دامن گرانبار ہے اور نہ ابتذال سے داغدار بلکہ زیادہ تر پاکیزگی کے ساتھ صفائی، حقیقت، دلکشی تمام کلام میں نمایاں ہے۔ قصیدہ و رباعی مثنوی وغیرہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ انکا کلام دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک غزلیات کا اور دوسرا مستقل نظموں کا۔

غزل میں سب سے پہلی چیز جس کو جانِ غزل کہنا چاہیئے۔ وہ تغزّل ہے، صفی عاشقانہ مضامین جس صفائی اور پر درد طریقہ سے نظم کرتے ہیں۔ اس کی مثال اردو میں زیادہ نہیں ملتی۔ سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے، زبان میں بھی سادگی، خیال میں اور طرزِ بیان میں بھی سادگی ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان چیزوں میں کبھی عامیانہ پن نہیں آنے پاتا۔

محاورات اور تشبیہات کی خوبیوں سے کلام میں چاشنی اور دلکشی بڑھ جاتی ہے ان کی غزلوں کا امتیازی رنگ یہ بھی ہے کہ مغربی دل پسند مذاق کو اردو میں اس خوبی کے ساتھ سموتے ہیں کہ جس کے سبب سے نہ صرف ندرت پیدا ہوتی ہے' بلکہ اردو ادب میں خیالات کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اپنی غزلوں میں موجودہ زمانے کے گوناگوں مسائل اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ نہ تو اردو غزل کے لئے وہ بیانات بار ہوتے ہیں اور نہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

صفی کی زبان اتنی نرم اور شیریں ہے کہ پڑھنے والے کو ایک غزل کئی بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی۔ پھر اس میں بول چال کا لطف دل کشی میں اور چار چاند لگا دیتا ہے۔ ثقیل الفاظ کہیں نہ ملیں گے، فارسی کی ترکیبیں البتہ غزلوں میں موجود ہیں لیکن وہ مصرعوں کے سانچوں میں کچھ اس طرح ڈھالی جاتی ہیں کہ کسی وقت یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بالقصد لائی گئی ہیں۔ کلام کی پختگی، معنی آفرینی

کے ساتھ مل کر اشعار میں ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

نظم لکھنے کو تو سب ہی لکھتے ہیں مگر جب شعریت پیدا نہیں ہوتی تو نظم بجائے دلکش ہونے کے پڑھنے والوں کے ذہن پر بار ہو جاتی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں شاعر اور متشاعر کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے ابتدائی حصّہ میں نظموں کو ہر دلعزیز بنانے میں صفی کا بڑا حصّہ ہے

صفی کی نظموں میں اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ کہ دلکشی کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ شعر میں شگفتگی، بیانات میں خوش مذاقی تشبیہات میں جدّت، دل و دماغ کو اس طرح اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں جس طرح حسین صورتیں نگاہوں کو۔

صفی کی نظموں کے موضوع مختلف ہیں کہ اُن کی فہرست دینا طوالت سے خالی نہیں۔ بعض موضوع ایسے ہیں کہ جو شاید اردو ادب میں اس کے پہلے بہت کم تھے یا نہ ہونے کے برابر تھے۔ مختلف شہروں کے تاریخی مقامات کا دلچسپی کے ساتھ منظوم بیان اور ان کے تاریخی اور جغرافیائی حالات اور اس کے ساتھ عمارتوں اور مقامات کا ذکر اس خوبی کے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود اس کے یہ موضوع خشک ہیں مگر پھر بھی اتنے پُرلطف ہو جاتے ہیں کہ دلکشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے الہ آباد، بمبئی، جونپور وغیرہ کے متعلق نظمیں قابلِ دید ہیں۔ جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔

طولانی نظموں کی بدمزگی دور کرنے اور نظم کی دلکشی قائم رکھنے کے لئے جہاں کہیں تغزّل کا رنگ پیدا کرتے ہیں وہاں بڑی لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔ صفی کی نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ایسی نظموں کا مجموعہ "لختِ جگر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ صفی کی نظموں کا ذخیرہ صرف ایک فرقہ تک محدود

ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن سے کل ملک اور ہر قوم کے لوگ یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ملک کی بد قسمتی اور اہل وطن کی بربادی پر اکثر ماتم کرکے انھوں نے لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح بعض نظموں میں "اردو" کی بگڑی ہوئی حالت پر آنسو بہائے ہیں اور راہِ راست پر لانے کے لئے نہایت معقول مشورے دیئے ہیں۔

نظموں میں کبھی کبھی شگفتگی زیادہ کرنے کے لئے مزاح کا پہلو اس خوبی سے پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ تو ابتذال پیدا ہوتا ہے اور نہ متانت و سنجیدگی کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ دل و دماغ تازہ ہو جاتے ہیں۔ اب غالباً یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صفی نے مختلف موضوع پر طبع آزمائی کرکے اردو کے میدان کو وسیع کرنے کی خوبی کے ساتھ کوشش کی ہے۔

صفی کا انتقال ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ ان کی غزلیات کا انتخاب "صحیفۃ الغزل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین نام ثاقب تخلص ہے۔ پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔ ان کے جدامجد حاجی علی قزلباش شاہ طہماسپ صفوی کے خاص امرائے دربار میں سے تھے۔ دو سو برس کا زمانہ گزرا کہ یہ خاندان ہندوستان میں بسلسلۂ تجارت وارد ہوا اور اکبر آباد میں سکونت اختیار کی۔ ثاقب ابھی چھ مہینے کے تھے کہ ان کے والد اکبر آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

ثاقب نے فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ عربی اور انگریزی تعلیم زیادہ حاصل نہ کر سکے۔ عربی میں ابتدائی کتابیں پڑھ لیں اور انگریزی میں انٹرنس تک لیاقت حاصل کی۔ ان کے معاشی حالات اکثر اچھے نہیں رہے۔ تلاش معاش میں کبھی ثاقب لکھنؤ میں قسمت آزمائی کرتے رہے اور کبھی کلکتہ چلے گئے۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں ریاست محمود آباد میں ٹھکانا ہو گیا۔

اس کتاب کے دوبارہ شائع ہونے کے پہلے ہی ثاقب کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ جس کی روشنی میں ہم کو اپنی اس رائے میں ترمیم کرنی پڑی جو پہلے اڈیشن میں کلام ثاقب کے انتخاب کی مدد سے قائم ہوئی تھی۔ ثاقب، میر و غالب کے مقلد ہیں لیکن دیوان شائع کرنے میں اگر وہ میر کے بجائے غالب کی تقلید کرتے تو بہتر ہوتا۔ ضخامت کی خواہش نے رطب و یابس سب ہی ایک جا کر دیا۔ غزلوں کے علاوہ سہرا، تاریخ، تضمین سب کو اس دیوان میں جگہ مل گئی ہے۔

مرزا ثاقب اگر غالب کی نظرِ انتخاب سے کام لیتے تو ان کے اچھے اشعار کو دیر تک چمکنے کا موقع ملتا۔ اب موجودہ صورت میں نظروں کو تلاش کرنا پڑتا ہے ویسے وہ خود متوجہ کر لیتے۔ معنویت و زبان کا اثر یکساں قائم رہتا۔ سب سے پہلا اثر جو دیوان ثاقب کے مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے وہ زبان کی صفائی اور مضمون کی تلاش کی پے در پے کوشش ہے۔ خیالات کو بلند کرنے کے لئے ثاقب نے بڑی محنت سے کام لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اکثر کامیاب بھی ہوئے۔ بڑے سے بڑے خیالات کو تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں نظم کرنے کی اچھی کوشش کی ہے لیکن یہ خصوصیت ہر جگہ قائم نہیں رہ سکی۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بہت کافی ہیں جن سے خودداری کا احساس نشو و نما حاصل کر سکتا ہے۔ شخصیت کو اتنا اہم بنانا کہ انسان انسان معلوم ہو سکے۔ اس کی ہستی اپنی انفرادیت کا دوسروں پر نقش قائم

کر سکے ان کے کلام کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے پاکیزگی و لطافت کے ساتھ ساتھ ہمواریٔ کلام خاص طور پر پورے دیوان میں موجود ہے۔

طرزِ بیان و صفائیٔ زبان کے اعتبار سے دیوانِ ثاقب قابلِ قدر ہے مصرعوں کی ساخت عالمانہ انداز لئے ہوئے ہے نہایت جچے تلے الفاظ بہترین محاورے شاعرانہ تیور کے ساتھ نظم ہوتے ہیں۔ وارداتِ حُسن و عشق کو لطیف اشاروں میں بیان کر دینا ثاقب کا ایک کارنامہ ہے۔ جس سے ان کی فطرت شناسی اور نازک جذبات کے احساس کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

خودداری، زورِ کلام، پروازِ تخیل کی کوشش ثاقب کے اشعار میں ایک انفرادی حیثیت پیدا کر دیتی ہے۔ غالباً ان ہی خصوصیات کی وجہ سے کلام میں گمشدگی و بیخودی کے جذبات بہت کم آ سکے جس کی کمی جا بجا محسوس ہوتی ہے۔

ثاقب کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

ظریف

سید مقبول حسین ظریف کی ولادت ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی ان کے والد کا نام سید فضل حسین تھا۔ ظریف بچپن ہی سے شوخ اور بیباک تھے اس زمانہ کے رواج کے لحاظ سے ظریف کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوئی اس کے بعد اردو اور پھر فارسی کی طرف توجہ کی گئی۔ انگریزی کم پڑھی مگر کتب بینی کے مشغلے نے روز بروز ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ظریف صفی کے چھوٹے بھائی تھے اور ان ہی کے فیضِ صحبت سے شعر و شاعری سے واسطہ ہوا صفی اس وقت

اردو شاعری اور خاص کر صنفِ غزل کی ذہنی تبدیلی کرنے والوں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے ۔ فرسودہ طرزِ بیان اور مبتذل مضامین سے غزل کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ اردو کے دورِ متوسط میں جو خرابیاں طرزِ تخیل اور ذہنیت میں آگئی تھیں ان کو دور کر کے صحت مند عناصر غزلوں میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ صفی کی اس ذہنی کاوش کا اثر ظریف پر خاطر خواہ پڑا۔ چنانچہ جب ظریف مشاعروں میں شرکت کرتے تو ان کے پیشِ نظر یہ رجحان رہتا اور مزاحیہ انداز میں معشوق کو قاتل کہنے والے، معشوق سے قبر پامال کرانے والے، چاکِ گریبان پر شعر کہنے والے اور اسی قسم کے تقلیدی زاویۂ نگاہ کو شاعری کا جزوِ اعظم ماننے والے ، کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتے۔ ظریف کے نزدیک یہ زبان کی بڑی خدمت تھی۔ جس کو مرتے دم تک نباہتے رہے۔

ظریف کی شاعری اکبر کی شاعری کی طرح ایک خاص مقصد پر مبنی تھی۔ بادی النظر میں وہ محض تفریح کے لئے ہوتی مگر باطن میں اس کا منشا اصلاحِ مذاق ہوتا۔ وہ ہنسا ہنسا کر ادب کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ۔ یہ نظریہ یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ سیاسی و سماجی خرابیوں پر بھی وہ اپنے انداز میں برابر نکتہ چینی کرتے رہے۔ کل ہند تحریک ہو یا صوبائی ۔ سیاسی تحریک مقامی ہو یا سماجی خرابی، وہ ہر ایک میں اپنی شاعری سے اصلاح کرتے یا نکتہ چینی سے اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیتے۔ اس کا ثبوت آپ کو ان کی متعدد نظموں میں ملے گا۔ مثلاً انجمن آب ساقی کونسل الیکشن ریس، ہمارے لیڈر، زلزلۂ بہار، فغانِ لکھنؤ، ہوم رول وغیرہ ....

ظریف کا کلام اگرچہ ہنسنے ہنسانے کا مرقع ہے۔ مگر اسی مجموعہ میں ایسی نظمیں بھی نظر آتی ہیں جن میں سنجیدگی اور دردمند دل کی پکار بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ ہنسانے والا اپنے محسوسات سے مجبور ہو کر رو بھی دیتا تھا ایسے موقع پر ظریف کی نظموں میں بڑی تاثیر و گداز کا سامان مل جاتا ہے۔

ظریف کے کلام میں تاثیر کی کئی وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو زبان کی پاکیزگی اور محاورات کی صحت ہے۔ اسی کے ساتھ فنّی خوبیاں بھی شامل کر لیجئے تو بڑی حد تک کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ مگر ان باتوں سے بڑھ کر ان کا زاویہ نگاہ تھا۔ ہر خرابی پر ان کا دل زہر کنے لگتا تھا۔ وہ انفرادی احساس سے بلند ہو کر قومی و اجتماعی شعور سے کام لیتے تھے۔ اور جب احساس میں شدّت ہو جاتی تھی۔ تب خیالات کو اشعار کا جامہ پہناتے تھے۔ ان کا طرزِ بیان نہایت پُر اثر تھا۔ عموماً ایسی زبان کلام میں استعمال کرتے تھے اور ایسے مزے کے اعتراضات کرتے جو عام فہم بھی ہوتے اور ہمہ گیر بھی۔ اس سے انکار نہیں کہ ان کے دیوان میں بعض جگہ ایسا کلام بھی ملتا ہے، جو صرف کہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ چشم مروّت سے مجبور ہو کر ایسے مشاعروں کی شرکت اور ایسے اشعار کہنے پر مجبور ہوتے جو ان کے محسوسات سے بیگانہ ہوتے۔ کہیں کہیں ایسے موقعوں پر اپنے عجز کا اعتراف بھی ظریف نے کر لیا ہے۔

ظریف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے ظریف شاعر سمجھے گئے اور اس سمجھ میں لوگ حق بجانب تھے۔ اس لئے کہ دوسرے مزاحیہ نگار شاعر صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے تفریح کا سامان مہیّا کرتے ہیں برخلاف اس کے ظریف کا ایک مقصد ہوتا ہے لو عموماً شدّتِ احساس کے بعد وہ اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زبان ان کی کافر تھی۔ دل مومن تھا۔ یعنی مزاحیہ اندازِ بیان ظاہری پہلو تھا اور مقصدِ کلام ان کے دردِ دل کی آواز تھی۔ وہ ہر صحت مند شعبۂ حیات کو توانا اور تندرست دیکھنا چاہتے تھے۔ ہنسا ہنسا کر انجام کی طرف زمانہ کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ان بیانات اور اظہارِ تعزیت سے ملتا ہے، جو ان کے مرنے کے بعد اکثر ادبی حلقوں اور اشخاص نے ان کے غم میں بھیجے۔ ظریف کا انتقال ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ ان کا مجموعۂ کلام ان کے مرنے کے بعد ۱۹۴۹ء

میں "دیوان جی" کے نام سے شائع ہوا۔

ظریف نے اپنے محدود دائرے میں قومی و مقامی برائیوں کو محسوس کیا اور ایک حقیقی شاعر کی طرح انھی کمزور لوگوں کے روبرو اپنی ذاتی رائے پیش کر دی، شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ان کے اشعار کا اثر قہقہہ کی آواز میں گم ہو جاتا ہے لیکن کبھی ان کے چہرے بھی دیکھئے۔ جن پر وہ اشعار منطبق ہو رہے ہیں۔ کبھی ان قلوب کا بھی حال معلوم کیجئے۔ جن کے لئے وہ اشعار کہے گئے ہیں۔ بہر حال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظریف میں اپنے ملک کو سدھارنے کا شدید احساس موجود ہے۔ وہ ہر شعبہ پر جس سے رفاہِ عام کا تعلق ہے، گہری نظر ڈالتے ہیں اور ان کی دور بیں نگاہیں لوگوں کی کمزوریوں کا آئینہ بن جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ ایک بے لوث نقاد کی طرح سب کچھ بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی بے باکی اس بات کی شہادت ہے کہ ان کے دل میں ملک کا حقیقی درد ہے۔ ان کی بے باک نکتہ چینی صرف ادب و ادبیات، شعر و شاعری میونسپل الیکشن اور تعلیم کی خرابیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی ہمہ گیر طبیعت ہر ضروری شعبہ کو اپنی شاعری کا ایک دلچسپ موضوع بنا لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ کرنے والوں سے بھی مخاطب ہو کر بتا دیتے ہیں کہ

ع۔ این رہ کہ می روی بہ ترکستان است

ظریف کا مطالعہ فطرت قدم قدم پر نمایاں ہے، انکا اصل موضوع صرف انسان ہے اور اسی کی حرکات و سکنات ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ جس قسم کے انسانوں کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کی تصویر نگاہوں کے سامنے زندہ نظر آتی ہے۔ سیرت نگاری کا یہ کمال نظم لکھنے والوں کو مشکل سے میسر آتا ہے۔ لیکن ظریف کی نظموں کا یہ کردار اپنے طبقہ کی بہترین مثال ہوتا ہے۔ تھوڑے سے الفاظ میں وہ تمام ضروری خصوصیات جمع کر دیتے ہیں اور تصویر اس قدر مکمل ہو جاتی

ہے کہ ایک پردہ بھرے کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی شاعر کی قوتِ مشاہدہ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ ظریف انہی روزمرّہ کی باتوں سے انسان کی فطرت کا صحیح مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی ہر بات سادہ ہوتی ہے۔

اکبرؔ نے ہمیں صرف تبسّم کا موقع دیا تھا لیکن ظریفؔ کے یہاں قہقہے ہیں سننے والے ان کے اشعار سن کر ہنسی مشکل سے ضبط کر سکتے ہیں کیونکہ ہر بات میں ایک بے ساختہ پن موجود ہوتا ہے جو زبان سے نکل کر سیدھے دل پر اثر کرتا ہے لیکن ہم کو اس دھوکے میں نہ آنا چاہیئے کہ ظریفؔ کا کام صرف تھوڑی دیر کے لئے غم غلط کر دینا ہے اور رنجیدہ دلوں کو مسرور بنا دینا ہے بلکہ اگر ان کے کلام پر غور سے نظر ڈالی جائے تو اسی ظرافت کے پیچھے درد کا اثر انگیز طوفان ہوتا ہے خود اپنے قہقہے اپنے اوپر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ظریفؔ نے حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ پر طبع آزمائی کی ہے، ہر شخص کچھ نہ کچھ اپنے مذاق کے مطابق حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی ایک مشہور نظم میں شاعر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ہنسی درد کی کراہوں میں تبدیل ہو جاتی ہے شاعر کی عزّت اور اس کی عظمت ایک حد تک لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکی ہے حالانکہ شاعروں نے اکثر قوم کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالا ہے۔ وہ اس کمزوری اور پستی کا ذمّہ دار خود شعراء کو ٹھہراتے ہیں۔ اس کا پیرایۂ بیان اس قدر موثر اور دلکش ہے کہ ہر شاعر اس سے کچھ نہ کچھ اثر لے گا۔ یہی حال اور نظموں کا بھی ہے۔

یہ تو کئی جگہ اشارتاً لکھا جا چکا ہے کہ ظریفؔ لوگوں کو ان کی کمزوریوں اور برائیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نگاہ زیادہ ترعیوب پر پڑتی ہوگی۔ سیرتِ انسانی کا تاریک رُخ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے لیکن ان کے پیامات میں قنوطیّت کا تسلط نہیں۔ ان کے اشعار یاس و ناامیدی سے بہت دور ہیں

انھوں نے یہی ہمیشہ سمجھایا کہ ہم اب بھی اپنی حالت کو سنبھال سکتے ہیں۔ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیاہ بادلوں کے پیچھے بجلی کی چمک بھی موجود ہے۔ ان کی تعلیمات میں امید کو بڑا دخل ہے اور وہ اپنی نظموں کے آخری حصہ میں ترقی کی طرف جد وجہد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ظرافت و مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے۔ الفاظ کی تلاش میں ذرا سی لغزش ہوئی تو سوقیانہ پن آجاتا ہے۔ دونوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے بالکل قریب ہیں لیکن ظریف کے یہاں بازاری مذاق کا پتہ نہیں اگر ان کی کسی نظم کے کسی کردار نے بھی کوئی ایسی بات کہی بھی تو اس کی عریانی الفاظ کے لباس میں پوشیدہ کردی جاتی ہے۔

چونکہ ظریف کو ہر طبقہ کو مخاطب کرنا تھا۔ اس لئے انھوں نے نہایت عام فہم زبان اختیار کی ہے، ہر شعر روزمرّہ کی صفائی اور بندشوں کا نمونہ ہوتا ہے اگر کہیں وہ غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو وہ اپنے بامحل ہونے کی وجہ سے اشعار کی رونق بڑھا دیتے ہیں۔ اوّل تو وہ دوسری زبانوں کے الفاظ خود نہیں استعمال کرتے بلکہ کسی دوسرے شخص کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی نشست اس قدر درست ہوتی ہے کہ ناگوار ہونے کے بجائے لطف زیادہ ہو جاتا ہے۔ جس طبقہ کے انسانوں کا ذکر ہوتا ہے انہی کے حسب حال الفاظ انتخاب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تمام نظم فطری نظر آتی ہے۔ رعایتِ لفظی وغیرہ کا دش سے نظم نہیں کی جاتیں لیکن جہاں پر وہ خود بخود آجاتی ہیں۔ وہاں شعر کی قوّت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آرزو

آرزو کے جدامجد نواب تہور خاں ہرات سے اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ اجمیر میں قیام رہا۔ پھر ان کے پوتے نواب سیف الدین خاں اجمیر سے لکھنؤ چلے آئے۔ غدر میں ریاست بگڑ گئی۔ گھر لٹ گیا۔ آرزو کے والد میر ذاکر حسین دل آرام کی بارہ دری (لکھنؤ) میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی بارہ دری میں ۱۲۸۹ھ میں آرزو کی ولادت ہوئی۔

پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ فارسی وعربی کی کتابیں لکھنؤ کے مشہور علمائے سے پڑھیں۔ علم عروض حکیم میر ضامن علی جلال سے حاصل کیا اور ان ہی سے اصلاحِ سخن بھی لینے لگے۔ بارہ برس کے سن سے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ رفتہ رفتہ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا نے استاد مان لیا۔

آرزو اردو کے ان چند باکمال شعرا میں ہیں جن کا قلم نثر کے میدان میں بھی رواں رہتا ہے۔ چنانچہ کئی قابلِ قدر ڈرامے مثلاً متوالی جوگن، دل جلی بیراگن، شہزادہ حسن وغیرہ نثر میں آپ نے لکھے اور ایک رسالہ قواعد زبانِ اردو کے متعلق نظامِ اردو کے نام سے بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تصنیف کیا، جو اردو ادب میں ایک خاص اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

نظم کے میدان میں بھی آرزو نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مستقل نظموں کے علاوہ سلام، مرثیے بھی بکثرت کہے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے موصوف کی پرگوئی اور زبان پر حاکمانہ تصرّف کا اندازہ ہوتا ہے

جو چیز سب سے زیادہ آرزو کی ناموری کی باعث ہوئی وہ غزل ہے۔ غزلوں میں عموماً ایک درد انگیز یاس ہے، جس کے اظہار کے لئے موصوف ایسے اثر کرنے والے الفاظ شعر میں لاتے ہیں کہ رنج والم کے ساتھ ایک کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے، انداز بیان اور اشعار کی برجستگی سے کہیں کہیں میر کا پورا رنگ نظر آتا ہے۔

شگفتہ بحر، ملائم الفاظ اور دل پذیر ترکیبوں کے ساتھ سوز وگداز کا عنصر اشعار میں نہایت مؤثر ہو جاتا ہے۔ زبان نہایت صاف وشیریں ہے۔ اس وجہ سے کلام میں دل کشی بہت ہے، ہندی کے منتخب الفاظ او نقروں سے کلام میں دلکشی پیدا کرنے کا خاص مادّہ ہے جیسے ع

وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا!

دل کے کنول کا لہرانا ایسا ٹکڑا ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہے، آرزو کی غزلوں میں باوجود متانت وسنجیدگی کے شوخی، ادا بندی اور چھیڑ چھاڑ کا بہت دلچسپ ذخیرہ موجود ہے۔

ذوق کی طرح آرزو کو بھی محاورات وضرب الامثال کے نظم کرنے کا خاص شوق معلوم ہوتا ہے لیکن نہایت اعتدال کے ساتھ اس کی بھرمار سے شعر بے لطف ہونے نہیں پاتا۔ بلکہ ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ آرزو کے کلام میں رعایت لفظی کو بھی جگہ ملی ہے۔ جو غور کے بعد نظر آتی ہے لیکن اس صنعت کا جو لطیف جزو ہے۔ وہ آپ اشعار کی زینت کے لئے لیتے ہیں۔ شوخ اور تکلیف دہ عنصر سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں ایسی صورت میں آورد کا پتہ نہیں رہتا بلکہ آمد سے اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

بے ثباتی عالم اور عدم کے جانے کو آرزو نے نہایت یاس انگیز لہجہ میں دنیا کے سامنے غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ایسے موقع پر وہ ناصح نہیں بنتے بلکہ اپنے ہی کو مخاطب کر کے کچھ اس انداز سے ان ہی باتوں کو کہتے ہیں کہ دل پر خاص اثر ہوتا

ہے۔ ان غزلوں میں ایک اور چیز بھی ہے جو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے عالم تنہائی کا منظر، اس کا اثر، آپ ہی آپ کبھی رونا، کبھی ہنسنا یہ سب باتیں ایسی خوبی کے ساتھ نظم ہو جاتی ہیں کہ ایسے اشعار کو بار بار پڑھئیے مگر سیری نہیں ہوتی۔

یہ تنقید نامکمل رہ جائے گی اگر آرزو کی خالص اردو کا تذکرہ نہ کیا جائے آرزو کی ایسی غزلیں کافی ہیں جن میں وہی الفاظ اور محاورے آسکتے ہیں۔ جو خاص اردو کے ہوں۔ نہ عربی و فارسی الفاظ ہوتے ہیں۔ نہ ترکیبیں، ایسی غزلوں کا کہنا جتنا مشکل ہے ظاہر ہے مگر آرزو نے بڑی فنکاری سے ایسی غزلوں کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس سے اور فائدوں کے علاوہ ایک یہ بھی اہم فائدہ متصوّر ہے کہ اردو غزل عام فہم اور ہردلعزیز ہو جائے اور جو ہندی اور اردو میں بُعد ہو چلا ہے وہ بھی جہاں تک ممکن ہو کم ہو جائے۔ ایسی غزلوں کو آرزو نے خالص اردو کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اردو داں تو کیا ہندی داں بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں خالص اردو کے نمونے کے لئے ہم ایک غزل پیش کر دینا نامناسب نہیں سمجھتے۔

غزل

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سینکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

آنکھ سے بہہ نہیں سکتا ہے بھرم کا پانی
پھوٹ بھی جائیگا چھالا تو نہ دے گا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی

دل سے لوکا جو اٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی
پھیلتے دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی
ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں میں اس غوت میں ہوں
کہیں کھانے لگے چکر نہ یہ ٹھہرا پانی
کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی امنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی
ہاتھ جل جائے گا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی
رس ہی رس جن میں ہے پھر بل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی
نہ ستا اس کو جو چپ رہ کے بھرے ٹھنڈی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجا پانی!
یہ پسینہ وہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے ہم
آرزو! لو، وہ کھلا بھید وہ ٹوٹا پانی

قدیم رنگ میں آپ کے دو مجموعے "جہانِ آرزو" اور "فغانِ آرزو" کے نام سے ہیں۔ خالص اردو میں بھی ایک مجموعہ آپ نے "سریلی بانسری" کے نام سے شائع کیا ہے جو تمام تر متذکرہ بالا لب ولہجہ و زبان و اصول پر مبنی ہے۔

آرزو ایک مدت سے سینما کی دنیا میں گانے اور مکالمے لکھتے رہے اور بمبئی میں قیام کر لیا تھا مگر مرنے سے پہلے کراچی چلے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔

ریاضؔ

ریاضؔ کے جد امجد کرمان کے رہنے والے تھے۔ یہ پتہ نہیں کہ کب اور کیوں ان کے بزرگوار ہندوستان آئے اور خیرآباد ضلع سیتاپور ہی میں کس لئے سکونت اختیار کی، بہرحال ریاضؔ کی ولادت اسی شہر میں ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔ ریاضؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طفیل احمد سے حاصل کی موصوف اپنے عہد کے مشہور عالم تھے۔

ریاضؔ نے ابتداء میں اسیرؔ سے فیض حاصل کیا اس کے بعد امیرؔ کے شاگرد ہو گئے ادب سے دلچسپی ان کو ابتدائے زندگی سے رہی، پہلے ایک اخبار "ریاض الاخبار" کے نام سے خیرآباد سے جاری کیا پھر جب گورکھپور گئے تو "ریاض الاخبار" بھی وہیں سے نکالنے لگے بلکہ ان کے ساتھ "فتنہ" و "عطر فتنہ" بھی نکلنے لگے۔ ان اخبارات میں ریاضؔ کا کلام بھی شائع ہوتا رہا جو ان کی شہرت کا خاص باعث ہوا۔

ریاضؔ نے گورکھپور کو وطن بنا لیا تھا۔ زندگی کا زیادہ حصہ یہیں گزرا۔ اس سرزمین نے بھی داد وفا پوری طرح دی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کا مجموعہ کلام --- "ریاض رضواں" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔

ریاضؔ کا کلام شروع سے آخر تک شباب کی رنگینیوں اور حسن و عشق و عملی زندگی کی داستان ہے۔ کہیں معشوق سے چھیڑ چھاڑ ہے تو کہیں پیر مغاں و ناصح سے دل لگی۔ کبھی کسی کی ادا کا پر لطف ذکر ہے تو کبھی کسی لمبی ڈاڑھی والے کی ہجو ملیح۔

غرض کہ ریاضؔ ہر وقت سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ روزِ اوّل سے ایسا دل لے کر آئے تھے جس کو بہارِ حسن کی دلچسپیوں سے کبھی سیری نہ ہوئی۔ ریاضؔ نے دنیائے عشق میں عاشقِ ستم رسیدہ بن کر کبھی رہنا پسند نہیں کیا۔ دل پر اگر کبھی گہری چوٹ لگی ہے تو اس کا اظہار آہ و فغاں سے نہیں کیا بلکہ ایک معنی خیز تبسم سے۔ اور ایک ایسی ادا سے کہ معشوق کو خود پیار آجائے، وہ معشوق کی خوشامد بہت کم کرتے تھے بلکہ کبھی تو خود روٹھ جاتے ہیں کہ کوئی گڑگڑا کے منا کے منائے۔

یہ سچ ہے کہ ریاضؔ کے کلام میں سوز و گداز نہیں مگر اس کا کیا جواب کہ اس عنصر کے بجائے ان کے کلام میں کیف و سرور کی ایک لہر پڑھنے والے کے دل کو ہر وقت سرشار کئے رہتی ہے جس کی وجہ سے اتنا مزہ آجاتا ہے کہ شاید ریاضؔ کو "میکدہ والی" سے بھی مل کر نہ آتا ہو۔ ریاضؔ کا یہ ایک خاص کارنامہ ہے کہ انھوں نے معشوق کے کردار کو اسی کے الفاظ حرکات و سکنات سے اپنے اشعار میں اس خوبی سے دکھایا ہے کہ پورا نقشہ ایک پُرلطف طریقہ سے پیشِ نظر ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی قابلِ قدر مذاق ہے کہ ایسے موقعوں پر باوجود بےباکی و شوخی کے متانت کا دامن خارزارِ ابتذال سے مجروح نہیں ہونے پاتا۔

شراب اور اس کے متعلقات پر قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر ریاضؔ نے اس خوبی سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ ان ہی کا حصہ ہو گیا ہے جب کبھی وہ میکدہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ لفظ لفظ سے شراب ٹپکی پڑتی ہے۔ یہاں ان کا ہر قدم سراپا متوالی چال ہے، طرزِ بیان سے وہ سماں پیدا کر دیتے ہیں کہ ساقی، صراحی، سبو، پیرِ میکدہ بلکہ در و دیوار تک مست نظر آتے ہیں اور وہ مزہ تو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب وہ شراب کو کبھی میکدہ والی اور کبھی "وہ" کہہ کر اس کو یاد کرتے ہیں۔ گویا ایک معشوق ہے کہ جس کا نام صرف اشارہ میں

سے بتانا چاہتے ہیں۔ ریاض کا ظرف اتنا عالی ہے کہ وہ پی کر کبھی سرشار یا بدمست نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی ایسے شخص کا نتیجۂ فکر ہے کہ جو سرمستی میں از خود رفتہ ہوگیا ہے اور آپ کو بھی اتنی پلانا چاہتا ہے کہ آپ بھی مدہوش نظر آئیں۔

ریاض کے تمام کلام کو پڑھ کر ایک خاص بات آپ کو نظر آئے گی کہ ان کا معشوق مثالی یا خیالی نہیں۔ نہ ان کا عشق غیر معمولی انسان کا عشق ہے وہ اپنے معشوق کو ایک حسین اور دلچسپ ہستی سمجھ کر پیار کرتے ہیں نہ اس کو سراپا ظالم بیان کرتے ہیں۔ نہ اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ گدایانہ شان سے بھی آستان پر گذر نہ ہوسکے وہ اسے اپنے برابر کا ایک جنسِ لطیف سمجھتے ہیں۔ جس سے شوخی، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق سے پوری دل بستگی حاصل کرسکیں۔ وہ اس پر فقرے بازی بھی کرتے ہیں۔ اس کو طنز سے کبھی کبھی شرمندہ کر کے محجوب ہوتے ہوئے بھی دیکھنا باعث لطف سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی اس سے آتش کی طرح بگڑ بھی جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شوخی، پر لطف طنز، مزے دار شرارت اور عجب تیکھا پن اور حقیقت آمیز معاملات کی دنیا نظر آتی ہے۔

اصغر

اصغر کا اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں تھا لیکن آپ کے والد بسلسلۂ ملازمت اتنے عرصۂ دراز تک گونڈہ میں رہے کہ لوگ اصغر کو گونڈوی کہنے لگے۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں

انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائی اسکول چھوڑ دیا۔ انٹرنس کے امتحان کے لئے تیاری کی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے تاہم اس تھوڑی سی مدّت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا ذاتی لطف اٹھا سکتے تھے یہی حال عربی اور فارسی کا تھا۔ جو کچھ قابلیت انھوں نے پیدا کی وہ صرف ان کے ذاتی مطالعۂ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ تھی۔

اصغر ابتدا میں اپنا کلام منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو دکھاتے رہے۔ بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں۔ اخلاقی حیثیت سے اصغر ایک نہایت قابلِ قدر آدمی تھے۔ باوجود زہد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر کافی تھا بادۂ تصوف سے خاص طور سے خواستگار تھے۔ چنانچہ ان کو قاضی شاہ عبدالغنی سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ جس تک آپ کا قیام الہ آباد میں بسلسلۂ ملازمت رہا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے رسالۂ ہندوستانی کے ایڈیٹر عرصہ تک رہے۔

اسلوب بیان کے لحاظ سے اصغر سبھوں سے الگ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان و بیان و خیال کا تعلق ہے اتنا غیر تقلیدی اور نرالے اندازِ تغزل کا نمونہ اردو میں کمیاب ہے۔ ممکن ہے کہ اس دشوار گزار راہ میں کہیں کہیں شاعر کے قدم ڈگمگا گئے ہوں لیکن ان کے کارنامے کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت اس سے کم نہیں ہو سکتی اور سچ تو یہ ہے کہ صرف "نشاط روح" ہی ایسا دیوان نہیں جس کے "دو رخ" ہوں بلکہ خود کتابِ زندگی کے بھی کم از کم دو رخ ہوتے ہیں۔

اصغر بہت کم گو اور دقّت پسند شاعر تھے۔ اتنا کم کہنے پر بھی اہلِ نظر کو اپنی طرف خاص طور پر متوجّہ کر لینا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کے کلام میں قابلِ قدر چیزیں کافی ضرور ہیں۔

دوسرا دیوان یعنی "نشاط روح" اور اس کے بعد کا کلام ان کی ابتدائی شاعری

سے بالکل الگ ہے۔ ان کی پرانی شاعری میں تقلید و تتبع کا عنصر غالب ہے لیکن "نشاط روح" سے غیر تقلیدی رنگ کا آغاز ہوتا ہے جو اصغر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جن شعرائے امیر و داغ و جلال کے بعد اردو غزل میں نئی روح پھونکی، وہ صفی، محشر، عزیز اور ثاقب ہیں۔ ان حضرات نے سنجیدگی، تاثیر، ترنم اور معنویت کے لحاظ سے غزل کو اتنا بلند کر دیا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن "تنگنائے غزل" کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اس لئے اپنی جاذبیت کی وجہ سے اصغر، جگر، فانی وغیرہ کو اس طرف رجوع کیا تاکہ ان کے علاوہ کچھ اور باتوں کا اضافہ کریں۔ چنانچہ طرز بیان میں زیادہ تر ان شعرائے بالکل نئی روش اور نیا لب و لہجہ اختیار کیا۔

اصغر کے کلام میں سب سے پہلی چیز لب و لہجہ کی وہ جدت آمیز رنگینی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو ایک خوشگوار طریقے سے چھیڑ کر متاثر کر دیتی ہے۔ دوسری چیز سکون و اضطراب کی وہ معتدل آمیزش ہے جو ایک خاص کیف پیدا کر دیتی ہے اکثر ایک لطیف ترنم اور دلکشی بھی کلام میں پائی جاتی ہے۔

اصغر کی غزلوں میں عاشق و معشوق کے باہم اختلاف اور ٹھیٹ انسانی جذبات تو بہت کم ہوتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ موجودہ غزل گوئی میں باستثنائے حسرت موہانی یا ایک دو اور حضرات کے کلام کے اس چیز کا قریب قریب عام فقدان نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصغر کے یہاں بھی یہی چیزیں مختلف عنوان سے جلوہ گر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خیالات اور تجربات میں ایسے مضامین ڈھونڈھتے ہیں جو ایک لطیف نوعیت رکھتے ہیں۔

سامنے کی باتیں ہوں یا عام واردات قلبی ہوں ان سب کو اصغر نیا کر کے ایک خاص انداز سے بیان کر دیتے ہیں جس سے کلام میں ایک لوچ اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے ایسے اشعار باریک نشتر کی طرح دل میں اترتے تو ضرور ہیں اور دل کو زخمی

بھی کرتے ہیں لیکن دل کو چھیڑتے اور گدگدا تے ہوئے پھر اسی ماورائی فضا میں محو ہو جاتے ہیں جہاں سے غالباً یہ پیدا ہوئے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دل پر چوٹ کھانے کے لئے سینہ سپر نہیں رہتا بلکہ اس میں بھی اُسے ایک خاص لطف آتا ہے اور تیر نشانے کو چھوتا ہوا مڑ کر نکل جاتا ہے۔

اصغر کے پورے کلام میں ایک نشاط اور سرمستی ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور بغیر نوا سنجِ فغاں ہوئے وہ عشق کی منزلیں طے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغر کے کلام میں فلسفیانہ تخیل حقائق و معارف کے رموز شعریت لئے ہوئے نہایت خوبی کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ تمام کلام میں خیالات کی پاکیزگی، متانت و لطافت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور یہ خصوصیت ان کی فارسی ترکیبوں سے بہت زیادہ نمایاں اور دل آویز ہو جاتی ہے، اصغر کے وہ اشعار خاص طور پر دل کش ہوتے ہیں جن میں "غیر ذی روح" اشیا۔ یا کیفیات مجردہ کو روح فرض کر لیا جاتا ہے

اصغر تشبیہہ و استعارے میں خاص کاوش کرتے ہیں۔ عامیانہ و فرسودہ چیزوں سے گریز کر کے نہایت غور و خوض کے بعد ایسی لطیف و نادر چیزیں پیدا کرتے ہیں کہ بعض لحاظ سے ایسا ذخیرہ ادب میں ایک اضافہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اصغر کا انتقال ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں ہوا اور یہیں دفن ہوئے۔

نام علی سکندر ہے۔ وطن مراد آباد ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے ..... مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں کے استاد تھے لیکن عتابِ شاہی کی وجہ سے دلّی چھوڑکر مراد آباد آنا پڑا اور وہیں کے ہو رہے عرصے سے اس خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ جگر کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔

جگر کی ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت معمولی ہے۔ عربی سے بالکل ناواقف ہیں۔ فارسی یوسف زلیخا اور سکندرنامہ تک دیکھی ہے۔ انگریزی بھی بہت کم جانتے ہیں۔

جگر نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع آدمی ہیں۔ ایک عمر تک حسنِ مجازی کی تلاش و جستجو میں مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی ایک ایک داستان سے واقف ہیں۔ اسی سیر و سیاحت کے سلسلے میں آگرہ میں پانچ چھ برس تک مقیم رہے۔

جیسا اوپر بیان ہوا ہے۔ جگر کو شاعری ترکہ میں ملی بچپن ہی سے اس کا شوق ہوا۔ ۱۳-۱۴ برس کے سن سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں اصلاح اپنے والد سے لیتے رہے ان کے بعد داغ کو کلام دکھانے لگے اور داغ کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کو کئی غزلیں دکھلائیں۔

جگر کی قدیم شاعری پر سب سے زیادہ داغ کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے، شوخی، معاملہ بندی، الفاظ کی تکرار، معشوق کا سراپا اثر پذیر الفاظ میں بیان کرنا

یہ داغ کے پرتوِ فیض کا نتیجہ ہیں۔ جگر نے نہایت خوبی سے ان چیزوں کو اپنے کلام کا جزو بنالیا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ خصوصیت دنیاوی حسن و عشق کے واقعات تک محدود ہو بلکہ حقائق و معارف کو بھی نہایت کیف آور و پُرمعنی طریقہ سے بیان کر کے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیتے ہیں۔

جگر کی شاعری میں کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ ہے جو کلام میں ایک امتیازی شان اور شاعر کے انہماکِ ذوق و جوشِ فکر کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی آنکھیں حسن کی ادا شناس ہیں اور ان کا دل لذّتِ عشق کا سرمایہ دار ہے۔ جس کے اثر سے کلام میں رنگینی و دل کشی کا ایسا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس سے پڑھنے والے پر ایک خاص محویّت طاری ہو جاتی ہے۔

جگر کو محبت سے محبت ہے۔ وہ اس شراب سے اس قدر سرشار ہیں کہ کبھی کبھی اپنے کو خود معشوق سمجھنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی مومن کی طرح معشوق سے طنزیہ گفتگو کر کے اس کو چھیڑ دینا بھی اپنا ایک خوشگوار فرض خیال کرتے ہیں۔ آپ کے کلام میں جہاں کہیں درد ہے۔ اس میں حسرت کا پہلو بھی شامل نظر آتا ہے۔ جس سے تاثیر کے ساتھ ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دل پر ایک ایسی چوٹ لگتی ہے جو اپنی جگہ پر خود پر لطف ہوتی ہے۔

جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی و روانی ہے۔ وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ جو فارسی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں وہ عموماً مناسب اور دلنشیں ہوتی ہیں۔ جس سے روانی اور لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ محاورات کے با محل صرف سے کلام میں برجستگی اور ایک خاص مزہ پیدا کرنے میں جگر کو نہایت اچھا سلیقہ ہے۔ "داغِ جگر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر کو رعایتِ لفظی اور ہنوٹ کا بھی کسی قدر چسکا ہے۔

الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ عموماً کامیاب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ تکرار بھدی اور زائد بھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب چیزیں ان کے موجودہ کلام میں بہت کم ہوگئی ہیں۔ ان کا رجحان اب زیادہ تر مضمون و معنی کی طرف ہے۔

جگر کا موجودہ رنگِ شاعری پرانی شاعری سے کسی قدر الگ ہے "شعلۂ طور" (دوسرا دیوان) "داغِ جگر" سے بحیثیتِ مجموعی بہتر ہے۔ اس میں زیادہ متانت، زور اور پختگی ہے۔ تخیل میں بھی پہلے سے زیادہ بلندی ہے۔ حقائق و معارف نے مسائل اکثر بڑی خوبی اور شدّ و مد کے ساتھ بات بات میں منظرِ عام پر آگئے ہیں۔ زبان میں فارسیت زیادہ آگئی ہے۔ کہیں کہیں تو پورے مصرعے فارسی کے ہوگئے ہیں۔

جگر نے عمیق مضامین کی تلاش میں قابلِ قدر کوشش کی ہے لیکن کہیں الفاظ ان کے مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں۔ اور پرگوئی کی وجہ سے کہیں کہیں خیالات میں تکرار آگئی ہے۔

سائل دہلوی

سراج الدین احمد خاں نام، سائل تخلص تھا۔ آپ کی ولادت ۱۸۶۸ء اور وفات ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ آپ کا خاندان دہلی کا قدیم و صاحبِ اعزاز خاندان تھا۔ سائل نے اپنی قابلیت و وضعداری سے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ انسانیت کے لحاظ سے وہ نہایت خوش اخلاق، پرخلوص آدمی تھے

سائل کو مرزا داغ دہلوی کی دامادی کا بھی شرف حاصل ہے جس کا اظہار بار بار کرتے ہیں۔ داغ ہی سے کلام پر اصلاح بھی لی ہے۔ اپنی قابلیت اور استاد کی شفقت سے بہت جلد خود استاد ہو گئے۔ انھوں نے غزل کو حسن و عشق کے لطیف مضمون تک محدود رکھا۔ نہ تو فلسفہ کے ادق مضامین نظم کرنے کی فکر کی ہے اور نہ تصوف کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ایک صاحب دل کی طرح دنیائے محبت میں قدم رکھا۔ اس کے ناز و نیاز کو دیکھکر خاموشی سے مضمون لیا اور اثر لینے والی طبیعتوں کے سامنے نہایت مزے کے ساتھ پیش کر دیا۔

سائل کی غزلوں میں شوخی اور لطافت ساتھ ساتھ ہیں کلام شگفتگی اور انبساط کا مخزن ہے مگر ابتذال اور عامیانہ پن سے کوسوں دور۔ معشوق سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے لیکن حفظِ مراتب کے ساتھ جہاں اشعار مزے دار گفت گو کا مرقع پیش کرتے ہیں وہاں دل کشی کی حد نہیں رہتی۔ پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت زمین میں بہت سے شعر کہہ دینا معمولی بات تھی۔ استادی کا یہ حال تھا کہ جس مضمون کو چاہتے نہایت خوبصورتی سے عاشقانہ رنگ میں رنگ دیتے شعر کی مضبوطی اور الفاظ کے دار و بست کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

سائل صاحب کی زبان کا کیا پوچھنا، پُرانی دلّی کی شُستہ اور شیریں زبان کا مکمل نمونہ ہے۔ نہ کبھی ثقیل الفاظ لاتے تھے اور نہ کبھی بے لطف ترکیبیں اس وجہ سے روانی اور لطف میں کمی نہیں ہونے پاتی۔

اس زمانہ میں کم لوگوں کو محاورات پر اتنا عبور ہوگا، جتنا سائل کو تھا ان محاوروں کا بامحل صرف مصرعوں کو نہایت ہی مزے دار بنا دیتا ہے۔

مومن کی طرح سائل بھی اپنے تخلص سے اکثر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خوشی

اس بات کی ہے کہ ہر جگہ لطف قائم رہتا ہے۔ رعایت لفظی کی تکرار ایسی یا اتنی نہیں ہونے پاتی کہ سننے والوں کو الجھن ہو جائے بلکہ ہر جگہ ایسے مزے کے ساتھ سائل کا لفظ آتا ہے کہ ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں کہیں کہیں نوک جھونک بھی ہے لیکن اس حسن کے ساتھ کہ اس کا کھردرا پن تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے موقع پر صفائی اور مزے کی آمیزش ایک لطافت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک آپ کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ کلام کی ضخامت اتنی ہے کہ ایک کیا کئی دیوان تیار ہو سکتے ہیں۔ چونکہ آپ کا کلام ابھی تک مستقل کتاب کی صورت میں نہیں ہے اس لئے ہم یہاں چند غزلیں اور اشعار نمونہ کلام کے طور پر نقل کئے دیتے ہیں ؎

وفا کا بندہ ہوں الفت کا پاسدار ہوں میں
حریف قمری و پروانہ و ہزار ہوں میں
چمن میں حسن کے ہم نغمۂ ہزار ہوں میں
ادا سے تیر لگا دے کوئی شکار ہوں میں
جُدا جُدا نظر آتی ہے جلوہ کی تاثیر
قرار ہو گیا موسٰی کو بے قرار ہوں میں
خمار جس سے نہ واقف ہو وہ سرور ہیں آپ
سرور جس سے نہ آگہ ہو وہ خمار ہوں میں
سما گیا ہے یہ سودا عجیب سر میں مرے
کرم کا اہل ستم سے امیدوار ہوں میں
عوض دوا کے دعا دے گیا طبیب مجھے
کہا جو میں نے غم ہجر سے دوچار ہوں میں

شباب کر دیا میرا تباہ الفت نے
خزاں کے ہاتھ کی بوئی ہوئی بہار ہوں میں
قرار دادِ گریباں ہوئی یہ دامن سے
کہ پرزے پرزے اگر تو ہو تار تار ہوں میں
مرے مزار کو سمجھا نہ جائے ایک مزار
ہزار حسرت و ارماں کا خود مزار ہوں میں

ق

رفیق کرتے ہیں ایزاد کیوں تخلّص پر!
ہنر کو چھوڑ کے نسبت سے باوقار ہوں میں
ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جنابِ داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں
امیر کرتے ہیں عزّت مری ہوں وہ سائل!
گلوں کے پہلو میں رہتا ہوں ایسا خار ہوں میں

فصلِ گل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگِ طفلاں دیکھئے، خارِ بیاباں دیکھئے
اشک خونیں کی بہاریں نوک ناخن دیکھئے
دیکھنا ہے آپ کو میرا گریباں دیکھئے
دعوتِ آہن گدازی میرا گر باور نہیں
تیر کچھ دل میں چبھو کر ان کے پیکاں دیکھئے

کیوں کسی سے پوچھئے خستہ سری کا ماجرا
قفل کھلوا کر در و دیوارِ زنداں دیکھئے

غرّۂ اہلِ ورع کو دیکھئے گا تا کجا ؟
اب گنہگاروں کا رنگِ شرمِ عصیاں دیکھئے

ایکساں ہیں جوہرِ اہلِ سکون و اہلِ درد
صوتِ بلبل ، نکہتِ گل کو پریشاں دیکھئے

ناخنوں سے ملتمس ہوں توڑ کر تارِ قفس !
کارفرمائے جنوں نبضِ رگِ جاں دیکھئے

جانئے آسیبِ ہستی سے اسی کو مطمئن
ذرّہ ذرّہ خاک کا جس کی پریشاں دیکھئے

کھل گیا غنچہ کا جامہ پھٹ گیا بلبل کا دل
آگیا عہدِ درازئ گریباں دیکھئے

جامہ زیبی ختم ہے سودائیانِ عشق پر
اختصارِ دامن و طولِ گریباں دیکھئے

ضامن[1] و گلشن[2] کے در کو جھانک کر سائل بخیر
نوح[3] کے اشعار کا پرجوش طوفاں دیکھئے

---

[1] پروفیسر سید ضامن علی مرحوم صدر شعبۂ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ سائل صاحب الہ آباد میں ہمیشہ آپ ہی کے یہاں مہمان ہوتے تھے۔

[2] دیوان رادھے ناتھ کول گلشن جن کے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی گئی۔

[3] نوح ناروی۔

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

یہ لبِ پیغام بر پر پاسخِ پیغام تھا
آج ناممکن تھا آنا آج ان کو کام تھا

محتسب تسبیح کے دانوں پہ یہ گنتا رہا
کن نے پی کن نے نہ پی کن کن کے آگے جام تھا

اہلِ محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

یاسؔ و یگانؔہ

مرزا واجد حسین پہلے یاسؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں یگانؔہ ہو گئے۔ آپ کے جدِّ امجد ایران سے ہندوستان آئے اور سلطنتِ مغلیہ کے دامن سے بسلسلۂ سپہ گری وابستہ ہوئے۔ پرگنہ حوالی عظیم آباد میں جاگیریں ملیں اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔

سنہ ۱۳۰۱ھ میں مرزا صاحب کی ولادت عظیم آباد کے مشہور و معروف محلّہ مغلپورہ میں ہوئی۔ مرزا یگانہ کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو اپنے استاد مولوی سیّد علی خاں بیتابؔ سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد مرزا صاحب کو حضرتِ بیتابؔ نے اپنے استاد مولانا شادؔ عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ جن کے فیضِ صحبت نے سب سے زیادہ مرزا صاحب کی دماغی نشو و نما میں مدد پہنچائی۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں یگانؔہ مٹیا برج کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں ایسے بیمار پڑے کہ امیدِ زیست بھی نہ باقی رہی۔ علاج کے لئے لکھنؤ آئے اور ایسے آئے کہ اچھے ہو کر بھی یہاں سے جانا گوارا نہ کیا بلکہ اسی کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں ایک معزز گھرانے

میں شادی کرلی۔ یگانہ کا لکھنؤ میں قیام کرنا نہایت ہنگامہ خیز ثابت ہوا جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ ایک وقت میں لکھنؤ کے اکثر شعراء سے اور یگانہ سے شعر شاعری کے سلسلے میں بے لطفی ہو گئی۔ افسوس اس کا ہے کہ اس جنگ کا خمیازہ مرزا غالب کو بھگتنا پڑا۔ کچھ ایسے اسباب ہو گئے کہ یگانہ مرزا غالب ..... سے بھی خفا ہو گئے اور ایسے خفا ہوئے کہ آج تک دل سے غبار نہ گیا۔ کبھی کبھی اپنے اشعار اور مضامین میں اب تک ان کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ جن کو سن کر اہلِ مذاق کو حیرت ہوتی ہے۔

یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے دل پر اثر کرتی ہے، وہ زورِ کلام ہے۔ بندش کی چستی کے علاوہ بلند مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرا دیں اور خیال کو ابھار دیں۔ دوسری چیز جو آپ کے کلام میں دلکشی پیدا کرتی ہے وہ "طنز" ہے۔ یہ عنصر کہیں کہیں اتنا تیز اور تیکھا ہے۔ جو زورِ بیان کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔

یگانہ کے کلام میں تخیل کی بلندی اور ذہن کی پرواز نمایاں ہے۔ وہ حقائق و معارف کو خیالات کے عالمِ بالا سے چن کر لاتے ہیں۔ اور نہایت صفائی کیساتھ اشعار میں پیش کر دیتے ہیں معنی و مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ الفاظ اور ترکیب کی پیچیدگی میں مفہوم الجھنے نہیں پاتا۔ آپ عموماً حسن کو کسی ذات میں تصور کرکے اس کے اثرات نہیں بیان کرتے بلکہ حسن کو سراپا و مجسم ایک مستقل ہستی سمجھ کر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جس سے بیان میں ندرت اور اشعار میں معنویت بڑھ جاتی ہے۔ کلام میں زیادہ تر ہمت افزائی اور جوش کی لہریں نظر آتی ہیں۔ مصیبتوں میں گھر جانے پر بھی یہی پیام ملتا ہے کہ ہمت نہ ہارنا چاہیئے، ان کے یہاں یاس کے مضامین بھی ملتے ہیں مگر بہت کم ایسے موقع پر اکثر وہ انسانی کمزوریو

کا ذکر نہیں کرتے بلکہ "فطرتِ مجبور" پر طنز کرتے ہوئے حسرت کے ساتھ اپنی بے بسی پر ہاتھ ملتے ہیں۔

یگانہ کا کلام صفائی اور بیباکی کے اعتبار سے آتش کے کلام کا اکثر دو آتشہ معلوم ہوتا ہے۔ خیالات میں آتش کے کلام سے زیادہ بلندی ہے۔ مگر کیف و سرمستی کا وہ عالم نہیں جو خواجہ آتش کے یہاں ہے۔ حسن و عشق کے وہ واردات جو محبت کی عملی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ ان کی بہت کمی "آیاتِ وجدانی" (دیوانِ یگانہ) میں نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک گونہ دلچسپی میں کمی ہو گئی ہے۔ بلند خیال کی تلاش نے تغزل کا عنصر کافی نہیں پیدا ہونے دیا۔ بلکہ جوش اور ندرتِ بیان نے غزل میں بھی ایک حد تک نظم کا اندازِ بیان پیدا کر دیا ہے۔

یگانہ فارسی ترکیبوں کے دلدادہ ہیں۔ اکثر تشبیہوں کی جدت سے طرزِ بیان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان صاف و شیریں ہے۔ زیادہ تر فارسی و عربی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مصرعے نہایت چست ہوتے ہیں۔ بندشِ الفاظ سے اشعار میں ایک خاص اُبھار پیدا ہو جاتا ہے۔

رباعیات میں یگانہ نے ایک اجتہاد کی کوشش کی ہے کہ اور شعرا سے انکا رنگ الگ ہو جائے۔ مگر قبولِ عام میں رکاوٹیں اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ الفاظ اور محاورے ایسے آگئے ہیں جو ترشے ہوئے نہیں ہیں۔ اور جن پر زبان کی صفائی نے ابھی تک جِلا نہیں کی (یا یوں سمجھیے کہ جن کو انگریزی میں سلینگ (SLANG) کہتے ہیں)، اردو میں "سلینگ" کا استعمال ابھی تک بہت کم ہوا ہے۔ غالباً اکبر الٰہ آبادی اور ظریف لکھنوی کے علاوہ اس کی نمایاں مثال اور کہیں نہ ملے گی۔ یگانہ کے "سلینگ" میں اور اکبر و ظریف کے سلینگ میں یہ فرق ہے کہ یگانہ کا مقصد محض ظرافت و تفریح نہیں ہے بلکہ زوردار بات کہنا ہے اور ادبی طور پر غیر مستعمل الفاظ و محاورات کی

پذیرائی کے امکان کو نمایاں کرنا ہے۔ جملہ باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بھی ہمیں یہ کہنے میں تامّل ہے کہ یگانہ کی رباعیاں سرے سے ناکامیاب ہیں۔

فراق

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپور کے رہنے والے ہیں۔ وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدائش ہوئی۔ آپ کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت مشہور وکیل اور اچھے شاعر تھے۔

فراق کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو سے شروع ہوئی۔ سات سال کے تھے، کہ انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے ہر درجہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ بی۔ اے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ گورنمنٹ نے فوراً ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لیا مگر قبل ڈپٹی کلکٹر بننے کے آپ کانگریس میں شریک ہو گئے اور بجائے دوسروں کو جیل خانے بھیجنے کے خود جیل چلے گئے۔

فراق کا ذوقِ شاعری اس وقت زیادہ بڑھا جب آپ الہ آباد تحصیل علم کے لئے آئے۔ یہاں کی فضا میں رباب شاعری چھڑا دیکھا تو خود شعر کہنے کی امنگ دل میں پیدا ہوئی۔ ادب کے چرچے اور پروفیسر ناصری کی دلکش صحبتوں نے فراق کے دل کی دبی ہوئی آگ کو روشن کر دیا۔ جب بی۔ اے کلاس میں آئے تو پہلی بار آپ نے غزل لکھ کر ناصری ...... کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی۔ ناصری نے نہ صرف غزل پر اصلاح دی بلکہ اردو شاعری اور اس کے اصول پر باقاعدہ لکچر

دیئے۔ جو فراق کی راہ شاعری میں شمعِ ہدایت ثابت ہوئے۔ چند دنوں کے بعد اصغر صاحب کی صحبت نہ رہی اور آپ نے وسیم خیرآبادی سے اصلاح لینا شروع کی۔

شعروشاعری کا چسکا اب گویا فراق کے دم کے ساتھ تھا جیل خانے گئے تو وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قید خانہ شعروشاعری کا مدرسہ ہوگیا۔ یہاں نہ صرف شعراء سے ملاقات ہوئی۔ بلکہ علم دوست احباب سے برابر صحبتیں رہیں۔ مداح، عارف ہنسوی، حکیم آشفتہ، مولانا محمد علی ....، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی آئے دن کی صحبتوں نے بزم سخن کی گرم بازاری میں اور زیادہ مدد کی۔ ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

اہلِ زنداں کی یہ مجلس ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

۱۹۲۳ء میں جب فراق قید سے چھوٹ کر آئے تو کرسچین کالج لکھنؤ میں ملازم ہوگئے۔ پھر اس کے بعد سناتن دھرم کالج کانپور نے اردو پڑھانے کے لئے بلایا۔ اس درمیان میں آپ نے ایم۔ اے پاس کرلیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار مقرر ہوگئے۔ اب آپ کا مستقل قیام الہ آباد میں ہے۔

فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے لیکن اس سے ذرا بعد میں عزیز و صفی کا رنگ نظر آتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد میر کے کلام کا فراق پر اثر پڑا اور ان کی تقلید کرنے لگے۔ مگر اب موجودہ حالت میں ان کا خود اپنا ایک رنگ ہوگیا ہے۔ جس میں الفاظ کی تلاش، فقروں کی برجستگی اور مضمون و بیان کی ہم آہنگی خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ان کی غزلوں میں اکثر کیفیات کا تذبذب، مجبوری حیات کے اظہار پر تاسف، غم انگیز پہلو کی ترجمانی قابلِ دید ہے۔ جذبات نگاری میں قوت فکر کا عنصر شامل کرکے فراق نہ صرف تاثیر کلام میں اضافہ کردیتے ہیں بلکہ معنویت

بھی بلند نظر آتی ہے۔ ان کی نظر جذبات نگاری سے گزر کر کبھی کبھی جذبات کی نفسیات و حقیقت پر بھی پڑتی ہے۔ جو اردو ادب میں ایک خاص چیز ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سرچشمہ مغربی ادب خاص کر ڈرامہ و ناول وغیرہ کا مطالعہ ہے۔

غزلوں کے علاوہ فراق نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی شہرت کی باعث غزلیں ہیں جو اپنی معنویت، طرز تخیل اور اظہار خیال کی ندرت کی وجہ سے اردو ادب کے لئے ایک خاص سرمایہ ہو گئی ہیں۔ اس کارنامہ کی وجہ سے فراق نے اپنی جگہ اردو کے صف اوّل کے شعرا میں قائم کر لی ہے اس لئے کہ انداز بیان و ندرت تخیل کے امتزاج سے ان کا کلام ادب میں ایک اضافہ ہے

تلوک چند محروم

یوں تو عرصہ دراز سے محروم اردو کے رسالوں میں اپنا کلام بھیجکر داد سخن لے رہے ہیں لیکن ان کے مجموعۂ کلام کے شائع ہو جانے کے بعد سے اور بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے گوناگوں مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی وسعت نظر کا بہت بڑا ثبوت دیا ہے۔ اور ایک خاص طبقہ کو اپنا مداح بنا لیا ہے۔ ان کے کلام میں ادبی، اخلاقی اور نیچرل مضمون کا ذخیرہ قابل دید ہے اکثر انگریزی فارسی کے پاکیزہ خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر زبان کو مالدار بنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔

محروم کے یہاں یہ خوبی بھی قابل قدر ہے کہ ہندوستان کے بعض مشاہیر کے حالات بلا قید مذہب و ملت نہایت عمدہ عنوان سے بیان ہوئے ہیں

اس لحاظ سے خواب جہانگیر، نورجہاں کا مزار، مرزا غالب، مہاتما بدھ، سیتاجی کی فریاد، وغیرہ قابلِ دید نظمیں ہیں۔ غالباً اسی خوبی سے متاثر ہو کر سر عبدالقادر نے کلامِ محروم کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں ..... محروم کے پیش نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں [1] کردار نگاری کے وقت محروم کردار کی اہم خصوصیات نہایت خوبی سے بیان کرتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی دقّت نظری کا پتہ چلتا ہے بلکہ شعر میں بھی دلکشی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

غم و اندوہ کے جذبات محروم اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ یاس و درد کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو دل کو ایک خاص کیفیت سے بغیر متاثر کئے نہیں رہتی۔ خدا جانے ان کا دل کس مٹی سے بنایا گیا ہے کہ بقول سر عبدالقادر "بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے"۔

تمام کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محروم کو زبان کی صفائی، طرزِ بیان کی سنجیدگی کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے۔ متانت و پختگی کے پھول ہر جگہ اشعار میں باعثِ زینت ہیں۔ مذاقِ سلیم اور زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے برجستگی و روانی کلام میں عام طور سے نمایاں ہیں۔ بحروں کے انتخاب میں بھی روانی و شگفتگی کا خاص لحاظ معلوم ہوتا ہے۔ جس سے الفاظ کی سجاوٹ سے ترنّم و کیف پیدا کر کے دلوں کو دیر تک مسحور رکھا جاتا ہے۔

منظر نگاری کے وقت محروم کا قلم مصوّر کے قلم سے کم نہیں بلکہ اور زیادہ تصویر کشی

[1] دیباچہ گنج معانی ص۳

کا کام کرتا ہے۔ کلام کی روانی اور بحروں کی شگفتگی کی وجہ سے ان تصویروں میں ایک خاص دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور خود بخود ایک وجدانی کیفیت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ معمولی مناظر و مظاہرِ قدرت پر بھی اس خوبی سے خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

محروم اکثر بے جان چیزوں اور مناظر قدرت کے معمولی کرشموں میں روحانی تعلیم و تسکینِ قلب کا ایک سرچشمہ پاتے ہیں جس کا ذکر وہ نہایت پرکیف اور پرلطف طریقہ پر بیان کرتے ہیں۔

انند نرائن ملّا

انند نرائن ملّا[1] کشمیری ہیں۔ کشمیریوں کی ذہانت اور جمالیاتی احساس کو دنیا جانتی ہے، اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان کا جتنا حصّہ ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ انند نرائن ملّا کے والد پنڈت جگت نرائن ملّا لکھنؤ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ملّا ۱۹۰۱ء یعنی بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول اور کیننگ کالج کی انگریزی تعلیم کے علاوہ اردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کی وجہ سے انھیں عالمی ادب کے رجحانات و میلانات سے بھی واقفیت کا موقع ملا۔ وکالت اس لئے اختیار کی کہ آبائی پیشہ تھا اور اس میں امتیاز بھی حاصل کیا۔ مگر ملّا کی سلامت طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ وکالت کے ہو کر نہ رہ سکے اور نہ کلب اور جدید سوسائٹی کی تفریحات ان کے دل کی خلش اور دردمندی کو مٹا سکیں۔ فی الحال (۱۹۵۵ء) وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہیں

[1] دیباچہ جوئے شیر (دیوان ملّا) از آل احمد سرور

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی ملّاؔ لکھنؤ کے کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں۔ لے دے کے چکبستؔ کا کچھ رنگ ہے۔ ورنہ وہ غالبؔ اور اقبالؔ سے زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح بھی نہیں لی، اور صرف اپنی انفرادیت کو سہارا بنایا۔ ملّاؔ کے یہاں اس طرح لکھنؤ کے عام ماحول سے بغاوت ملتی ہے۔ مگر لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات ان کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔ دنیا نے ان سے اچھا سلوک کیا۔ انھیں خالی جیب اور ٹوٹے ہوئے دل ہی پر قناعت نہ کرنی پڑی۔ جو ایک نقاد کے الفاظ میں شاعروں کو خوب راس آتی ہے۔

انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایس۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار کے ترجمے کئے اور انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا۔ اور انھوں نے اردو شعر کہنے شروع کئے ملّاؔ کی شاعری میں حبِ وطن حسن، انسان دوستی اور نئی دنیا کے مجوزے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر۔

ملّاؔ کی غزلوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے۔ ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ اظہارِ عشق کرتے ہیں اور امتیازی پہلو ان کی غزلوں کا یہ ہے کہ معنویت سے لہجہ کا ابھار اتنا ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں، اسی اندازِ بیان کا اثر یہ ہے کہ سپردگی اور بودگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے بجائے عشق میں کھو جانے کے وہ عشق کے وقار و آداب کو غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان کی غزلوں میں تازگی اور تڑپ ضرور ہے۔

ملّاؔ نظم کہنے پر بھی قادر ہیں۔ اگر ان کے دیوان "جوئے شیر" کا مطالعہ کیجئے

تو اکثر نظمیں پر اثر و قابلِ قدر نظر آئیں گی۔ سیاسی، سماجی اور رومانوی نظموں کی ان کے یہاں کمی نہیں، لیکن جوش و ولولہ کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ طنز اور شدّتِ احساس کا جہاں کہیں اظہار ہو جاتا ہے۔ وہاں نظمیں بڑی دلکش ہو جاتی ہیں نظموں میں بھی مُلّا بلندیٔ تخیل اور باریک بینی سے کام لیتے ہیں۔ اقبال کی طرح وہ بھی معمولی باتوں کو، عام مناظر کو اس غور سے دیکھتے ہیں کہ فلسفہ و فکری عناصر پوری نظم کو وقیع بنا دیتے ہیں۔

مُلّا کی زبان بڑی رچی ہوئی زبان ہے۔ فارسی محاورات اور تراکیب نہایت خوبی کے ساتھ برمحل استعمال کر کے لب و لہجہ کو بڑی بلندی عطا کر دیتے ہیں۔ مسدّس پر مُلّا کو خاص قدرت حاصل ہے۔ عموماً اس شکل میں ان کی نظمیں نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ مجموعی حیثیت سے مُلّا کے کام میں بڑی پختگی و روانی ہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں مُلّا الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری سنہ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے بہت قلیل عرصہ میں حفیظ نے اپنی شاعری کا سکّہ ملک میں رواں کر دیا۔ شاہنامۂ اسلام لکھکر ایک خاص شہرت کے مالک ہو گئے۔ کلام کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ فردوسی نے محمود غزنوی کے اشارے سے شاہنامہ لکھکر ایران کے بادشاہوں کی عظمتوں کو پھر سے زندہ کرنے کی جو کامیاب کوشش کی تھی وہ سب پر ظاہر ہے۔ حفیظ نے اپنے مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر اسلام کی گزشتہ عظمت و خدمات کو از سرِ نو دنیا کے

سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں شاعرانہ حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بیانیہ شاعری اور وہ بھی تاریخی و روایتی واقعات کو نظم کرنا اور خشکی و نثریت سے محفوظ رکھنا آسان نہیں۔ فنکاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص آن بان اس کام کے لئے درکار ہے۔ حفیظ قابلِ ستائش ہیں کہ اس مہم کو بڑی خوبی سے سر کر گئے ہیں۔ تمام کلام میں شعریت نمایاں ہے۔ اسلامی جوش جابجا زور و فخر کی لہر بھی دوڑا دیتا ہے۔ جس سے کلام میں ایک عظمت و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعات دلچسپ ہو جاتے ہیں اور بیانات پُر اثر۔

شاہنامہ اسلام کے علاوہ ان کے نظموں کے اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً نغمہ زار۔ سوز و ساز جن میں علاوہ اور خوبیوں کے سب سے نمایاں خوبی کیف و روانی کی ہے۔ جس کے بہاؤ میں پڑھنے والا خود بہہ جاتا ہے۔ ان خصوصیات کو با اثر بنانے کے لئے بحروں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ جن کی خاص خوبی ترنم آفرینی ہے۔ فارسی کی لطافت ملک کے مقامی اثر نے ان نظموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کر دی ہے۔ بیخودی و سرشاری و روانی ان کے کلام کے مخصوص جوہر ہیں جو دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ غالباً ان ہی خصوصیات کے نمایاں کرنے کی فکر، تخیّل میں بلند پروازی اور کلام میں عمق نہیں پیدا ہونے دیتی جس کی کمی کبھی کبھی شدّت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

تعجّب ہے کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا بے فکر و غم دنیا کو ہر قدم پر ٹھکرا کر مستانہ وار گزر جاتا ہو۔ وہ غزل کی دنیا میں بالکل قنوطیت پسند و مایوسیوں کا شکار نظر آئے۔ غالباً سوز و گداز کی فکر جو غزل کے قدیمی حربے ہیں۔ اس انداز بیان پر مجبور کرتے ہوں۔ حفیظ کی غزلوں میں درد و گداز بہت کافی ہے۔ زبان نہایت نرم اور صاف ہے جو تغزل کے لئے پوری طرح موزوں ہے۔

حفیظ کے گیت بھی بڑے موثر ہیں۔ چونکہ وہ بحروں کی دل کشی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اور زیادہ ہوتا ہے۔ نرم و شیریں الفاظ جو بلندی کی چاشنی لیکر موضوع کو سراپا نغمہ بنا دیتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح شہسوارِ کربلا، نغمے ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر حفیظ کی نظم نگاری کی صلاحیت کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ سیاسی، تاریخی و مذہبی اور تخیلی کارناموں میں سیرت نگاری صداقت و شعریت کا ایک جگہ اتنا کامیاب بنا دینا ہر شخص کا کام نہیں۔

سیماب

سید عاشق حسین نام، سیماب تخلص، ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم شروع شروع میں ایک اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد کالج کی تعلیم شروع ہوئی۔ ابھی ایف۔ اے میں تھے کہ والد کے انتقال نے سلسلہ تعلیم قطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۹۹ء میں داغ سے تلمذ حاصل کیا۔ اس وقت سے شعر و شاعری کی طرف زیادہ انہماک ہوا۔ آپ کا کمال دیکھکر مختلف لوگ مختلف اطراف سے فخر شاگردی حاصل کرنے لگے۔ علمی مشغلہ زور کے ساتھ جاری ہوا۔ چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں:

"تصنیف و تالیف کا شوق مجھے عہدِ طفولیت سے ہے۔ اس وقت تک (۱۹۳۵ء) ۲۸۴ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہین کشش ہیں۔"

اپنے شاعرانہ معتقدات کو ایک مقام پر خود تحریر فرماتے ہیں۔ "اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی لیکن زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر

وسیع ہوتا گیا۔ رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں۔ جو امرد پرستی کے نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشقِ محض ہے۔ میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں۔"

سیماب کے یہاں جذبات سے زیادہ خیالات اور فلسفہ کے مضامین آپ کو ملیں گے۔ وہ انگریزی شاعری کے پوپ ڈرائیڈن اور جانسن کے کلاسیکی اسکول سے زیادہ ملتے ہیں لیکن سپردگی کی ان کے یہاں کمی ہے جو درد کی ممتاز صفت ہے۔ وہ اگر بے اختیار ہونا بھی چاہتے ہیں۔ تو ان کی کوشش کا عنصر بے نقاب ہو جاتا ہے

آپ کا کلام علاوہ اور خوبیوں کے زبان کی لطافت، فن کی تکمیل کی پوری تصویر ہے۔ آپ کا دوسرا مجموعہ "کارِ امروز" نظموں کا ذخیرہ ہے جس کے دیکھنے سے آپ کی وسیع النظری اور ہندوستان بلکہ دنیا کے ہمہ گیر مسائل سے دلچسپی کا ہر جگہ ثبوت ملتا ہے۔ آپ کی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے نظموں میں جوش و خروش زیادہ نہیں پیدا ہو سکا۔ مگر اس کا پتہ صاف چلتا ہے کہ ہر طبقہ و مسئلہ پر آپ کی نظریں ناقدانہ انداز سے پڑی ہیں۔

سیماب کا انتقال ۱۹۵۲ء میں کراچی میں ہوا۔

فطرت واسطی

اردو کی نظموں میں جب حالی و آزاد و اکبر وغیرہ کے بعد نوجوان شعراء کو

رومانی شاعری کی ضرورت محسوس ہوئی تو لطافت و رنگینی کے ساتھ اپنے محسوسات کو پیش کرنے کی فکر ہوئی۔ فطرت واسطی بھی ان ہی لوگوں میں نمودار ہوئے۔ فطرت کے مختلف مناظر اور حسن و عشق کے متعدد مظاہرے ایک خاص لطف کے ساتھ قلمبند کرنے لگے۔ ان کی شاعری ہندوستان کے متوسط طبقہ کے جذبات کی ترجمانی تھی۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ "حدیثِ حسن" قدم قدم پر اس کا ثبوت دیتا ہے۔ حسن و شباب، رنگ و بو، لذّت و خواہش ان کے کلام کی جان ہے۔ محبت کی داستان ہو یا منظر نگاری، وہ تشبیہات و استعارات ہمیشہ جنسی دنیا سے لاتے ہیں۔ جو اسی گوشت پوست کی محبت اور مجازی بلکہ نسوانی حسن سے متعلق ہوتی ہیں۔

فطرت کی زبان نہایت پاکیزہ اور پراثر ہوتی ہے۔ وہ تشبیہہ و استعارے میں بھی جدّت پیدا کرتے ہیں۔ بحروں کے انتخاب میں بڑی کاوش سے کام لیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پورا کلام عموماً حسین ہو جاتا ہے۔ اشعار میں درد و سپردگی بہت کافی ہے۔ انھوں نے انگریزی صنفِ شاعری سانیٹ کو بھی اردو میں متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن باوجود کارآمد اور دلچسپ بات ہونے کے اردو شاعری میں یہ صنف مقبول نہ ہو سکی، فطرت کی نظموں میں تغزل اور ہیئت کا تنوع دلکشی کا باعث ہے

فطرت کے مجموعۂ کلام میں ایک کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ یعنی غمِ جاناں کے سوا غمِ دوراں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ملکی و قومی مسائل پر جیسے فطرت کی نظر ہی نہیں، حسن و شباب کو مصیبتوں میں دیکھ کر فطرت کا حسن پرست دل بے چین ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک مخصوص ہستی سے وہ دلچسپی لے رہے ہیں عوام سے اس احساس کا کوئی واسطہ نہیں اور اسی کمی نے غالباً ان کو شاعری کی دنیا میں اس فروغ سے محروم رکھا جس کے وہ مستحق ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ان کو زبان و بیان پر اتنا عبور تھا کہ ان کے ہم عمر شاعروں میں کم لوگوں کو رہا ہوگا۔ اب ادھر پانچ سات سال

سے تو ایک خرابی اور ان کی ترقی میں سدِّ راہ ہو گئی ہے۔ ان کا کلام کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ جیسے وہ کچھ کہہ نہیں رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی ان کو ترک شاعری سے گریز کرنا تھا کیونکہ نہ عمر زیادہ ہے نہ کلام۔

مجاز

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبا کا ایک خاص زور تھا۔ جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا مگر ادب کی خدمت کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی۔ ان نوجوان ادیبوں اور شعرا میں مجاز کی کافی اہمیت ہے۔ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اور پھر کچھ دنوں حکومت بمبئی کے محکمہ اطلاعات میں ملازم رہے۔ پھر حلقۂ ادب لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور "نیا ادب" کے ادارہ میں رہنے کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازم ہو گئے۔

آج کل کی دنیا میں رہ کر کون حسّاس شخص یا ادیب ہو سکتا ہے جو اپنے ماحول سے متاثر نہ ہو، ملک کی بڑھتی ہوئی متوسط طبقہ کی ابتری، بے روزگاری کا بھوت جو تعلیم یافتہ نوجوان کو ڈرا رہا ہے، روزمرّہ کی جنگ اور خون بہنا اور اسی طرح سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسانیت کا جذبہ ہمیں اس نظام کے بدل دینے کے لئے دعوتِ عمل دیتا ہے۔ ایک حقیقت نگار شاعر کا دل ان چیزوں کا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجاز بھی اس ہیئت ناک سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور دعوتِ انقلاب دیتے ہیں۔ وہ بیداری کا

پیغام سناتے ہیں اور ہمیں اس فرسودہ نظام کے خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

مگر اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گزر کر مجازؔ نے محسوس کیا کہ شاعری کا مقصد خطیبانہ نظمیں لکھنا ہی نہیں ہے۔ ایک فن کار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کی حالت کا مطالعہ کرے، اسے سمجھنے کی کوشش کرے اور ان باتوں کے اثرات جن جذبات کو برانگیختہ کر دیتے ہیں انھیں ایک پیکرِ لطیف میں سامعین کے سامنے پیش کرے۔ مجازؔ نے ڈرائنگ روم میں شعر کہنا شروع کیا۔ وہاں سے اٹھ کر پبلک میٹنگ میں نغمہ سرا ہوئے۔ پھر فن کی دنیا میں داخل ہو کر اپنے جذبات کو اس طرح بیان کرنے لگے کہ ان میں ہمہ گیری آگئی۔

مجازؔ کی شاعری کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ ان کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عروسِ سخن نے بھی اب عوام کے ساتھ رہنا شروع کیا، تہذیب تمدن کی دلہن کا لباس اب ریشمی نہیں وہ چیتھڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ قصرِ امراء کے آرام اور غلامی سے پیچھا چھڑا کر سیلابِ حیات کے منجدھار میں پڑنا زیادہ پسند کرے گی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اردو شاعری میں یہ رجحان ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن مجازؔ کے یہاں جن خوبیوں کے ساتھ اس قسم کی شاعری آئی۔ وہ ان کو ایک امتیازی پہلو عطا کرتی ہے۔

مجازؔ میں جذبات نگاری کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ نوجوان طبقے کے جذبات، غریبوں کے جذبات، بے روزگار انسانوں کے جذبات وغیرہ کو نہایت سچائی اور لطف کے ساتھ بیان کرتے ہیں مفلسی کے ہیبت ناک مناظر یا سرمایہ داری کے ظلم کا نقشہ کھینچتے ہوئے بھی شعریت کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ ان کے کلام میں روانی، گھلاوٹ اور شیرینی بہت ہے۔

ان کی رومانی نظموں میں ایک خاص زندہ دلی ہے۔ ایک جھجکتی ہوئی نمو ہے نا امیدی، اپنے کو فنا کرنے کا جذبہ اور قنوطیت کے عناصر ان کے یہاں بہت کم ہیں جوانی کی سرمستی اور امنگیں ان کے کلام کو ایک خاص دلکشی بخشتی ہیں۔

مجاز کے کلام کا مجموعہ ۱۹۳۸ء میں "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ ان کی کئی نظمیں مثلاً "رات اور ریل" "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر" وغیرہ اردو داں نوجوان جماعت کی زبان پر ملیں گی۔ ۱۹۴۵ء میں اپنے پرانے مجموعے "آہنگ" میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے اسے "شب تاب" کے نام سے شائع کر دیا ہے اور اسی طرح ایک مجموعہ اور نکالا ہے جس کا نام "سازِ نو" رکھا ہے

روش

روش، جوالاپور ضلع سہارن پور کے رہنے والے ہیں اور شاہد عزیز نام ہے، آپ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر ہی پر اردو فارسی اور انگریزی سے واقفیت پیدا کی اور اپنے والد سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

رومانی شعراء میں روش کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ ایک نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں شیرینی اور حلاوت کے علاوہ اپنے ترنم کے لئے بھی مشہور ہیں۔ نظموں کا پیرایہ عموماً ترجیع بند کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ طرز روش کی شاعرانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان کے خیالات و جذبات کے پیچ و خم کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور شکل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک مصرعہ کا بار بار آتے رہنا تکرار پیدا کرتا ہے۔ اور یہ تکرار ایک خاص حسن پیدا کر دیتا ہے۔

روشؔ کی شاعری میں مذہبی جذبات و تاثرات کا غلبہ ہے حالانکہ ان کی شاعری بنیادی طریقے سے دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ اور طبقہ متوسط کو اپنی رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑتی ہیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے روشؔ کے یہاں بیان ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سماجی جکڑبند کے ٹوٹنے کی آواز اس میں بھی سنائی دیتی ہے۔

روشؔ کی شاعری میں سیاسی تخیّل زیادہ پرزور نہیں ہے۔ آوازِ بازگشت کی طرح صدائیں آتی ہیں، انقلاب کے نعرے سنائی دیتے ہیں، فریاد کی آوازیں آتی ہیں مگر ہماری سیاسی شاعری جوشؔ و مجازؔ وغیرہ کے ہاتھوں اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ اب اس قسم کی آوازیں داستانِ پارینہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سیاسی دنیا میں انقلاب کا تخیّل اتنا زیادہ حقیقت پسند و صاف ہو چکا ہے کہ رومانیت کا نظریہ اس کے سراسر منافی سمجھا جاتا ہے۔

روشؔ کی شاعری کا امتیازی پہلو نرم و لطیف الفاظ و تشبیہات کی بہتات ہے۔ ان کی نظموں میں تغزل و روانی خاص طور پر قابلِ قدر خصوصیات ہیں۔ محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اتنی خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ کم لوگ ان کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

احسانؔ دانش

احسان الحق کا خاندانی وطن باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن آپ کے والد قاضی دانش علی نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہیں ۱۹۱۴ء میں

احسان الحق کی پیدائش ہوئی۔ اب عموماً لاہور میں رہتے ہیں۔ آپ نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے ہمت و استقلال نے رہبری کی اور آپ نے مزدوری، معماری، باغبانی اور پہرہ داری کی سخت منزلوں سے گزر کر بھی دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی ہے۔

ذاتی تجربہ کی وجہ سے احسان مزدوروں اور مفلسوں کی ایسی عبرتناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ واقعات و مناظر کو ہو بہو پیش کرنا آپ کا امتیازی پیرایۂ بیان ہے۔ یہ تصویر کشی بھی وہ ایک فن کار کی طرح کرتے ہیں۔ اور تصویر کے خدوخال اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ضرورت و خواہش کے مطابق اثر کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اکثر اس اثر کو زیادہ تیز کرنے کے لئے احسان ایک بہت دلکش تمہید یا پس منظر دے کر مفلسی کی کوئی دلسوز تصویر پیش کرتے ہیں۔ یا امیروں کی عیش و شادمانی کے مقابلہ میں غریبوں کی بے کسی اور...... حرماں نصیبی دکھاتے ہیں۔ یا کبھی فطرت کی مسرت بخش آغوش میں کسی مصیبت زدہ کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ تمام کائنات رونے پر مجبور ہو جائے۔

احسان نے جو کچھ محسوس کیا اسی شدت سے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اب ان تکالیف کا کیا علاج ہو۔ یہ آپ خود سوچئے۔ اس علاج کے لئے وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہیں، کبھی خدا سے دریافت کرتے ہیں کبھی اقبال کی بات مانتے ہیں، کبھی جوش کی طرف جھکتے ہیں، کبھی خود اپنی انفرادی ترقی کو نمونہ سمجھ کر غریبی کا علاج علم میں تلاش کرتے ہیں، کبھی اصلاح پسندوں سے کہتے ہیں کہ بے روزگاری کا علاج کرو۔ ورنہ یہ ستائے ہوئے لوگ انقلاب کر بیٹھیں گے

احسان کی کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی انھوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد مزدوری سے وقت بچا کر جتنا ممکن ہو سکا خود علم حاصل کیا۔ اس لئے ان کے خیالات

سلجھ نہیں سکے۔ وہ رسمی و مذہبی قیود سے باہر نکل کر حیات و سماج کے بنیادی مسائل پر علمی و تحقیقی نگاہیں نہیں ڈالتے۔ اسی خیالی الجھاؤ کی وجہ سے وہ اپنے طبقاتی تعلق کی اہمیت کو زیادہ نہیں سمجھتے خود کہتے ہیں :

"میری بوریئے پر آنکھیں کھلی ہیں اور قالین پر دم نکلے گا۔"

احسان انقلاب تو ضرور چاہتے ہیں لیکن اس کا تصور بالکل جذباتی اور کبھی کبھی بالکل رومانی ہوتا ہے۔ ان کا انقلاب کسی طبقاتی کش مکش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ کبھی مشیت ایزدی پر مبنی تو کبھی کسی ایک باغی کا خواب ہوتا ہے اور اس میں ہر ظالم، سفّاک، دھوکہ باز جاگیردار، سرمایہ دار، ملّا، لیڈر، یہاں تک کہ اس باغی کو ہر نقصان پہنچانے والے کا خون بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بڑی بھیانک تصویریں اور خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔

احسان کی زندگی کے اتنے تلخ تجربات ہی نے شاید ان کے تخیل کو اتنے خوفناک مناظر پیش کرنے کے قابل بنایا ہے۔ ورنہ "باغی" "کا خواب" یا "سادھو کی چتا" جیسی بھیانک نظمیں اتنی ادبی لطافتوں کے ساتھ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے بس کی ہو سکتی ہیں۔

پھر بھی اقبال اور جوش کے اثر کی جھلک اتنی الگ اور تیز نہیں کہ احسان کی شاعرانہ انفرادیت دب جائے۔ ان کا ذاتی مشاہدہ انھیں غریبوں کے شاعر بننے پر مجبور کرتا ہے۔ گو عمداً وہ متوسط طبقہ کی طرف ہی کیوں نہ کھنچے چلے جا رہے ہوں۔

احسان نے دیگر موجودہ شعراء کی طرح رومانی نظمیں بھی کافی کہی ہیں حسن و عشق کی دنیا میں انکا انداز عجب والہانہ ہوتا ہے۔ شاعرانہ کیف اور اثر میں ڈوبے ہوئے شعر ان کی رومانی نظموں میں بہت ملتے ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کافی کہی ہیں لیکن تغزل کم ہے۔ غزل کی زبان بھی نہیں، ردیف و قافیہ کی قید میں

عاشقانہ نظمیں معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ گیت بھی لکھے ہیں لیکن وہی پرانی روش ہے امتیازی شان نہیں پائی جاتی۔

ترنّم احسان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور وہ خود بھی بڑی دلکش لحن سے پڑھتے ہیں۔ جدید تشبیہات اور لطیف شاعرانہ اشارات کثرت سے ملتے ہیں بعض تشبیہات تو ایسی لے آئے ہیں کہ ابھی تک اردو داں کا انتظار کر رہی تھی واقعات و مناظر کے جزئیات پر ان کو ایک فن کار کی طرح قابو ہے جذبات کے لطیف فرق کو نمایاں کرنے میں ان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔

ان کے یہاں سیدھے سادھے مگر دلکش اور بہت مانوس الفاظ ملتے ہیں۔ جوش اور اقبال کی طرح فارسیت کا رنگ غالب نہیں ہے۔ احسان میں ابھی بہت کچھ ترقی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ تھوڑے سے ذہنی سلجھاؤ کے بعد وہ اردو کے بہت بڑے شاعر ہو سکتے ہیں۔

اختر شیرانی

اختر خاں نام، اختر تخلص۔ حافظ محمود خاں شیرانی کے لڑکے ہیں ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ مگر ہوش لاہور میں سنبھالا، ابتدا میں اپنے آتالیق صابر علی خاں شاکر سے مشورہ کیا۔ بعدازاں فطری ذوق سے مدد لیتے رہے۔ آپ خالصاً رومانی شاعر ہیں۔ والہانہ انداز بیان سے نظموں کو حقیقی معنوں میں غزل بنا دیتے ہیں۔ وہ ایک خوش دل عاشق کی طرح معشوق سے دیوانہ وار گفتگو کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ جن سے ان کے کلام میں ایک لطف و سپردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان

کی نظمیں زیادہ تر تکلمانہ انداز کی وجہ سے دلکش ہو جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حسین دوشیزہ کا تصور ان کے دل میں اکثر گدگدیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اگر "گجرات" پر بھی نظم کہتے ہیں تو وہاں بھی ان کے جذبات کی رنگ آمیزی سے سرزمین گجرات ایک دلہن بن جاتی ہے۔

اختر شیرانی کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ طرز بیان یا کلام میں اتنا گداز نہیں ہوتا کہ ناقابل برداشت ہو جائے اور نہ اتنا کم ہوتا ہے کہ طبیعت بے کیف ہو جائے، ان کی نظمیں عموماً مترنم و شیریں ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ گہرائی یا وزن نہیں جو کسی شاعر کو حیات ابدی عطا کر سکے۔ اکثر کلام کے ناہموار ہونے کی بھی لوگوں کو شکایت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ کمی اسکی محسوس ہوتی ہے کہ ان کے جذبات میں کوئی تلاطم، کوئی شدید طوفان کوئی بے چین کر دینے والا تموّج نہیں ہوتا۔ ان کی نظمیں اپنی ساخت کے لحاظ سے آورد کا پتہ دیتی ہیں لیکن یہی ساخت کی نوعیت اکثر اتنی نادر و پُرکار ہو جاتی ہے کہ آورد کے احساس کو ابھرنے بھی نہیں دیتی۔

اختر[1] کی رومانی شاعری اداس اور درد آفریں نہیں پُرکیف اور رجائی ہے اس میں ایک رچاؤ ہے، لذتیت ہے حسن پرستی ہی نہیں حسن کاری اور حسن آفرینی کا احساس ہے۔ حسن سے قربت کا احساس ہے اور عریانی، اوباش پن اس پر مستولی نہیں۔ وہ ایک ماورائی سرمستی اور حسن پرست کیفیت کا پرستار ہے۔

اختر کے کلام کے مجموعے شعرستان۔ صبح بہار۔ نغمۂ حرم۔ طیور آوارہ۔ اختر ستان شہ رود، لالۂ طور اور شہناز کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک مصنفہ ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۵۹ - ۵۸ •

فیض

پنجاب کیا پوری اردو شاعری میں کلام کی اتنی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا۔ جتنا فیض احمد فیض نے۔ ان کا مجموعۂ کلام مختصر ہے۔ مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ فن کاری اور ندرتِ تخیل کا اتنا حسین امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں نہیں دکھائی دیتا۔ سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہہ و استعارے کے شعر کی صورت میں پیش کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں تریب تریب ہر جگہ نظر آتا ہے۔

فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی مگر کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکے، وجہ یہ تھی کہ وہاں خیال میں ندرت نہ تھی۔ فرسودہ نظریۂ عشق کو غزلوں میں جگہ دیتے رہے۔ شدّتِ احساس کی کمی نے تاثیر کو ابھرنے نہ دیا۔ رودادِ محبّت کے نازک پہلو بھی بیان نہ ہو سکے۔ صرف زبان کی خوبی کہاں تک مدد کرتی۔ جب رومانی شاعری سے الگ ہو کر یا یوں سمجھیے کہ جب مثال پسندی سے نظریۂ عشق کو حقیقت و عملی زندگی کی کسوٹی پر پرکھ کر اظہارِ خیال کی کوشش کی تو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ ان کی اس دور کی شاعری میں احساس کی شدّت بھی ہے اور صحت مند نظریہ بھی۔ غزلوں میں وہ صرف اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ جو عموماً تقلیدی ہوتی تھی اور نظموں میں غمِ جاناں کے بجائے غمِ دوراں کو زیادہ جگہ ملی۔ ہمہ گیر مصائب و آلامِ کو ان کی شاعری نے گیرائی و توانائی عطا کر دی۔ ایسا معلوم ہوا کہ پہلے وہ آپ بیتی بیان کرتے تھے، اب نظموں میں جگ بیتی بیان کرنے لگے

یہ سب اس وقت ہوا جب فیض نے عالمگیر تباہیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ یہ محسوس کرتے ہی فیض نے اپنے تخیّل و بیان کو پوری طرح ...... اس شاعری کے لئے صرف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احساس میں شدّت بھی پیدا ہوگئی اور بیان میں نشتریت بھی آگئی۔

فیض کے اندازِ بیان میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو اس دور میں کم ہی نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے وہ اختصار و جامعیّت ہے۔ نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیتِ محسوسات کو چھو کر نہیں نکل جاتے بلکہ ذہن کو اس طرح سے چھیڑتے ہوئے جاتے ہیں جیسے تیر نیم کش کسی دل کو، جس کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے اور ذہن بار بار اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ فیض کے کم کہنے کا بھی راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ شدّت سے کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تب ہی جذبات کو قلمبند کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ شعر کو حسین بنانے اور مفہوم کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کیلئے فن کاری پر پوری توجہ اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا کرنے کی فکر رہتی ہے۔ اس کے لئے مختلف صلاحیتوں کو یکجا کرنا پڑتا ہے جس کے لئے وقت کا سوال ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اشعار حسب خواہش زیادہ تعداد میں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اشعار کی یہ قلّت سینکڑوں کے سطحی اشعار و پرگوئی سے کہیں زیادہ وقیع ہے۔

فیض کے یہاں چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو اردو ادب میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں اور ان کے طرزِ تخیّل کا بہترین نمونہ مثلاً تنہائی، رقیب، یہ اردو ادب میں روزِ ازل سے چلے آتے تھے۔ ہر ادیب نے ایک ہی طرح سے ان موضوعات پر طبع آزمائی کی تھی۔ فیض نے تنہائی میں نفسیاتی مطالعہ اور احساسِ حقیقت کا

جتنا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ آپ اپنی مثال ہے۔ یہی حال ان کی اس نظم کا ہے جس کا عنوان رقیب ہے۔ رقیب کی برائی اور ذلت اردو شعراء کا عام مسلک تھا لیکن فیض نے جس محبت و احترام سے اس کو یاد کیا ہے اور جس خوبی سے اس نظم کو بنایا ہے۔ اس کی مثال اب تک اردو شاعری میں نہیں ملتی۔

۱۹۵۳ء میں فیض کا دوسرا مجموعہ 'دستِ صبا' شائع ہوا۔ اسے دیکھکر ان کی فن کاری کا اور بھی زیادہ اندازہ ہوا۔ اختصار اور جامعیت کے ساتھ حسین الفاظ حسین احساسات میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ تشبیہات و استعارات کا فیض نے سہارا نہیں لیا بلکہ دل کش انداز میں الفاظ کے خوبصورت دام میں خیالات کو پیش کیا ہے۔ تاریخی شعور اور نفسی الجھنوں کو شاعرانہ انداز میں سمو کر شعر بنا دیا ہے۔ اشارے اتنے صاف اور مفہوم اتنا واضح ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ اس دور میں اتنی تیزی سے کسی اور شاعر کے کلام کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ شروع میں ایک سال کے اندر دستِ صبا کے کئی ایڈیشن چھپ گئے تھے۔

علی سردار جعفری

سردار جعفری بلرام پور ضلع گونڈہ (اودھ) کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ میں ہوئی۔ یہیں کے ماحول میں پرورش پائی اور اسی یونیورسٹی سے ایم۔اے پاس کیا۔ سردار جعفری اپنی طالبعلمی کے زمانے میں بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ تقریر کرنے اور مضامین لکھنے میں اکثر انعامات حاصل

کر چکے ہیں۔ یونیورسٹی میں جب پڑھتے تھے تب ہی سے اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ نظم و نثر دونوں میں یکساں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ ابتدائے شعور سے ترقی پسند ادب سے وابستہ تھے۔ ایک زمانے میں صوبائی ترقی پسند انجمن کے سیکرٹری بھی تھے۔

سردار جعفری کا سیاسی شعور ادبی مذاق کے ساتھ برابر بڑھتا رہا۔ اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب کے وسیع مطالعے نے ان کی ذہنی نشوونما کو بڑی بلندی عطا کر دی۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کو اردو ادب میں مضامین، افسانے اور نظموں کی صورت میں پیش کیا۔۔۔۔۔۔ دوسرے ادب کی ترقی یافتہ اور قابلِ قدر فنی خوبیوں سے فائدہ اٹھا کر اردو ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے جعفری کے کلام کا ایک مجموعہ 'پرواز' کے نام سے پہلے ہی نکل چکا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیال و بیان کی ندرت ان کو اردو شاعری میں ایک دن ممتاز جگہ دے گی۔ ادھر ان کی جو نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح تھا۔ مارکسی نظریۂ حیات کو جس خوبی سے جعفری نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے، اس طرح ہمارے نزدیک ابھی تک اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا سیاسی شعور اور ان کی زندگی ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جس طرح وہ سوچتے ہیں اسی طرح زندگی بسر کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس رویّے نے احساس اور صداقت دونوں کو ابھار دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خلوص و مشاہدہ ان کی شاعری کے وہ خاص جوہر بن گئے ہیں۔ چونکہ شعریت مزاج میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس لئے کلام میں تاثیر کی بھی کمی نہ رہ گئی۔

جعفری کی شاعری میں خیالات کی وہ بلندی تو ابھی نہیں آئی کہ جو ان کو وہ بلندی عطا کر دے کہ وہ اقبال کے قریب پہنچ سکیں لیکن جس بے باکی اور جوش

کے ساتھ وہ نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں اس میں ایک خاص گیرائی و دلکشی ہے۔ ان کی نظموں میں للکار اور سرگرمی دو ایسے عناصر ہیں جو اقبال کے بعد کے ماحول کی ترجمانی کے لئے بے حد ضروری تھے صاف صاف بے باکانہ ہر ایک بات کو بغیر تشبیہ و استعارے کے پردوں کا سہارا لئے ہوئے بیان کر دینا جعفری کا خاص حصّہ ہے

جوش نے جہاں اپنی سیاسی شاعری کو ختم کیا تھا وہ ایسا موڑ تھا کہ آگے راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اردو شاعری میں ایک جمود آچلا ہے۔ اس جمود کو جعفری نے ختم کیا اور ایک نئے باب کا اس طرح اضافہ کیا کہ مشینوں اور گولہ بارود، ٹینک وغیرہ کی حرکات و سکنات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر ادب کو ایک نیا راستہ آگے چلنے کا بتا دیا۔ اس معرکہ میں انھوں نے وہ شعریت پیدا کر دی ہے کہ ہر مشین اور اس کے متعلّقات حسین سے حسین تر اور مکروہ سے مکروہ تر نظر آنے لگتے ہیں۔ پورا منظر فن کاری کا نمونہ بن جاتا ہے۔

جعفری کے اب تک کئی مجموعے پرواز کے علاوہ شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً خون کی لکیر۔ نئی دنیا کو سلام۔ امن کا ستارہ۔ ایشیا جاگ اٹھا۔ پتھر کی دیوار۔

احمد ندیم قاسمی

۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع شاہ پور (پنجاب) کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ جس گھر میں احمد ندیم پیدا ہوئے۔ یہ کبھی دنیوی حشمت کی وجہ سے بہت ممتاز تھا مگر ان کی ولادت کے زمانے میں وہ حشمت ختم ہو چکی تھی اور بقول خود "جب میں نے آنکھ کھولی تو میرا گھر افلاس و بدحالی کا عجب مرقع تھا۔" ابتدائی تعلیم گاؤں

ہی میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں باپ کے مرجانے کے بعد تعلیم و تربیت ان کے چچا نے دی۔ چچا باوجود سرکاری ملازمت کے علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ عربی و فارسی سے بڑا شغف تھا۔ اردو سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اقبال کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس لئے اقبال کی شاعری کا برابر تذکرہ کیا کرتے۔ ان کے کلام سے بڑا انس تھا اور یہی انس احمد ندیم قاسمی کو منتقل ہو گیا۔

احمد ندیم نے بارہ سال کی عمر ہی میں علمی ذوق کا عملی ثبوت دیا۔ ایک چھوٹا سا ناول ۸۰ صفحے کا لکھ ڈالا اور کچھ اشعار بھی کہہ ڈالے۔ یہ ذوق رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے پاس کر کے بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کبھی بیس روپے کی ملازمت ملی۔ کبھی چالیس کی غرض کہ بدحالی میں گزری۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں کسبِ معاش کے لئے دوڑتے رہے۔ ۱۹۳۹ء میں ملتان کے محکمہ آبکاری میں کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن تین سال بعد اس ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں تہذیبِ نسواں اور پھول کے ایڈیٹر ہو گئے۔ یہ احمد ندیم کی ادبی زندگی کا نیا دور تھا۔ ایک سال بعد ادبِ لطیف کے مدیر ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں اس سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی لاہور میں ادبی و علمی مشاغل کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ علاوہ اور کاموں کے آپ کل پاکستان ترقی پسند انجمن مصنفین کے سیکرٹری بھی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اپنے کلام کی بدولت اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "جلال و جمال" شائع ہو چکا ہے جس کے دیکھنے سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سب سے پہلی چیز ان کے اس مجموعہ کلام میں جو ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ تنوّع ہے۔ مضامین میں بھی تنوّع ہے اور اصناف و بحور کے انتخاب میں بھی۔ یہ خوبی صرف ایک ذہین

اور زمانہ شناس فن کار ہی کے یہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ تقلید سے شاعر کو بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ندیم کے طرزِ بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے۔ لب و لہجہ کے انداز میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ زبان ٹکسالی و با محاورہ کم ہے۔ فارسی و عربی کی تراکیب سے عموماً کام لیتے ہیں۔ لیکن روانی میں فرق نہیں آتا۔ ان کا اندازِ تخاطب نہایت دلکش اور پُر تاثیر ہے۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تو شدّت کے ساتھ اس کا اثر لیتے ہیں اور یہ احساس، صداقت، بے باکی اور برجستگی کے علاوہ کلام میں خلوص اور جوش ابھار دیتا ہے۔

چونکہ ندیم کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور زندگی اب تک دکھ اور درد کا شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ اس لئے موضوع یا خیال میں نہ تو تکرار ہے اور تازگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاعری کو ہمیشہ بے اثری اور واعظانہ انداز سے بچاتے ہیں۔ کلام میں درد، کسک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے، اسی سے ان کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروش بہت کم ہے۔ عموماً وہ دقیق النظری سے کام لے کر اپنی شاعری میں عظمت و معنویت پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارے بڑے حسین نظم کرتے ہیں، مگر منظر نگاری میں ابھی ان کا قلم وہ پرکاری نہیں پیدا کر سکا۔ جو جوش یا علی سردار جعفری کو حاصل ہے۔ البتّہ متانت و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے۔

ندیم کی غزلوں میں فطری عنصر زیادہ ہے۔ عشقیہ مضامین یا رازِ محبت زیادہ نہیں۔ اس صنفِ شاعری میں ندیم کے یہاں سپردگی و ربودگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً غمِ دوراں نے غمِ جاناں کو زیادہ مچلنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن بغیر اس کے بھی ندیم کی غزلوں میں تغزّل بھی ہے اور برجستگی بھی۔

وامق

احمد مجتبیٰ وامق جون پور کے ایک موضع کج گاؤں میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے ان کے والد مصطفیٰ احسین صاحب کلکٹر تھے۔ گھر پہلے سے بھی خوش حال تھا۔ دولت سے زیادہ ادبی سرمایہ خاندان میں تھا۔ وامق کے دادا مجتبیٰ حسین نہ صرف عربی و فارسی کے عالم تھے بلکہ سنسکرت وجوتش کے بھی زبردست ماہر سمجھے جاتے تھے۔ باپ کی ملازمت کی وجہ سے وامق کی تعلیم ایک جگہ نہ ہوسکی۔ کبھی فیض آباد میں پڑھا۔ کبھی بارہ بنکی اور کبھی لکھنؤ میں بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کرکے وکالت شروع کی اور اسی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی۔ وکالت چھوڑ کر نوکری کرلی مگر شاعری نہ چھوڑ سکے۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کی ایک خاص وجہ شاعری تھی۔ کیونکہ جس قسم کی باتیں وہ کہنا چاہتے تھے وہ سرکاری ملازمت میں ممکن نہ تھیں۔

یوں تو وامق کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ کچھ قطعات، رومانی نظمیں اور غزلیں وہ پیشتر بھی کہہ چکے تھے۔ مگر ان کے جوہر اس وقت تک نہ کھلے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے ان کی شاعری و شہرت میں ترقی ہوئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ وامق نے اپنی ذہانت اور فطری دردِ دل سے متاثر ہوکر ہندوستان کے اس کرب کو محسوس کرلیا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ لوٹ، قحط، استحصال کی گرم بازاری، رجعت پسند طاقتوں کا ابھار، تعمیر کے بجائے تخریب کی پسِ پردہ کوششیں، ایسی مصیبتیں تھیں جنھوں نے اکثر ترقی پسندوں کے حساس دلوں کو چوٹ پہنچائی۔ چنانچہ وامق کو بھی ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس اور فاشستی قوتوں پر غصہ آگیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو وقت کی پکار بناکر دنیا کے سامنے پیش کیا اور چونکہ محسوسات و فن کا ایک خوبصورت اجتماع

کلام میں نظر آیا۔ لہٰذا وامق کی شہرت بہت جلد دنیائے ادب میں ہوگئی۔

اب تک وامق کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کا نام "چیخیں" اور دوسرے کا نام "جرس" ہے۔ ان مجموعوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی وامق نے اپنی بعض نظموں کی بنا پر اردو شعراء میں ممتاز جگہ بنالی تھی۔ 'بھوکا بنگال'، 'مینا بازار'، 'تقسیم پنجاب'، یہ نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ وامق نئے شاعروں کی صف اوّل میں شمار ہونے لگے۔

وامق کے کلام میں دلکشی بھی ہے اور فن کاری بھی۔ وہ جو بات محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں اور چونکہ شاعرانہ صلاحیتیں اچھی طرح موجود ہیں اس لئے کلام پُر تاثیر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مقصد یا نقطۂ نگاہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کرتے ہیں۔ عموماً جامعیت اور صاف گوئی ان کی شاعری میں ہر جگہ جاذب نظر ہیں۔ الفاظ اور بحروں کا انتخاب وامق بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں۔ موضوع بحر سے ہم آہنگ ہو کر معنویت کو زیادہ سے زیادہ ابھار دیتا ہے۔

وامق کے مجموعے میں آزاد و پابند نظمیں دونوں ہیں۔ ہر جگہ غنائیت اور قدم قدم پر مقصد نمایاں ہے۔ غزل پر بھی وامق نے طبع آزمائی کی ہے مگر حسن و عشق سے زیادہ سیاسی نظریے اور عوامی تحریک و جذبات ان میں پیش کئے ہیں۔ عشقیہ عناصر کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن صحت مند جذبات اور لب و لہجہ کی تازگی ان کا بدل پیش کر دیتی ہے۔ غرض کہ بقول احتشام حسین:

"وامق کی شاعری برابر ترقی کرتی، زندگی کے مسائل کو سمجھتی سمجھاتی، وسعت اور گہرائی پیدا کرتی بڑھ رہی ہے"۔ اگر انھوں نے اسی سوجھ بوجھ اور فن کاری سے کام لیا تو یقین ہے کہ وہ اردو کی صفِ اوّل کے شعراء میں جگہ پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔

موجودہ دور کی خصوصیات

۱۔ موجودہ دور میں مغربی اثر اور سائنس اور فلسفہ کے مطالعے سے
اردو شاعری زیادہ متاثر ہوئی۔ اس لیے اصلیت اور واقعہ نگاری شعراء
کے کلام میں روز بروز زیادہ ہوتی گئی ہے۔ بے کیف مبالغہ اور تصنع شاعری
سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ صداقت اور اصلیت، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے
علاوہ جذبات و واردات کے اظہار ہی تک محدود رہتی ہے۔ اس معرکہ
میں جہاں کہیں شعراء ناکامیاب رہے ہیں وہاں کلام خشک اور بے رنگ
ہو گیا ہے لیکن جہاں سنبھل گئے ہیں وہاں زور، تاثیر اور شاعری کے محاسن
کافی پیدا ہو گئے ہیں۔

۲۔ موضوعاتِ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ مسلسل اور
مستقل نظموں کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ ہمارے ادب میں نظر آنے لگا۔ اس
دور کے قبل مسلسل نظمیں، مثنویاں، ہجویات، واسوخت، قصائد و شہر آشوب
شکارنامہ یا چند ایسے ہی اور موضوعات تک محدود ہیں۔ فن اور محاسنِ شاعری

کے زیرِ عنوان انیسؔ اور دبیرؔ نے مستقل نظموں کی عظمت اور اہمیت و ہر دلعزیزی جس حد تک بڑھا دی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن موضوعات کو الگ الگ قائم نہیں کیا۔ آزادؔ، حالیؔ، اسمٰعیلؔ کے ہاتھوں مستقل نظموں کی تعداد اور اقسام اور عنوانات کی تجدیدِ حیات ہوئی اور جتنا ذخیرہ مسلسل نظموں کا گزشتہ پچاس برس میں تیار ہوا ہے اتنا اردو شاعری کی عمر بھر میں نہیں ہو سکا ملک کے مختلف حصّوں سے اُردو رسائل کا نکلنا انگریزی نظموں کی مثال اور سیاسی و تمدّنی بیداری نے شاعری کو وسعتِ نگاہ عطا کر دی۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری کو گوناگوں وسائل اور عنوانات ہاتھ آئے۔

۳۔ نظموں کے سلسلہ میں ان مستقل ترجموں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ جو اس دور کے شاعرانہ کارناموں میں خاص چیزیں ہیں۔ سب سے چمکتی ہوئی مثال طباطبائی کی نظم "گورِ غریباں" ہے جو انگریزی شاعر ٹامس گرے کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ سلیمؔ پانی پتی نے چترنجن داس کے "ساگر سنگیت" کا ترجمہ بحرِ ترنم کے نام سے اِس خوبی سے کیا کہ اہلِ مذاق نے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ ان کے علاوہ متعدد انگریزی اور سنسکرت کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہوا۔ مثلاً "گیتا" کا ترجمہ اور کالیداس کا "رُت سنگھار" کا ترجمہ۔ "عروسِ سخن" کے نام سے اور اسی مصنّف کے "میگھ دوت" کا ترجمہ "پیکِ ابر" کے نام سے ان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ڈراموں کے بھی ترجمے ہوئے جن میں سے بعض منظوم ہیں اور اچھّے ہیں۔ کبھی کبھی نظمیں تصویریں کو دیکھ کر بھی لکھی گئی ہیں جن میں سے کئی ایک اچھی ہیں۔

۴۔ دورِ جدید میں غزل نے بھی نئے ساز سے نغمہ سرائی کی تاثیر۔ ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی۔ جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار پر خاص

توجہ کی گئی ہے تصنع اور لفظی بھرمار اور بیکار باتوں کے بجائے شعراء نے روانی بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطیف پُرمعنی کنایات موجودہ اُردو غزل کی امتیازی خصوصیتوں میں سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو واقعات و امور بادی النظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے اُن کو دوربین نگاہوں نے غیر متناہی و بے پایاں دیکھ کر شعرا کے کلام میں حیرت کے عنصر کو بہت بڑھا دیا ہے۔

۵۔ تصوف نے اصولی اور رسمی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ مسائل تصوف کا اطلاق سینکڑوں نئے عنوان سے شعرا کرنے لگے ہیں۔ اپنی شخصیت اور انفرادی لب ولہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے۔ متعدد غزلیں عشق حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ملیں گی۔

۶۔ موجودہ دور کی غزلوں کی ایک امتیازی شان نفسیات کا گہرا مطالعہ اور انسان و زندگی کے متعلق پُرلطف اظہار خیال ہے۔ مگر ایسے موقع پر کبھی کبھی شعرا کا قدم مہملیت کی طرف بھی جا پڑتا ہے۔

۷۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں جو الفاظ و ترکیبیں کثرت استعمال سے پامال ہو چکی تھیں ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے اندازِ بیان سے کلام کو سنوارنے کی جد و جہد جاری ہے

۸۔ یہ تو سب کچھ ہوا۔ مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولاپن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیز اثر کو نگاہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں۔ لطافت و رنگینی تو ملتی ہے، تاثیر و صداقت اور

دقّتِ نظری بھی موجود ہے۔ کیف و نغمہ کی بھی کمی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ تکلف اور خوشگوار زور دکی جھلک بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں۔ فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں کو کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے۔ اور قدم ڈگمگا کر راہِ راست سے غلط راستہ پر جا پڑتا ہے۔

۹۔ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت ترقی پسند تحریک ہے۔ جو ہندوستان میں منظم طریقہ پر ۱۹۳۶ء میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد حیات کو زیادہ سے زیادہ ادب سے قریب کرنا ہے۔ اس نظریے پر کاربند ادیب زیادہ تر مارکسی اور اشتراکی اندازِ فکر پر عامل ہیں۔ دورِ حاضر میں اس تحریک نے اُردو ادب پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ زیادہ تر ادیب اسی نظریے کے تحت ہی کام کر رہے ہیں۔ ان ادیبوں کو ترقی پسند مصنفین سے عموماً براہِ راست واسطہ ہے۔ اکثر غلط فہمی ہوتی ہے کہ جو شخص بھی دورِ جدید میں لکھ رہا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ یہ خیال غلط ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر لکھا جو شخص مارکسی اور اشتراکی نظریے سے کام کر رہا ہے صرف وہی ترقی پسند کہلانے کا مستحق ہے۔ باقی لوگ یا تو رجعت پسند ہیں یا کم از کم ترقی پسند نہیں ہیں۔

۱۰۔ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت آزاد نظم کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی۔ جس میں قافیہ و ردیف کی خاص قید نہیں ہے۔ بحر کے ٹکڑے کر کے آہنگ کی صورت میں چھوٹے بڑے مصرعے لکھے جاتے ہیں لیکن ایک ہی بحر کا شروع سے آخر تک التزام رہتا ہے۔ وزن البتہ کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس تھوڑی مدت میں یعنی جب سے یہ وجود میں آئی ہے کئی ایک قابلِ قدر نظمیں آزاد نظم کی قبیل میں آ چکی ہیں۔ جس کے ذمہ دار علی سردار جعفری، فیض، ن۔ م۔ راشد

اور واضح ہیں۔

نظم پسندی نے لوگوں کو کوئی دس سال تک غزل کے خلاف کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی تکنیک اور موضوع قابل قدر معلوم ہوئے چنانچہ غزل کو دوبارہ زندگی ملی۔ آج کی غزلوں میں زیادہ تر تازگی اور تنوع ہے اور عشقیہ مضامین کم ہیں۔ سیاسی اور سماجی اشارے زیادہ ہیں۔

اس دور میں رباعی پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ بلند خیالی اور سنجیدگی سے کام لیا گیا ہے۔ ہر طرح کے مضامین اس صنف میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ صنف ابھی بہت ترقی کرے گی۔

باب اوّل

(نثر کی تاریخ)

جیسے جیسے تحقیقات کی جاتی ہے، اردو نثر کی عمر عام خیال سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ پہلے لوگوں کو خیال تھا کہ فضلی کی "دہ مجلس یا کربل کتھا" اردو نثر کی غالباً سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۱۴۵ھ میں بعہدِ محمد شاہ لکھی گئی۔ مگر اب تحقیق و جستجو نے بتایا کہ اس سے بہت پہلے دکن میں نثر کا وجود ظہور میں آچکا تھا[1]۔ چنانچہ کہا جاتا

[1] "داستانِ تاریخ اردو" میں حامد حسن صاحب قادری ص۱۹ پر لکھتے ہیں کہ "خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء (۷۰۸ھ) میں تصنیف کیا۔" اور اس دعوے کے اطمینان پر مدعی ہیں کہ یہ خیال غلط ہے کہ دکن میں اردو بہ نسبت شمال کے پہلے تصنیف کی بنیاد پڑی۔ ضرورت یہ تھی کہ اس کتاب کا پتہ نشان قادری صاحب بتاتے۔ اتنے دعویٰ کے لئے ضروری تھا کہ اس نسخہ کو اور لوگ بھی دیکھ سکتے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی خاص اہمیت ہوتی۔ اس کا شائع ہونا بھی ضروری تھا۔ نہ معلوم صیغۂ راز میں یہ کتاب کیوں ہے۔

ہے کہ اس کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری سے ہوئی اور "شیخ عین الدین گنج العلم" کے رسالے سب سے قدیم ہیں۔ شیخ موصوف کا انتقال ۷۹۵ھ میں ہوا[1]...... افسوس ہے کہ ان کے رسالے ہمارے پیشِ نظر نہیں۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا ہے۔ البتہ خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد گیسو دراز کی ایک تصنیف ...... "معراج العاشقین" شائع ہو گئی ہے۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۸۲۵ھ میں ہوا۔ لہٰذا یہ کتاب یقیناً اس سے پہلے لکھی گئی ہوگی یہ کتاب مذہبی امور پر مبنی ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے[2]۔:

" ایک بادشاہ کی تعظیم ایک امیر کوں بڑی کرتا ہے، تو اوّل جا بجا آرائش کرتا ہے، سو محمد کو پانچہ تن سنوار کر سات آسمان کے اُوپر لائے۔ لنگے ہو کے عروج نے لے کر چالے ناسوت کی منزل سوں۔"

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ نثر کی ابتدا کم سے کم آٹھویں صدی ہجری سے ہو گئی تھی مگر فی الحال کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قطعی تاریخ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تلاش و فکر سے ابھی کچھ اور آگے کا بھی پتہ چلے۔ لہٰذا ابھی عرصہ درکار ہے کہ یقین کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ خواجہ گیسو دراز تک موقوف نہیں رہا بلکہ اس میدان میں کچھ اور بھی اہلِ قلم نظر آتے ہیں مثلاً خواجہ صاحب کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی جو سلطان احمد شاہ ثانی کے زمانے میں گزرے ہیں انہوں نے غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے رسالہ "نشاۃ العشق" کا دکھنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی تھی[3]۔

---

[1] اردوئے قدیم ص۴۱ و ص۴۲ ۔ [2] معراج العاشقین ص۱۵ ۔ [3] اردوئے قدیم ص۴۲

دکن کے ایک دوسرے بزرگ جن کا کارنامہ ملتا ہے ۔ وہ میراں جی شاہ شمس العشاق ہیں ۔ انھوں نے سنہ ۹۰۲ھ میں انتقال کیا ۔ ان کا قلم نظم و نثر دونوں میدان میں رواں تھا ۔ چنانچہ کئی رسالے نثر میں لکھی ہیں ۔ چند کے نام یہ ہیں :

(۱) جل ترنگ (۲) گل باس (۳) شرح مرغوب القلوب ۔ ان میں شاہ صاحب نے تصوّف کے مسائل بیان کئے ہیں ۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے اس دور کی کتابوں میں وجہی کی "سب رس" قابلِ ذکر ہے ۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے ۔ مولوی عبد الحق نے اس کو مع ایک مبسوط مقدمہ اور فرہنگ کے شائع کیا ہے ۔ عبد الحق صاحب ایک جگہ صفحہ ۶ ، ۷ پر لکھتے ہیں کہ : " یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص ممتاز حیثیت رکھتی ہے ۔ " قصہ بھی عجیب ہے اور طرزِ بیان بھی عجیب ۔ مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز کے پیرایے میں بیان کیا ہے اور حسن و عشق کی کشمکش اور "عشق و دل" کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ اس کتاب کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن روانی اور سلاست بہت کافی ہے ۔ قصہ کے درمیان مصنف جا بجا پند و نصائح سے بھی کام لیتا رہتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ جا بجا اس زمانے کی طرزِ معاشرت کا بھی بیان آجاتا ہے ۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے :

"عقل بغیر دل کوں نور نہیں ، عقل کو خدا کہنا بھی کچھ دور نہیں ۔ ذات تے صفات ہے ۔ ذات تے جو کچھ نکلیا سو بے ذات ہے ۔ جوں رفتا ہور اس کا لوز کیوں ہوئے مشہور ۔"

سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب ایک بزرگ میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا اور دلائل الاتقیا کا ترجمہ دکھنی زبان میں کیا ۔ مؤلف اردوئے قدیم کا بیان ہے کہ یہ ترجمہ نہایت صاف و سادہ زبان میں ہے ۔ مترجم نے کتاب میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے ۔ مضامین اور ان کی تقسیم اصل کے بالکل مطابق ہے[1]

[1] اردوئے قدیم صفحہ ۱۱۰

عالمگیر کے زمانے میں ایک بزرگ سید شاہ محمد قادری گزرے ہیں۔ جو اپنے پولہ (جس کا نام عالمگیر نے فیروز نگر رکھا) کے ایک خاندان "نوردیا" سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی کئی مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ سید شاہ میر نے ایک کتاب "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔ نام سے ظاہر ہے کہ توحید کے متعلق ہے۔

ان بیانات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نثر کی ابتدائی نشوونما کا فخر بھی دکن ہی کو حاصل ہے۔ گو ان میں زیادہ تر کتابیں مذہبی ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں مگر پھر بھی زبان کی عہد بعہد ترقی کا کافی پتہ چلتا ہے۔ شمال میں نثر کی ابتدا، اس لحاظ سے کم وبیش ایک صدی کے بعد ہوئی۔ کیونکہ فضلی کی "دہ مجلس" ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔ یہاں فارسی کا غلبہ اس قدر تھا کہ اردو میں لکھنا لوگ ننگ وعار سمجھتے تھے۔ اس کے بعد بھی عرصہ تک خطوط وغیرہ فارسی میں لکھے جاتے رہے یہاں تک کہ مرزا غالب نے بھی ریختہ کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھا اور پھر دوسری وجہ نظم کی ہر دل عزیزی تھی، رقعے وغیرہ بھی نظم ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اسی شاعری کا چسکا اور فارسی کا اثر تھا کہ اردو نثر بھی عرصہ تک مقفیٰ و مسجع لکھی جاتی رہی۔ چنانچہ "دہ مجلس" کی عبارت اسی قسم کی ہے۔

"پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہووے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے۔"

سودا نے اپنی کلیات کی ابتدا میں جو نثر لکھی ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عبارت عموماً رنگین مشکل اور مقفیٰ ہوتی تھی۔ اس دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں:

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ

کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ ٔ دُر زبان اپنی سے صفحہ ٔ کاغذ پر تحریر پائے۔"

ایک اور مشہور کتاب جو اسی عہد میں لکھی گئی وہ نوطرز مرصّع ہے۔ یہ کتاب قصّہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے ۱۷۹۸ء میں اس مشہور کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی بھی عبارت رنگین اور مقفّیٰ ہے۔

فورٹ ولیم کالج

آخر وقت آگیا کہ سلطنت کو اردو کی امداد کی ضرورت پڑی اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کی سرپرستی کرکے حکّام سرکاری کو اس زبان سے واقف کیا جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو کوشش کی جائے کہ ہر شخص اس کو سمجھنے اور استعمال کرنے لگے چنانچہ اس خیال کو پورا کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج مناسب سمجھا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اردو ادب کا مرکز قرار دیا گیا۔ اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے۔ انھوں نے اردو کی ترقی کے لئے ان تھک کوشش کی۔ ملک کے بہترین انشا پردازوں کو اکٹھا کرکے ایسی کتابیں لکھوائیں جو عام فہم اور دلچسپ ہوں۔ رنگین عبارت اور مقفّیٰ تحریر سے ایک قلم گریز کیا بلکہ سلیس اور رواں عبارت پر زور دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو بہت جلد عام فہم اور دلکش نظر آنے لگی۔ تھوڑے ہی دن میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ اس زمانے کی چند خاص ہستیاں یہ ہیں۔

میر امّن، شیر علی افسوس۔ میر بہادر علی حسینی۔ حیدر بخش حیدری۔ میر کاظم علی جوان۔ نہال چند لاہوری۔ مظہر علی خاں ولا۔ حفیظ الدین احمد۔ للو لال جی۔ بینی نرائن مرزا علی لطف۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کی جو سرپرستی کی ہے۔ اس احسان سے اردو ادب سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ متعدّد قابلِ قدر اہلِ قلم کو بُلا کر ادبی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی۔ جس سے ایک بیش بہا ذخیرہ تیّار ہو گیا۔ نہ صرف قصّہ کہانی

کی کتابیں لکھی گئیں بلکہ اخلاق، مواعظ، تاریخ، سوانحعمری، لغت، علم اللسان پر بھی توجہ کی گئی اور کچھ نہ کچھ ان کے متعلق بھی سرمایہ اکٹھا کر دیا گیا۔

اس کالج کے انشاپردازوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مقفّیٰ و مسجّع عبارت سے گریز کرکے انھوں نے سیدھی سادی عبارت کا رواج دیا (میرامّن کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہم نے جو تنقید پیش کی ہے کم و بیش وہ اس کالج کے جملہ منشیوں پر صادق آتی ہے)

اس کالج کا اثر تمام ملک پر پڑا۔ رفتہ رفتہ سبھوں نے فرسودہ طریقہ یعنی رنگین اور مغلق عبارت کو چھوڑ کر سادگی اختیار کی۔ دہلی والوں نے بہت جلد اس روش کو قبول کر لیا۔ البتہ اہل لکھنؤ نے اس راستہ کو اختیار کرنے میں کچھ دیر تردّد اور تکلّف سے کام لیا۔

ایک اثر اس کالج کا یہ پڑا کہ فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ کی اردو میں کمی ہو گئی۔ ہندی اور اردو کے وہ الفاظ کام میں آنے لگے جو عام طور سے کم پسند کئے جاتے تھے۔ تحریر محض اس لئے تھا کہ زبان عام فہم ہو جائے۔

اب اردو نثر کی طرف تمام ہندوستان کی نظریں پڑنے لگیں۔ اطراف و جوانب سے بھی لوگوں نے قلم اٹھایا۔ سید انشاء اللہ خاں نے اردو زبان کی قواعد دریائے لطافت ۱۸۰۲ء میں لکھی۔ ۱۸۲۳ء میں مولوی محمد ابراہیم نے صرف و نحو کی ایک کتاب "تحفہ الفنڈس" تحریر کی۔ اسی طرح سے منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی ۱۸۴۵ء میں لکھی گئی اور اسی سلسلہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے جامع القواعد لکھکر لاہور میں شائع کی۔ علاوہ ان کے چند اور لوگوں نے چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف موضوع پر قلمبند کئے

میر امّن

اس عہد کے سب سے ممتاز مصنف میر امّن دہلوی ہیں اور ان کا مشہور کارنامہ "باغ و بہار" ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ روانی اور سلاست کے علاوہ محاوروں کا صرف اور زبان کی لوچ نہایت خوبی کے ساتھ نباہتے ہیں۔ میر عطا حسین تحسین نے چہار درویش کا فارسی سے پہلے اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن فارسی، و عربی کے غیر مانوس الفاظ نے اردو میں مقبولِ عام نہ ہونے دیا۔

میر امّن نے نئے سرے سے اس کتاب کو فورٹ ولیم کالج میں لکھنا شروع کیا اور اس خوبی کے ساتھ لکھا کہ عوام اور خواص دونوں سے قبولِ عام کی سند حاصل کی۔ لوگوں کے جذبات حفظِ مراتب کے ساتھ اس طریقہ پر ادا کئے کہ عورت اور مرد نوکر اور آقا جس کا ذکر آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے وہ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں فارسی یا سنسکرت کے الفاظ آ گئے ہیں وہ بجائے ناگوار معلوم ہونے کے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر امّن نے کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو لغت کے لحاظ سے نامناسب ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عوام کی زبان پر رائج تھے۔ لہٰذا انھوں نے اردو کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے اس بات کو روا رکھا۔

میر امّن کے آبا و اجداد ہمایوں بادشاہ کے وقت سے مغلیہ سلطنت سے وابستہ تھے۔ شاہی دربار سے ان کو جاگیر بھی عطا ہوئی۔ احمد شاہ درّانی کے حملے کے وقت میر امّن کا بھی گھر لوٹا گیا۔ اور سورج مل جاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر بھی ضبط کر لی

اس وقت ان کو مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا۔ کئی برس عظیم آباد میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے کلکتہ پہنچے۔ وہاں دو سال تک نواب دلاور جنگ کے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق رہے۔ اسی زمانے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر جان گل کرسٹ سے کرا دیا۔ موصوف نے نہایت خوشی سے میر امّن کو فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں قصۂ چہار درویش کو سلیس نثر میں لکھنے کے لئے مامور کیا۔

اس کتاب کی خوبی کے لئے یہی دلیل کیا کم ہے کہ سو برس سے زیادہ ہو گئے مگر اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر میر امّن کو اس کارنامہ پر فخر تھا تو بیجا نہ تھا ہمارے نزدیک یہ کتاب ان کے لئے حیاتِ جاوید سے کم نہیں۔ میر امّن کی دوسری کتاب "گنج خوبی" ہے۔ یہ انوارِ سہیلی کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو شہرت نصیب نہیں ہوئی

میر شیر علی افسوس

میر افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خاں کے سرکار میں ملازم تھے۔ امیر خاں کے انتقال کے بعد افسوس کے والد یعنی میر علی مظفر خاں پٹنہ چلے گئے۔ وہاں نواب میر قاسم کے یہاں سلسلۂ ملازمت قائم ہو گیا اور یہ سلسلہ نواب میر جعفر کی حکومت تک باقی رہا۔ میر شیر علی افسوس اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے پھر لکھنؤ واپس آئے۔ لکھنؤ کی فضا میں اس وقت شاعری ہر طرف جلوہ گر تھی۔ افسوس نے بھی اپنے کلام کی داد اہلِ فن سے لی۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں افسوس کو موقع ملا کہ کرنیل اسکاٹ کے دل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھائیں۔ کرنیل صاحب نے دو سو روپیہ مشاہرہ پر افسوس کو کلکتہ

بھیجا اور پانچسو روپے زادِ راہ کیلئے دیئے۔ کلکتہ پہنچکر وہ فورٹ ولیم کالج کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں گلستاں کا ترجمہ اردو میں کیا جس کا نام باغِ اردو رکھا اور یہی سالِ اختتام کا مادّہ تاریخ بھی ہے۔ اس ترجمہ میں شیر علی افسوس نے زبان کی سلاست اور ترجمہ کی خوبی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

ان کی ایک اور کتاب ہے جو ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور کسی قدر تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام آرائشِ محفل ہے۔ اس کو حیدر بخش کی آرائشِ محفل (قصہ حاتم طائی) سے کوئی تعلق نہیں۔ شیر علی افسوس نے سودا کے کلیات کو صحیح کرکے دوبارہ شائع کیا۔ ان کا خود بھی ایک دیوان ہے جو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا سالِ انتقال ۱۸۰۹ء ہے۔

سیّد حیدر بخش حیدری

دلّی کے رہنے والے اور سیّد ابوالحسن کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن نجف اشرف تھا۔ سیّد ابوالحسن نے دلّی کو خیرباد کہہ کر بنارس میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حیدری کی ذہنی نشوونما بنارس میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی قدردانی کا حال سن کر حیدری نے ایک کتاب لکھی اور اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور حیدری کو فوراً بلاکر منشی کی جگہ دی۔

حیدری نے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے۔ اور ایک بڑا کارنامہ اپنی یادگار میں چھوڑا۔ ان کتابوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

۱۔ قصہ لیلیٰ مجنوں۔ امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ۔

۲۔ طوطا کہانی۔ یہ قصّوں کی کتاب ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے۔ جس کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا تھا اور اسی سے حیدری نے اردو میں لیا ہے۔

۳۔ آرائشِ محفل۔ یہ حاتم طائی کا ترجمہ ہے۔ حیدری نے اس کی زبان نہایت سلیس اور با محاورہ رکھی ہے جس کی وجہ سے قصّوں کے پیچیدہ ہونے کا برا اثر کم پڑتا ہے اور دلچسپی قائم رہتی ہے۔ قصّہ کی پیچیدگی کا ذمّہ دار حیدری کو ٹھہرانا نامناسب ہے اس لئے کہ وہ محض مترجم تھے۔

۴۔ تاریخ نادری۔ فارسی تصنیف "جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ ہے، اصل مصنّف مرزا مہدی ہیں۔

۵۔ گلِ مغفرت۔ یہ روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۱۲ء ہے۔

۶۔ گلزارِ دانش۔ یہ فارسی کی مشہور کتاب بہارِ دانش مصنّفہ شیخ عنایت اللہ کا اردو ترجمہ ہے جس میں عورتوں کی ابلہ فریبی اور مکّاری کے قصّے درج ہیں۔

۷۔ ہفت پیکر۔ نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے۔

۸۔ قصّہ مہر و ماہ۔ یہ کتاب نایاب ہے۔

۹۔ گلدستہ حیدری۔ متفرق تالیفات ہیں۔ مراثی۔ حکایات۔ لطائف۔ غزلیات اور قصائد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی کمیاب ہے۔

۱۰۔ گلشنِ ہند۔ اردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔

حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا۔

نہال چند لاہوری

ان کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ پیدائش دلّی کی تھی لیکن لاہور میں زیادہ رہنے کی وجہ سے لاہوری کہلائے۔ کپتان ولورٹ کی سفارش سے ڈاکٹر گل کرسٹ نے سنہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ بلاکر فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی۔ نہال چند لاہوری نے کئی ایک کتابیں لکھیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور " مذہبِ عشق " ہے۔ جس کا دوسرا نام قصۂ گل بکاؤلی ہے۔ جو فارسی کے قصّہ کا ترجمہ ہے۔ اس کا سن تصنیف سنہ ۱۸۱۳ء ہے

مرزا کاظم علی جوان

مرزا کا وطن دہلی تھا مگر لکھنؤ کی قدردانی اور دلکشی نے اپنی طرف رجوع کیا اور یہیں آکر رہنے لگے۔ جب ان کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے تو کرنل اسکاٹ نے سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے لئے ان کو منتخب کیا۔ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر مرزا نے کلکتہ آباد کیا اور وہاں اکثر کتابوں کا ترجمہ کیا۔ فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ شکنتلا۔ یہ کالیداس کا سنسکرت میں لکھا ہوا مشہور ڈراما ہے جس کو نواز کبشر نے برج بھاشا میں پیش کیا تھا۔ جوان نے برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا۔ کاظم علی جوان کی یہ شکنتلا اردو کا ڈرامہ ہے۔

۲۔ بارہ ماسہ۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا بیان ہے۔

۳۔ تاریخ فرشتہ۔ اس مشہور تاریخ کے ایک حصّہ کا کاظم علی جوان نے اردو

میں ترجمہ کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ جوان نے قرآن مجید کے اردو ترجمہ کو بھی درست کیا مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز پر نظر ثانی کی اور شعراء کے کلیات کے انتخاب میں بھی مدد دی۔

مظہر علی خاں ولا

ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر عرف عام میں مظہر علی خان کہلاتے تھے۔ ان کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا اور وداد تخلص۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے وطن دلی تھا۔ مظہر علی خاں ولا فارسی، سنسکرت، ہندی کے عالم تھے۔ مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی یہاں رہ کر انھوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مثلاً :-

۱۔ مادھونل اور کام کنڈلا۔ موتی رام کشر کی ہندی کتاب کا ترجمہ جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا۔

۲۔ ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا۔

۳۔ بیتال پچیسی۔ بیتال نامی ایک شخص کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں پھر کسی نے برج بھاشا میں اس کو منتقل کیا۔ ولا نے برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔

۴۔ تاریخ شیر شاہی۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ختم ہوا۔

۵۔ جہانگیر نامہ۔ ترک جہانگیری کے ایک حصّہ کا ترجمہ ہے ولا کا ایک دیوان

بھی اردو میں ہے مگر نایاب سا ہے۔

مرزا علی لطف

ان کے والد کاظم بیگ خاں استر آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۵۴ھ ۱۷۴۱ء میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے۔ مرزا علی لطف کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے ان کو بھی اپنے یہاں بلا کر جگہ دی اور ان سے وہ کام لیا جو شاید ابھی تک کسی سے نہ لیا تھا۔ اردو شعراء کا تذکرہ لکھوایا........

........جس میں اس وقت کے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام ہیں۔ اس تذکرہ کا نام "گلشنِ ہند" ہے جو ایک مدت تک دنیائے ادب کی نظروں سے اوجھل رہا۔ بقول مرزا ثاقب ع

ہر اندھیرے میں اُجالا ہے اگر دل ہو نصیب

موسیٰ ندی کا وہ طوفان جس نے حیدر آباد کو بے شمار نقصان پہنچایا۔ اسی نے اس تذکرہ کو "گنج باد آورد" کی طرح دنیا میں پھر ظاہر کیا یعنی گلشنِ ہند کی ایک جلد سیلابِ عظیم میں بہتی چلی جا رہی تھی کہ ایک صاحب کے ہاتھ لگی۔ جس کو مولوی عبدالحق نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

للو لال جی

یہ گجراتی برہمن تھے۔ اوائلِ عمر میں شمالی ہند آ گئے تھے مگر اردو کے بھی ادیب تھے

خوش قسمتی سے یہ بھی اس کالج کے منشیوں میں کام کرتے تھے۔ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ ہندی کتابوں کے ترجمے کرنے میں اردو والوں کو مدد دیں اور ہندی کی کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی ایک مستقل تصنیف سنگھاسن بتیسی اردو میں بھی ہے۔

بینی نرائن

جہاں تخلص کرتے تھے۔ لاہور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ کرکے "چار گلشن" نام رکھا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات ہیں ۔ ۱۸۲۹ء میں "تنبیہ الغافلین" کا بھی ترجمہ اردو میں کیا۔ "دیوانِ جہاں" کے نام سے ایک تذکرہ بھی ان سے یادگار ہے۔

باب دوم

(فورٹ ولیم کالج سے باہر)

فورٹ ولیم کالج کا اثر تمام ہندوستان پر پڑا مگر اس سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ دہلی اور لکھنؤ بھی اردو ادب کے لئے آفتاب و ماہتاب
کا کام کر رہے تھے۔ یہاں کے رہنے والوں نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا
چند ممتاز نثر نگاروں کا حال اور کارنامہ قابلِ ذکر ہے۔

فقیر محمد خاں گویاؔ

ان کا نام فقیر محمد خاں تھا اور گویاؔ تخلص۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے۔
شاہی زمانے میں رسالدار تھے اور حسام الدولہ خطاب عطا ہوا تھا۔ زمانہ کا انقلاب
کہیے یا اردو کی خوش قسمتی سمجھیے کہ اس بہادر سپاہی نے تیغِ قلم سے بھی وہ کام لیا کہ

میدان ادب میں آج تک ان کا نام نمایاں ہے۔ فارسی کی انوار سہیلی ایک زمانے میں
مقبول عام تھی۔ چنانچہ ایک روز شیخ ناسخ اور میاں فرخ وغیرہ ایک صحبت میں بیٹھے
انوار سہیلی کی تعریف کر رہے تھے۔ تعریف میں کچھ ایسا مزا ملا کہ چند لوگوں نے کہا۔
کہ یہ کتاب اگر اردو میں بھی آجائے تو کیا عجب کہ زبان کے لئے مفید اور دلچسپ سامان
ہو جائے۔ سب کی نظرِ انتخاب فقیر محمد خاں گویا پہ پڑی۔ جنھوں نے اس کا ترجمہ کرنا
شروع کیا لیکن حقیقت میں گویا نے ترجمہ ہی تک اپنے ذہنِ رسا کو محدود نہیں رکھا
بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ برائے نام ترجمہ ہے۔ ورنہ گویا نے عبارت کے لحاظ
سے تصرّف سے کام لیا ہے جہاں یہ دیکھا کہ اصل کتاب میں قصّہ کسی موقع پر طولانی
ہے۔ طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے تو وہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ جہاں اصل
کتاب میں کوئی مزیدار بات مختصر لکھدی گئی ہے۔ وہاں دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے
بیان کو کسی قدر طول دیا ہے۔

اس کتاب میں گویا نے عربی اور فارسی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کئے
ہیں جس کی وجہ سے روانی اور شگفتگی کم ہو گئی ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گویا کا
زمانہ آج کا زمانہ نہ تھا کہ جب میں لوگ فارسی اور عربی سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس
وقت فارسی اور عربی کا عام چرچا تھا۔ اسی وجہ سے گویا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔
اپنی اس کتاب کے متعلق گویا نے جو خود رائے ظاہر کی ہے وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے
لکھتے ہیں: "جس نے انوارِ سہیلی کو دیکھا ہوگا۔ اب نظرِ تامل سے مطالعہ کریگا۔ اس
پر خود منکشف ہو جائے گا کہ گویا صورت کتاب کی اور ہی ہو جائے گی۔ برائے نام
ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا جدا ہے لیکن حق یوں ہے کہ احسان
نقاشِ اول کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔"

اس لحاظ سے گویا کے اس ترجمہ کو جس کا نام انھوں نے بستانِ حکمت رکھا ہے

تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بستانِ حکمت ۱۲۵۱ھ بوقت صبح صادق ختم ہوئی گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ ان کا دیوان ان کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ سرور لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ سال پیدائش ۱۲۰۱ھ ہے۔ سرور نے محض عربی اور فارسی کی تعلیم نہیں حاصل کی۔ مختلف فنون مثلاً خطاطی، موسیقی میں بھی وہ دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاج میں شگفتگی، ظرافت کی حد تک تھی۔ نہایت یار باش آدمی تھے۔ مرزا غالب ان کے دوستوں میں تھے۔ چنانچہ ان کی دو کتابوں پر مرزا نے تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر سرور کو جلاوطن کر دیا لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر سرور کو لکھنؤ بلا لیا اور ۱۸۴۶ء میں واجد علی شاہ نے اپنے درباری شعرا میں پچاس روپے ماہوار کی جگہ دی۔ جب سلطنت کو زوال ہوا تو سرور کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہا، کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر سے اعانت ہوتی رہی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں کوئی بھی سہارا نہ رہا۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والیِ بنارس نے اپنے یہاں بُلا لیا۔

سرور کو اکثر دہلی، لکھنؤ، میرٹھ اور راجپوتانہ بھی جانا پڑا۔ جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ کے علاج کے لئے کلکتہ بھی دیکھ آئے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں

بنارس میں انتقال ہوا۔

سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانۂ عجائب ہے۔ یہ ایک حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کی عبارت نہایت پرتکلف مقفّٰی اور مسجّع ہے۔ ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی زمانہ میں یہ رنگ پسند عام تھا۔ یہ کتاب نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اب زمانہ کا رنگ بدل گیا جس طرح سرور غیر سیدھی سادی عبارت کو ہنستے تھے۔ اسی طرح اب ان کی تصنیفات بھی عبارت کی وجہ سے ناپسندیدگی کی شکار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طرز تحریر تکلیف دہ اور غیر دلچسپ ہے یعنی خیالات کو آسانی اور آزادی کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ ہر قدم پر قافیہ، تشبیہہ، استعارے کے علاوہ وزن کی تلاش رہتی ہے۔ اس میں قابلیت اور زبان پر پوری دسترس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی قصّہ کو بھی ایک اچھا انشا پرداز کیونکر دلکش اور رنگین بنا سکتا ہے۔

سرور کی تصانیف کئی ایک ہیں شمشیر خانی کا ترجمہ واجد علی شاہ کے حکم سے ۱۸۴۷ء میں کیا۔ اور اس کا نام سرور سلطانی رکھا۔ یہ فردوسی کے شاہ نامہ سے ماخوذ ہے۔ "حدائق العشاق" کا ترجمہ مہاراجہ البشری پرشاد نرائن سنگھ کی فرمائش سے کرکے "گلزار سرور" نام رکھا۔ ان کے علاوہ چند کتابیں اور بھی ہیں۔ جن میں چھوٹے چھوٹے قصّے ہیں "انشائے سرور" اور "شگوفۂ محبّت" بھی ان کی یادگار ہیں۔

سرور کی تحریر کا ہر جگہ وہی عالم ہے جو فسانۂ عجائب کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس رنگ کے لکھنے والوں میں سرور کا پایہ سب سے بلند ہے۔

غالبؔ

خدا کی دین کہ جس طرح ان کا مرتبہ نظم میں عدیم المثال ہے۔ ویسا ہی نثر کے میدان میں بھی اپنی سادگی، لب و لہجہ اور یکسانیت کی وجہ سے بے نظیر ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ نظم میں جو شخص دقیق الفاظ کا گرویدہ ہو وہ نثر کے میدان میں آکر اس قدر سہل سلیس، شیریں اور دلچسپ طرز کا دلدادہ کیونکر ہوا۔

سب سے قابل قدر اور اہم بات جس کا اثر اردو پر پڑا وہ غالبؔ کے خطوط اور رقعات ہیں جن میں انھوں نے ایک نرالا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ یعنی القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ چھوڑ کر وہ روش اختیار کی کہ معلوم ہوتا ہے کوئی سامنے بیٹھا ہے جس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ کبھی میاں کبھی مہاراج اور کبھی مکتوب الیہ کا نام لے کر حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالات بھی اس قدر دلچسپ پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ دل پر فوراً اثر ہو۔ موقع اور محل کا ہر جگہ لحاظ رہتا ہے۔ جہاں کسی منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز پوری طرح نظروں کے سامنے آگئی۔

ان کے خطوط میں ان کے مزاج کی شوخی اور مزاح جابجا مترشح ہیں جس سے شگفتگی دوبالا ہو جاتی ہے انہی خطوط میں ایسے خطوط کی بھی کافی تعداد ہے جن میں ادبی اور علمی بحث ہے۔

خطوط کے علاوہ بھی مرزا غالبؔ کا نثر میں کارنامہ ہے۔ جس میں چند تقریظیں دیباچے اور رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کی موافقت میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن تقریظوں اور دیباچوں میں مسجع اور مقفیٰ عبارتیں ہیں جو کم و بیش رجب علی سرور کے رنگ میں ہیں۔ غالباً اس زمانے کے لوگوں کا مذاق دیکھ کر مرزا غالبؔ نے اس

تحریر کو بھی روا رکھا۔

سب سے بڑی چیز ان کے خطوط اور رقعات ہیں جن کی وجہ سے اردو نثر میں سادگی۔ صفائی اور روانی پیدا ہو گئی اور اس کی دلکشی اتنی عام ہوئی' یہ ہے کہ اردو ادب کو ایک نیا میدان مل گیا۔ جس میں آج تک لوگ گامزن ہے۔

ماسٹر رام چندر

ان کا ذکر "سیر المصنفین" جلد اوّل میں یوں لکھا ہے کہ پہلے آپ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں بہ عہدۂ مدرسی علوم انگریزی کی تعلیم دہلی کالج میں دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے انھوں نے بحث و مباحثہ کے بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ آپ ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھی مقرر ہو گئے تھے۔

ماسٹر رام چندر کی علمی قابلیت انگریزی تک محدود نہ تھی بلکہ عربی، فارسی، اردو میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور انھی زبانوں کے فیض سے آپ نے ایک کتاب ایسی تصنیف کی جس نے ان کا نام اب تک زندہ رکھا ہے۔ اس کتاب کا نام "تذکرۃ الکاملین" ہے۔ اس میں بہت سے دنیا کے نامور لوگوں کا تذکرہ ہے۔

آپ نے صرف یہی خدمت اردو کی نہیں کی بلکہ اصولِ علم ہئیت اور عجائب روزگار دو اور کتابیں لکھکر اردو کے خزانہ میں اضافہ کیا۔ یہ کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہ صرف اس وقت قابلِ قدر تھیں بلکہ آج بھی کارآمد اور ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ کئی ایک کتابوں کے ترجمے بھی ماسٹر

رام چندر کی یادگار ہیں۔ ان ترجموں کا موضوع زیادہ تر ریاضی ہے۔

ماسٹر رام چندر کا طرزِ تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے۔ نہ مقفیٰ و مسجع عبارت ہے اور نہ تشبیہہ و استعارات کی بھرمار۔ عربی کے الفاظ جابجا ضرور ہیں لیکن نہایت مزے کے ساتھ صرف کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ماسٹر رام چندر کی ولادت غالباً ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی۔ وفات کا سال نہیں معلوم۔

غلام امام شہید

ان کے والد کا نام شاہ غلام محمد تھا قطبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے سربرآوردہ شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ نظم میں قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ فارسی نثر و نظم میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے اصلاح لی تھی۔

الہ آباد میں پیشکار رہے لیکن آپ کی قدر و منزلت ہر چہار طرف ہوتی تھی چنانچہ حیدرآباد سے چار سو بیس روپے سالانہ بطور وظیفہ کے مقرر تھے جو آخیر وقت تک ملتے رہے نواب کلب علی خاں بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شہید اپنا کلام جمع نہیں کرتے تھے لیکن زمانہ کے دست و برد سے جو کچھ بچ رہا ہے۔ وہ مجموعہ مولد شریف انتشائے بہارِ بےخزاں اور چند قصائد کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

آپ کی تحریر پرانے زمانے کے رنگ کی تھی یعنی قافیہ پیمائی اور رنگینی سے عبارت خالی نہیں لیکن پھر بھی سلاست اور دلچسپی ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ بیان میں شاعرانہ تصرّف ضرور ہے لیکن نہ بھی کافی ہے۔ تاج گنج کے روضہ پر جو مضمون

لکھا ہے وہ اس رنگ کے لحاظ سے بہترین ہے۔ مگر فطری عنصر تصنّع اور مبالغہ کے پردے میں رہ جاتا ہے۔

غلام غوث بیخبر

ان کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا۔ بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ لیکن خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت چلے گئے تھے۔ اور وہاں سے ریاست نیپال میں آکر بود و باش اختیار کر لی تھی منشی غلام غوث ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ ان کے والد کو نیپال چھوڑ کر بنارس آنا پڑا چنانچہ ان کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت یہیں ہوئی اور ۱۸۴۲ء میں اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں کی ماتحتی میں جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے، ملازم ہو گئے اور نہایت خوبی کے ساتھ فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں پنشن لی اور خان بہادر ذوالقدر کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔

بیخبر کی دو تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک کا نام "خوننابۂ بیخبر" اور دوسری کا "فغان بیخبر" ہے۔ اس وقت کے انشا پردازوں میں بیخبر بہت مشہور تھے۔ ان کی عبارت میں رنگینی اور تصنّع ضرور ہے لیکن مقفّیٰ و مسجّع نہیں۔ نہ فارسی اور عربی کی بھرمار ہے تشبیہ اور استعارے سے بیخبر کو کافی دلچسپی ہے۔ رعایت لفظی اور مبالغہ نثر میں بھی روا رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ غلام امام شہید کی تعریف میں کہتے ہیں۔ "اب ان کی اردو سے سودائی روح کو سودا ہو گا، میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا یعنی درپردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس

کرتا ہوں۔ کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوزؔ کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتشؔ رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخؔ اب ہوتا تو مصحفیؔ سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتشؔ نہ مرتا تو کیسا جلتا!"

یہ مختصر سی فہرست ادبی کارنامہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے فورٹ ولیم کے باہر رہ کر اردو کی خدمت کی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی انشاپرداز ہیں۔ جن کو طول کلام کی وجہ سے نظر انداز کرنا پڑا۔ یہاں تک صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ غدر غدر کے قریب تک اردو زبان کس حد تک ترقی کر چکی تھی لیکن یہ تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ اگر ہم دہلی کالج سوسائٹی کا تذکرہ نہ کریں۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۳ء میں قائم ہوئی تھی اور انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے اردو کی ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو انڈیا آفس لندن میں انھوں نے دیکھی تھیں۔ اسی فہرست کے متعلق لائق مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ الحمد للہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحات میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے۔ یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اس فہرست کو دیکھکر تعجب ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی۔ دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا ساجھا ہے۔"

فہرست مذکورہ بالا میں چھ موضوعات پر کتابیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک

کار آمد اور قابلِ قدر۔ ہر ایک عنوان ملاحظہ ہو۔

(۱) علوم و فنون۔ جس میں زراعت صنعت و حرفت ہیئت و نجوم، اخلاق، علم الحرب، موسیقی، طبیعیات وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) تاریخ و جغرافیہ۔ اس میں عام تاریخ اور سوانح عمری بھی ہے۔

(۳) ادبیات۔ اس میں ڈراما، تنقید، دواوین، قصص وغیرہ ہیں۔

(۴) کتبِ تعلیمی۔ اس تحت میں قواعد مختلف زبانوں کی ریاضیات علم المساحت علم وزن و پیمائش سب ہی کچھ ہیں۔

(۵) الٰہیات۔ مختلف مذاہب کے عقائد و مسائل کے علاوہ موازنہ و مناظرہ کی کتابیں بھی ہیں۔

(۶) متفرقات۔ اس میں تقریروں اور مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ بچّوں اور عورتوں کی تعلیم کے متعلّق رائے زنی کی گئی ہے۔

اس فہرست میں کتابوں اور مصنّفوں کے نام بھی دیئے ہیں اور جملہ کتابیں چھپی ہوئی "انڈیا آفس لندن" میں موجود ہیں مگر بدقسمتی سے غالباً ہندوستان میں نہیں ہیں کہ کوئی تنقید کی جائے۔ بہرحال یہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان غدر سے پہلے ہی علمی زبان بن گئی تھی۔ اس فہرست کو چھوڑ کر جن کتابوں اور مصنّفوں کا ذکر ہم نے اس دور میں کیا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے اگر فورٹ ولیم کالج سے باہر نکلئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی عبارت عام طور پر رنگین اور کبھی کبھی مقفّیٰ اور مسجّع بھی ہے۔ زورِ کلام بیشک پہلے سے زیادہ ہے۔

منجملہ اور باتوں کے جنھوں نے اردو کی ترقی میں مدد دی، ایک چھاپہ کی ایجاد بھی تھی۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے وقت میں لوہے کے حروف کا رواج ہوا جس میں فورٹ ولیم کالج سے اکثر کتابیں شائع ہوئیں۔ مگر اوّل تو خرچ زیادہ پڑتا اور

دوسرے حروف خوبصورت نہ تھے۔ جس سے مقبول عام نہ ہو سکے۔

۱۸۳۱ء میں لیتھو کا کارخانہ کانپور میں کھولا گیا جو لوہے کے حروف سے بہتر ثابت ہوا۔ دلّی میں بھی ایک ایسا ہی چھاپہ خانہ ۱۸۳۷ء میں کھولا گیا۔ نصیر الدین حیدر نے کانپور سے مسٹر ارچر (جنھوں نے کانپور میں لیتھو کی ابتدا کی تھی) کو لکھنؤ بلایا اور یہاں بھی ایک عمدہ چھاپہ خانہ قائم کردیا۔ جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں بہت بڑی سہولت ہو گئی۔ چھاپہ کی بدولت اردو میں اخبارات بھی نکلنے لگے۔ جس سے لوگوں کو نہ صرف حالات ہی معلوم ہونے لگے بلکہ مغربی خیالات کا بھی اندازہ ہوا جس سے متاثر ہو کر اردو کا اندازِ بیان بھی بدلا جانا ضروری سمجھا گیا۔ اب اردو کی یہ قدر و منزلت ہوئی کہ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے سرکاری زبان قرار دی گئی۔ کیونکہ فارسی سے بے نیاز ہو کر اس وقت تک اردو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی تھی

باب سوم

(نثر کی ترقی)

سرسیّد

آپ کی ولادت دہلی میں ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ ان کے آبا و اجداد شاہجہاں کے وقت میں دامغان ہمہ وان اور ہرات میں کام کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور اسی وقت سے شاہی دربار میں رسائی ہوئی۔ جس کا سلسلہ عالمگیر ثانی کے وقت تک قائم رہا جنھوں نے سرسیّد کے دادا کو جوّاد الدّولہ کا خطاب بھی دیا۔ اکبر شاہ ثانی نے سرسیّد کے والد میر متّقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا مگر انھوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔

سرسیّد کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کے زیرِ سرپرستی ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں سرسیّد نے ملازمت کر لی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجہ تک پہنچ گئے۔

علم کا ذوق ایسا تھا جس کو کبھی وہ بھول سکتے۔ کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ

کرتے رہے۔ چنانچہ ملازمت ہی کی حالت میں اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید"
تصنیف کی اور بھی کتابیں نوکری کے زمانہ میں لکھیں۔ ۱۸۶۲ء میں جب غازی پور بدل کر
آئے تو وہاں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مغرب
کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں۔ اس سوسائٹی میں متعدد رسالے مختلف
موضوع پر نکالے گئے جس میں زراعت اور اقتصادیات بھی شامل ہیں۔

۱۸۵۹ء میں انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں دوسرا اسکول
غازی پور میں کھولا اور ایک انجمن انھوں نے قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن
تھا۔

ان کو مسلمانوں کی اصلاح کا خیال شروع سے تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ولایت
جاکر وہاں کے لوگوں کے اخلاق اور طرزِ معاشرت کا معائنہ اس لئے کیا کہ ہندوستان
چل کر یہاں کی عمدہ باتوں کو مسلمانوں میں رائج کیا جائے۔ سال بھر کے بعد ہندوستان
واپس آئے اور یہاں آکر اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری
کیا جس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے
خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو جائے۔

سر سیّد کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔ پنشن لینے کے بعد انھوں
نے اس کالج کی ترقی کے لئے ہمہ تن کوشش ہو کر کام کیا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں
کالج کا بنیادی پتھر لارڈ لیٹن کے ہاتھوں سے رکھا گیا۔ اس وقت سے سر سیّد نے
مرتے دم تک جس جانکاہی اور دور اندیشی سے اس کالج کی ترقیوں کی فکر کی ہے
وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ۱۸۹۸ء میں سر سیّد نے طویل عمر پاکر انتقال کیا اور اپنے
محبوب کالج کی مسجد میں دفن کئے گئے۔

قوم اور ملک کے ساتھ جو کچھ سر سیّد نے احسان کیا وہ ہمارے موجودہ بحث

سے دور رہے۔ فی الحال ہم کو اردو ادب سے سروکار ہے اور صرف یہ دیکھنا ہے، کہ سرسید نے اردو کی کیا خدمت کی۔ مسلمانوں کی ترقّی کے لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ جب تک ان کی مادری زبان کی ترقّی نہ ہوگی۔ قومی ترقّی بھی مشکل سے ہوگی۔ لہٰذا انھوں نے اس کی بھی اصلاح کی فکر کی۔ سرسیّد سے پہلے جیسا آپ نے دیکھا ہوگا۔ رنگین مقفّیٰ اور مسجّع عبارت پسندِ عام تھی۔ جس میں خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ بیشک مرزا غالب نے خطوط میں سلاست اور سادگی اختیار کی۔ لیکن کوئی علمی کارنامہ مشکل سے اس اندازِ بیان کے ساتھ لکھا گیا ہوگا۔ ہمارے نزدیک غالباً سرسیّد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر میں مضامین کو سادگی و متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔

سرسیّد کی عبارت عام طور سے تشبیہات و استعارات و صنائع و بدائع سے پاک ہے۔ جس بات کو لکھتے ہیں اس کو دلیل سے مضبوط کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور مشکل سے مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سچائی اور بیباکی خاص جوہر ہیں۔ الفاظ نہایت سیدھے سادے اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں بذلہ سنجی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ منظر اور موقع کی تصویر الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ عبارت کبھی کبھی بے لطف و ناہموار ہو جاتی ہے وہ اپنے جوشِ اصلاح اور اظہارِ خیال میں اتنے آزاد تھے کہ قواعد کی پابندی اپنے لئے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے جو لفظ ان کا مفہوم پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا اس کو فوراً استعمال کر جاتے تھے۔

عبارت کبھی کبھی گلابی اردو کا مزہ دے جاتی ہے۔ محاورے بھی کبھی ثقیل آجاتے ہیں لیکن جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلا قدم اصلاح کے لئے اٹھتا ہے تو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تب معمولی خامیاں بھی بے وقعت نظر آتی ہیں۔

یوں تو سرسیّد کی تصانیف کئی ایک ہیں مثلاً "خطباتِ احمدیہ" "آثار الصنادید"

"تاریخ سرکشی بجنور" وغیرہ لیکن سب سے زیادہ اثر اردو پر تہذیب الاخلاق کا پڑا جب مذہبی چھیڑ چھاڑ اس رسالہ میں شروع ہوئی تو جواب دینے والوں نے خوش قسمتی سے وہی طرزِ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی جو خود سر سیّد کا تھا اور چونکہ یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا لہٰذا ایک اچھا ذخیرہ سلیس اور عام فہم اردو زبان کا تیّار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت سے ہر انشا پرداز نے یہی روش اختیار کر لی۔

محسن الملک

ان کا نام سیّد مہدی علی تھا۔ اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۳۷ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی معمولی تعلیم حاصل کر کے دس روپیہ ماہوار پر کلکٹری میں ملازم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے اہل مدی اور سر رشتہ داری کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا۔ چنانچہ ملازمت کی حالت میں قانون کی دو کتابیں لکھیں جو عام طور پر پسند کی گئیں۔ ۱۸۶۳ء میں مہدی علی ڈپٹی کلکٹری کے درجہ تک پہنچ گئے۔

۱۸۷۴ء میں ریاست حیدر آباد نے ان کو اپنے یہاں کا انسپکٹر جنرل (مالیات) بارہ سو روپیہ ماہوار پر مقرّر کر دیا۔ اپنی کارگزاری کی بدولت ریاست میں بھی انھوں نے بڑی ترقی کی۔ رفتہ رفتہ اعلیٰ معتمد مال تین ہزار روپے ماہوار پر ہو گئے۔ حسنِ خدمات پر

ریاست کی طرف سے محسن الدولہ محسن الملک مہر نواز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور بقیہ عمر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں صرف کی۔ چنانچہ سر سید کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکریٹری بھی ہو گئے۔

۱۹۰۷ء میں شملہ میں انتقال ہوا مگر علی گڑھ میں سر سید کے برابر دفن کئے گئے

سر سید کی خصوصیات محسن الملک میں بھی نظر آتی ہیں خواہ اس کو آپ سر سید کی دوستی کا صلہ سمجھئے یا ان کے ذاتی جوہر پہ محمول کیجئے۔ بہر حال انھوں نے بھی سر سید کی طرح مذہب پر آزادانہ گفتگو کی ہے اور بہت سے مضامین اس سلسلہ میں لکھے ہیں مضمون خواہ اخلاق پہ ہو یا مذہب پر، نہایت دلیل اور تلاش کے ساتھ لکھتے ہیں۔ عبارت عام طور سے سلیس اور صاف ہوتی ہے۔ کہیں کہیں پرانی طرز کی تقلید میں رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی صنائع بدائع سے بھی کام لے لیتے ہیں میانگی اور تاثیر محسن الملک کی دو خصوصیات ہیں جو ان کی تحریر میں تمام نمایاں ہیں۔

محسن الملک اپنی قوتِ گویائی کی وجہ سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ ان کی تقریروں میں کہیں کہیں طنزیہ ٹکڑے نہایت پُر لطف و کارآمد نظر آتے ہیں۔ جوشِ بیان، زورِ تحریر، توازنِ عبارت و خیال جتنا محسن الملک کے یہاں ہے۔ ان کے کسی ہمعصر کے یہاں نہیں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی اپنی تصنیف "چند تنقیدی مضامین" میں رقمطراز ہیں کہ ان کا اسلوب بیان اس صداقت کا اظہار ہے جو خود ان کا ایمان تھا۔"

چراغ علی

چراغ علی کے بزرگوار کشمیر کے رہنے والے تھے لیکن ان کے دادا بسلسلۂ ملازمت پنجاب چلے آئے۔ بعد میں میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ مولوی چراغ علی کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا گویا دس سال کے سن میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن بہت معمولی طور سے گو انگریزی، فارسی، اردو سب کچھ پڑھا لیکن ایک محدود درجہ تک گھر کی ذمّہ داریوں نے فرصت نہ دی کہ یکسو ہو کر تحصیلِ علم کرتے۔ فکرِ معاش نے مجبور کر دیا۔ چنانچہ گھر چھوڑ کر ضلع بستی کے محکمۂ خزانہ میں بیس روپیہ ماہوار پر نوکری کرلی۔ مگر علمی ذوق جوان کی فطرت میں تھا وہ چین نہ لینے دیتا تھا۔ مطالعۂ کتب فرصت کے وقت جاری رہتا اور علمی قابلیت یہاں تک بڑھائی کہ کئی زبانوں کے ماہر ہو گئے نہ صرف عربی اور فارسی کے عالم تھے بلکہ انگریزی لاطینی اور یونانی سے بھی واقف تھے۔ انگریزی زبان میں کتابیں بھی لکھیں جن کی تعریف انگلستان کے اخبارات میں بھی کی گئی۔

چراغ علی نے نہ صرف علمی ترقّی کی بلکہ ملازمت میں بھی ممتاز عہدہ پر پہنچ گئے۔ رفتہ رفتہ ترقّی کر کے ڈپٹی منصرمی اور تحصیلداری تک پہنچے۔ ان کو مذہبی مباحث میں کافی دلچسپی تھی۔ تقریر بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے سرسید سے تعارف حاصل ہو گیا۔ جن کی کوششوں سے چراغ علی کو حیدرآباد میں جگہ مل گئی اور وہاں بہ عہدۂ مددگار معتمدِ مالگزاری چار سو روپے ماہوار پر مقرر ہو گئے۔ اپنے فرائض کو

اس قابلیت اور خوش اسلوبی سے انھوں نے انجام دیا کہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے معتمد مال کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہوئے۔

چراغ علی کی ترقی کا راز ان کی قابلیت، صداقت اور دیانت داری میں مضمر ہے۔ سرکاری کام کو وقت پر انجام دیتے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا تھا۔ اس میں پڑھنے لکھنے کا شغل برابر جاری رہتا۔ مشکل سے کوئی لمحہ بیکار جانے دیتے تھے۔ بہت سی کتابیں سرکاری امور پر مثلاً بجٹ، جاگیرات وغیرہ پر لکھیں جو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں۔ علاوہ ان کے مذہبی کتابیں بھی کئی ایک ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں بھی آپ کے مضامین برابر نکلتے رہے۔

چراغ علی کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین کو دلائل سے مضبوط کرنے کے عادی ہیں۔ اچھے برے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نظر زیادہ تر نفسِ مضمون پر رہتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہیں اُلجھتے۔ واقعات کی چھان بین میں انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تصانیف میں ادبی شان بہت کم ہوتی ہے۔ عبارت عام طور سے روکھی پھیکی ہے۔ عبارت آرائی و رنگینی مفقود ہے۔

چراغ علی کا انتقال ۱۵ر جون ۱۸۹۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ ان کو تمام باتوں سے زیادہ مذہب سے دلچسپی تھی۔ اس لئے ان کی تصانیف کا موضوع زیادہ تر مذہب ہی ہے

آزاد

آزاد کے حالات نظم کے حصّہ میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ہم کو صرف ان کی نثری خدمات کا تذکرہ کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا مرتبہ خدمات اور احسانات کی وجہ سے قریب قریب اردو کے تمام انشاپردازوں سے بلند نظر آتا ہے۔

آزاد کی ہمہ گیری اور تبحّر علمی اور اردو کی محبّت نے اردو ادب کو تنگنائے خیال اور مضامین سے نکال کر کئی ایک نئے میدان دکھائے۔ نظم کے سلسلہ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نظمِ جدید کی ایجاد کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے۔ نثر میں آبِ حیات لکھکر انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو صحیح راستہ پر لگا دیا بلکہ فن تنقید کی بنیاد اردو ادب میں ڈالدی آبِ حیات سے پہلے شعرائے اردو کے تذکرے لکھے گئے تھے وہ اس قدر نامکمل تھے کہ صحیح حالات اور کمالات کا پتہ چلنا دشوار تھا ۔ آزاد نے اس کی درستی کے لئے ایک عمر تک جانفشانی اور کاوش سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبِ حیات ایک ایسی جامع اور مانع تاریخ ادب اردو دنیا کے سامنے پیش کردی۔ آج تک جو شخص تاریخ ادب اردو کے میدان میں قدم رکھتا ہے وہ بغیر آبِ حیات کی مدد کے قلم نہیں اُٹھاتا۔

مصنّف گلِ رعنا غالباً سب سے زیادہ آزاد کے نکتہ چیں ہیں لیکن آبِ حیات اور گلِ رعنا کے مضامین کو ساتھ رکھ کر پڑھیئے تو بعض مقامات ایسے ملیں گے کہ جن میں مصنّف نے نہ صرف واقعات آبِ حیات سے لئے ہیں بلکہ پارہ کا پارہ آبِ حیات ہی کی عبارت سے بغیر کسی اعتراف کے آزادی کے ساتھ لیا ہے عجب کیا ہے کہ آزاد آبِ حیات لکھتے وقت میر انیسؔ کا شعر پڑھتے جاتے ہوں ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار　　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس کتاب سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ آزاد نے تحقیق سے کام کم لیا ہے۔ ایک حد تک صحیح ہے ...... تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" جلد دوم میں آزاد کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ آزاد نے ایک دوسرا میدان بھی اردو ادب کو دکھایا ہے۔ انگریزی اور یونانی ادب سے متاثر ہو کر ایسے اخلاقی اور نتیجہ خیز خیالی فسانوں کی بنیاد ڈالی جو غالباً اردو کے لئے قریب قریب بالکل نئی چیز تھی۔ کیونکہ آزاد کی نیرنگ خیال سے پہلے کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہیں ملتی۔ انگریزی میں اس قسم کے افسانوں کا نام "ایلی گری" (ALLEGORY) ہے جس کو اردو والے رمزیہ کہتے ہیں۔ اس عنوان پر آزاد کی نیرنگ خیال ایک مستقل کتاب ہے جو مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ یہ امر بھی قابل داد ہے کہ آزاد انگریزی علم سے بہت کم واقف تھے مگر اس کتاب کے لکھنے میں انگریزی ادبا کی پوری پیروی کی ہے۔

تیسرا نیا میدان جو آزاد نے اردو والوں کو دکھایا وہ علم السنہ یا فیلالوجی کا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے الفاظ کی پیدائش، ترقی، تغیر کا ڈھنگ بتایا ہے۔ اس کتاب کا نام سخندانِ فارس ہے۔

دربارِ اکبری بھی آزاد کا مقبول کارنامہ ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے جس میں تفصیلی حالات کے علاوہ آزاد نے اس بات کے دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ فن تاریخ میں بھی ادبیت اور دلچسپی کی روح قائم رکھی جا سکتی ہے۔ غالباً یہ کتاب لارڈ میکالے کی ضخیم کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ آزاد کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً فارسی ریڈریں، اردو کے قاعدے اور قواعدِ اردو قصصِ ہند۔ قندِ پارسی۔ نگارستان فارس، ہسپاس اور نماک، جانورستان وغیرہ۔

آزاد کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور دلکش جوہر ان کی طرزِ تحریر ہے
الفاظ کا انتخاب اور زبان کی شیرینی، محاورں کی صحت اور جابجا تشبیہ اور استعاروں
کی گلکاری سے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے کہ پڑھتے چلے جائیے اور سیری نہیں ہوتی۔
رام بابو سکسینہ[1] لکھتے ہیں کہ "ان (آزاد) کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ
بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی خوبصورتی اس
میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنعات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے
اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے
اُن کے معاصرین (شبلی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ۔ حالی وغیرہ) ان کو نہایت قدر و عزت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شبلی نے تو ان کی موت پر ان کو خدائے اُردو کہہ کر یاد کیا تھا۔
آزاد کے قلم کا یہ ادبی کرشمہ ہے کہ مواد خواہ کتنا ہی کم ہو، صفحے کے صفحے لکھتے چلے
جاتے ہیں اور تاثیر و لطف میں کمی نہیں آتی۔ ان کی عبارت کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے
کہ تحریر میں لوچ اور موقع پر زور بھی خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا ایک کمان میں
دو تیر ہر وقت رہتے ہیں اور جس تیر سے دل پر چوٹ کی جا سکتی ہے، اسی کو کام میں
لاتے ہیں۔ آزاد کا قلم سوز و گداز کی تصویر اس خوبی سے اتارتا ہے کہ نثر میں شعر کا
درد و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

---

[1] مصنف تاریخ اردو (بہ زبان انگریزی)

ذکاء اللہ

ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ثناء اللہ ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲ برس کے سن میں ذکاء اللہ دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ ان تینوں آدمیوں میں انتہا درجہ کی محبت تھی۔ ذکاء اللہ کو بچپن سے علم ریاضی سے خاص شغف تھا۔ جب پڑھ کر فارغ ہوئے تو اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے۔ بعد میں وہاں سے نکل کر آگرہ کالج میں فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ ہو گئے۔ بعد ازاں قابلیت کی بنا پر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کے پروفیسر منتخب ہو گئے۔ جہاں پندرہ سال تک عربی اور فارسی کا درس دیتے رہے اور یہیں سے پنشن لے کر خانہ نشینی اختیار کرلی۔

تصنیف اور تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا۔ ملازمت کی حالت میں بھی متعدد کتابیں لکھیں اور مرتے دم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذکاء اللہ نے جتنے مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں اتنی اردو کے کسی ایک انشاپرداز نے ان سے پہلے نہیں لکھیں۔ ان کی طبیعت کی جولانی اور ہمہ گیری کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اشہبِ قلم ہر میدان میں یکساں رواں ہے۔ ریاضیات، طبیعیات، جغرافیہ، علم الاخلاق ہیئت، سیاست مدن وغیرہ سب پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

ان کی تصنیف اور تالیف کی فہرست سیر المصنفین جلد دوم میں ۱۴۳ کتابوں

کی دی ہوئی ہے۔ جن میں ترجمہ زیادہ ہے لیکن ان کی بعض تصنیفیں نہایت قابلِ قدر ہیں مثلاً تاریخ ہندوستان جو دس جلدوں میں ہے۔

ذکاء اللہ کی عبارت سلیس اور رواں ہے مگر کسی قدر پھیکا پن بھی ہے تاریخ نویسی میں پوست کندہ حالات کے بیان میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے بے باکی کم ہے، شبلی کا ایسا طرزِ استدلال بھی نہیں ہے اور نہ آزاد کی طرح ادبی شان اور شگفتگی لیکن یہ ضرور ہے کہ بڑے بڑے حالات کو مختصر عبارت میں آسانی کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ان کی کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی حد تک مقبولِ عام ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بھی کمال کی داد دی گئی۔ علاوہ خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات کے آپ کو پندرہ سو روپیہ کا انعام بھی عطا ہوا۔

ذکاء اللہ کے کلام پر حالی نے ایک پھبتی میں نہایت جامع اور مانع تنقید کر دی ہے کہ "ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنئے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے"۔

ممکن ہے کہ اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنئے کی دکان میں عمدہ اور سلیس چیزیں کم ملتی ہیں۔

حالی

غالباً حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سوانح عمری لکھنا رائج کیا۔ چنانچہ حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید سوانح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اگر یادگارِ غالب بھی اسی سلسلہ میں لے لی جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہو سکتا کہ تفصیلی حالات کے ساتھ مرنے والوں کے کلام پر بھی ایک بڑی حد تک حالی نے ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اسلوب بیان اور واقعات کی چھان بین کی وجہ سے ان کتابوں کی بدولت حالی کو اردو کے بہترین انشاپردازوں کے برابر جگہ ملی۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید جس میں غالب اور سر سید کے حالات لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر کبھی کبھی لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ حالی نے غالب اور سر سید کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے چنانچہ شبلی کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا توجیہہ کر دی گئی ہے۔ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کہ حالی کو سر سید اور غالب سے جو عقیدت تھی وہ محبت کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اپنے ہیرو کی وہ خامیاں جو ہم کو سخت معلوم ہوتی ہیں وہ محبت کی عینک سے اتنی صاف اور ناگوار نہیں دکھائی دیتیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے سوانح عمری کا کوئی نمونہ بھی نہ تھا جو کچھ حالی نے لکھا وہ بہت غنیمت اور قابلِ قدر ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے اردو شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے مختلف زبانوں کے خیالات سے فنِ شعر پر بحث کی ہے اور جابجا

اردو کے لئے اچھی تجویزیں پیش کی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں حالی نے اردو شاعری کے معائب بیان کئے ہیں۔ محاسن نظر انداز کر دیئے جس سے تصویر کا ایک رخ دکھائی دیا ہے۔

عام طور سے حالی کی عبارت سادگی اور صفائی کی سرمایہ دار ہے۔ عبارت آرائی و رنگینی سے ایک قلم گریز ہے روانی ضرور ہے مگر آزاد اور شبلی کی طرح شگفتگی نہیں پا ہے۔ ان کی زبان نہایت پاکیزہ اور ٹکسالی ہے۔ محاورات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے نفسِ مطلب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ عبارت مسلسل اور مربوط ہوتی ہے جو کچھ دل و دماغ میں آتا ہے۔ اس کو بے تکلف کاغذ پر رقم کر دیتے ہیں۔ لیکن[۱] ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے۔ یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے۔

---

[۱] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۹۲

سید علی بلگرامی

سید علی بلگرامی قصبہ بلگرام میں ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان عرصے سے علم و فضل، جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا۔ سید علی کے والد زین الدین خاں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لے کر حیدر آباد میں ایک معزز جگہ پر ہو گئے تھے یہ بھی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے سید علی بلگرامی کی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔ پندرہ سال تک محض عربی اور فارسی کی تعلیم دلاتے رہے۔ اس کے بعد سپوت بیٹے نے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ ذہن اور حافظہ کی یہ حالت تھی کہ خود ان کے استادوں کو حیرت ہوتی۔ مشکل سے مشکل بات جلد سے جلد سمجھ لیتے اور ہمیشہ کے لئے دماغ میں محفوظ رکھتے۔ اس ذاتی جوہر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ صرف آٹھ سال انگریزی پڑھ کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی اور لطف یہ کہ امتحان میں ان کا ایک مضمون سنسکرت تھا۔

سید علی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر حیدر آباد کے مشہور وزیر مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے بلا کر اپنے خاص عملہ میں داخل کر لیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے سائنس کے علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور تکمیل تعلیم کے لئے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ وہاں بھی اپنی قابلیت کا یارہا ثبوت دیا۔ علمی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جتنی زبانوں سے واقفیت انھوں نے حاصل کی تھی اتنی شاید ہی ہندوستان میں کوئی ایک آدمی جانتا ہو۔

عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ لاطینی۔ سنسکرت۔ بنگالی۔

مرہٹی، تلنگی، گجراتی، ہندی سب ہی سے بخوبی واقف تھے لیکن باوجود اس ہمہ گیر علمی قابلیت کے افسوس ہے کہ انھوں نے تصنیف کی طرف بہت کم توجہ کی ہے آپ کی جو کچھ یادگار ہیں وہ ترجمے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ترجمے بھی کسی تصنیف سے کم نہیں۔ یوں تو کئی ایک کتابوں کے آپ نے قابلِ قدر ترجمے کئے لیکن تمدنِ ہند اور تمدن عرب نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ دونوں کتابیں اصل میں فرانسیسی زبان میں تھیں۔ ان کا مصنف موسیو لیبان ہے ان ترجموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید علی کو اردو زبان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔ سلاست اور روانی ان کے یہاں کے خاص جوہر ہیں۔ محاورات بھی باموقع صرف ہوتے ہیں۔ اصطلاحات کے ترجمہ کرنے میں کمال ہے۔ آپ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں انگریزی الفاظ نہ آنے پائیں۔

سید علی بلگرامی کا ارادہ بہت سی نایاب کتابوں کے لکھنے کا تھا لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو انتقال کر گئے۔

شبلی

شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے حاصل کی۔ بعد میں اپنے وقت کے مشہور مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے عربی کی منتہی کتابیں پڑھیں۔ تلاشِ علم کے لئے رام پور، لاہور، سہارن پور اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہے۔ بہترین استادوں سے معقول، حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

جب فراغت حاصل ہوئی تو گھر والوں کو فکر ہوئی کہ کوئی دنیاوی کام بھی کریں چنانچہ انہی لوگوں کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کرلیا اور کچھ دن وکالت بھی کی لیکن یہ پیشہ پسند نہ آیا۔ اس کو چھوڑ کر سرکاری ملازمت کرلی اور امین دیوانی ہو گئے لیکن حوصلہ مندیوں نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ رہے اور علمی مشاغل میں دن گزارنے لگے۔ شبلی کے ایک چھوٹے بھائی علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ گئے وہاں سرسید سے ملنے کا اتفاق ہوا، انھوں نے شبلی کو فارسی کا پروفیسر مقرر کردیا، شبلی کو بھی علمی ذوق کی وجہ سے یہ جگہ پسند آئی۔ علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو و نما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ نہ صرف سرسید کا کتب خانہ دیکھنے کو ملا بلکہ اہلِ علم کی صحبت بھی حسبِ دلخواہ نصیب ہوئی۔ یوں تو ان کے دل میں قومی جوش فطرتاً موجود تھا۔ لیکن آدمیوں میں سرسید اور کتابوں میں "سنین الاسلام"

مصنفہ محمد حسین آزاد نے اس جوش کو اور تیز کر دیا۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں[۱]
"یہ وقت تھا کہ سرسید کے شور و ہنگامہ سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا
محمد حسین آزاد کی کتاب "سنین الاسلام" نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ وہ اکثر
زیر مطالعہ رہتی تھی۔ مفاخر الاسلام و عرب پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے اور اب پہلی
مرتبہ ان کے دل نے علماء کی غفلت، تضیع اوقات، نادانی اور کجروی کا درد محسوس کیا"
شبلی نے اسلام کی گزشتہ شان و شوکت کو دنیا کے سامنے نئی آب و تاب
کے ساتھ پیش کر کے مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی مسلمانوں کی
نامور ہستیوں کو پیش کر کے اپنی بے حس قوم کو بیدار کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں
المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی وغیرہ مختلف اوقات میں لکھیں۔
ان میں سے بعض کتابوں کے مواد اکٹھا کرنے کے لئے ان کو شام و مصر اور قسطنطنیہ
وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے قطع تعلق
کر کے گھر چلے آئے اور اب اعظم گڑھ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا مگر سید علی بلگرامی
کی کوششوں نے آپ کو حیدرآباد جانے پر مجبور کیا۔ شبلی یہاں چار برس تک بحیثیت ناظم
محکمۂ تعلیم کام کرتے رہے۔ انھوں نے سلسلۂ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں چنانچہ
علم الکلام۔ الکلام۔ الغزالی۔ موازنہ انیس و دبیر، سوانح مولانا روم یہ سب قیام حیدرآباد
کی تصانیف ہیں۔

ندوۃ العلماء یہ مدرسہ ۱۸۹۴ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ نصاب
تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، علماء کے باہمی تنازع کا
انسداد، عام مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی تدبیریں سوچی جائیں شبلی نے اس ادارہ

---

[۱] سیر المصنفین

میں ابتدا ہی سے دلچسپی لینی شروع کی اور جب ندوہ کی حالت ابتر نظر آئی تو حیدر آباد سے استعفیٰ دے کر لکھنؤ چلے آئے اور ندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی نہایت خوبی کیساتھ سنبھالتے رہے لیکن ۱۹۱۳ء میں لوگوں کی تنگ خیالی سے مجبور ہوکر ندوہ کو بھی خیر باد کہا اور اعظم گڑھ میں آکر دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی جس سے مقصد یہ تھا کہ عمدہ مصنفوں کی ایک جماعت تیار ہو جائے۔ اس غرض کی تکمیل میں انھوں نے اپنی جائداد وغیرہ بھی وقف کر دی۔

شبلی کی شہرت اب نہ صرف ہندوستان میں چاروں طرف ہو رہی تھی بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس سے پہلے ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی عنایت فرمایا تھا۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری تصنیف تھی اور چاہتے تھے کہ اس اہم کام کو بھی اپنے ہاتھوں انجام دیں لیکن افسوس کہ یہ حسرت نہ پوری ہو سکی۔ ابھی پہلی جلد بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا۔

شبلی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے موضوع مختلف ہیں۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے علم کلام۔ تاریخ۔ تنقید۔ سیرۃ۔ ہر میدان میں اپنی تیزی دکھائی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید کے میدان میں ہوا۔

تاریخ نویسی میں آپ کا اسلوبِ بیان نہایت دل چسپ اور دل کش ہے۔ تاریخ ایسے خشک موضوع کو ادب کی چاشنی دے کر ہر شخص کے لئے پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ طرزِ استدلال پر اتنا عبور ہے کہ واقعات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی اس طرح ملاتے ہیں کہ بظاہر منطقی اصول ہر جگہ قائم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے فن تنقید کو آپ نے اردو میں بہت کچھ فروغ دیا اس کے اصول قائم کئے

شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھکر لوگوں کو عمل کا بھی راستہ بتا دیا۔ فضول اور لغو باتوں کو ترک کر کے کار آمد چیزوں کو چن لینے کا طریقہ سمجھایا۔

آپ کی طرزِ تحریر میں عموماً صفائی اور سادگی ہے۔ مضمون کی خشکی رفع کرنے کے لئے دلچسپ تشبیہہ اور استعاروں سے بھی جا بجا کام لے لیتے ہیں۔ الفاظ زیادہ تر روزمرّہ اور عام پسند ہوتے ہیں۔ لیکن زور کے موقع پر عربی اور فارسی کے بھی الفاظ استعمال کر کے اپنے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین اس میں سلیس اردو کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو مزہ تقریر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ آپ کی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے۔ ایک بڑی خوبی شبلی کی طرزِ تحریر میں ہمواری کلام ہے حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے زبان بدل جاتی ہے لیکن موضوع سے ہم آہنگ رہنے کی وجہ سے متانت و اثر کم نہیں ہونے پاتے۔

غالباً یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ شبلی پہلے شخص ہیں جو لکھنؤ یا دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر پھر بھی زمانے نے آپ کی تحریر کو مستند سمجھا۔

شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

باب چہارم

(ناول)

نذیر احمد

نذیر احمد ۱۲۵۲ھ دسمبر ۱۸۳۶ء میں بمقام موضع ریہڑ ضلع بجنور پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی بعد میں مولوی نصراللہ خاں سے عربی کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیکے لئے دہلی آئے اور کچھ دنوں تک مکتب میں پڑھتے رہے مگر یہاں کی تعلیم سے سیری نہ ہو سکی۔ خوش قسمتی سے دہلی کالج میں داخلہ ہو گیا اور قابلیت کی وجہ سے وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ اس کالج میں آٹھ برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراغت حاصل ہوئی تو ملازمت کی

نکر ہوئی۔ ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار پہ مدرس ہو گئے۔
دو برس تک اس ملازمت کو نباہتے رہے۔ پھر اس کے بعد استعفیٰ دیکر کان پور
میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے لیکن وہاں کی بھی ملازمت راس نہ آئی اور
استعفیٰ دینا پڑا۔ خوش قسمتی تھی کہ بار بار ملازمت ترک کرتے تھے اور پھر مل جاتی تھی

۱۸۵۷ء کے بعد نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد منتخب ہوئے اور یہاں
انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ چند دنوں میں اس علم کو بھی حاصل کرلیا۔ جب
دن اچھے آتے ہیں تو ترقی کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ گورنمنٹ کو اس زمانہ میں
تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا منظور تھا۔ مولوی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش اس کام
پر پہلے سے مامور تھے۔ بعد میں نذیر احمد بھی ترجمہ کے کام میں شریک کئے گئے۔ انکا
کام اتنا پسند آیا کہ لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر کانپور کا تحصیلدار
کردیا۔ جس سے ترقی کرکے نذیر احمد ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

ایک ہئیت کی کتاب حیدرآباد کے ریزیڈنٹ نے انگریزی سے اردو میں
ترجمہ کرنے کے لئے بھیجی۔ جس کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ حیدرآباد
والوں نے آٹھ سو روپے ماہوار پر اپنے یہاں بلا لیا۔ یہاں رہ کر انھوں نے
اپنی علمی قابلیت سے بہت کچھ ترقی کی۔ لیکن آخر میں سیاسی مصلحت کی وجہ سے
پنشن لے کر دہلی واپس چلے آئے۔

پنشن لینے کے بعد نذیر احمد کو یکسوئی حاصل ہو گئی اور لکھنے پڑھنے کا
کام زیادہ سرگرمی سے کرنے لگے مگر جسمانی قوت روز بروز زائل ہوتی جاتی تھی۔
اعضا ایک ایک کرکے جواب دیتے جاتے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا۔ بینائی بھی کم
ہو چلی لیکن علم کا چسکا ایک بری بلا ہے۔ مرتے دم لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا
یہاں تک کہ جب خود کام نہ کرسکتے تھے تو دوسروں سے لیتے تھے۔ آخر ۱۹۱۲ء

میں انتقال ہوا۔

یوں تو گورنمنٹ نے نذیر احمد کی علمی خدمات پر اکثر انعامات دیئے۔ لیکن ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

نذیر احمد کی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں :۔

ناول : مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ابن الوقت محصنات ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ منتخب الحکایات۔

اخلاق و مذہب : ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ۔ الحقوق والفرائض۔ مطالب القرآن۔ امہات الامہ۔ اجتہاد۔ موعظہ حسنہ۔

قواعد: رسم الخط۔ صرف صغیر۔ مالابد منہ فی الصرف۔

تعزیرات ہند۔ قانون شہادت (ترجمہ)

نذیر احمد کا بڑا کام اصلاح معاشرت ہے۔ جس کا خیال انھوں نے اپنی ناولوں میں رکھا ہے۔ انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر مسلمانوں کے خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا خوبی سے بیان کرنا نذیر احمد کا خاص حصہ ہے۔

ان کے احسانات طبقہ نسواں پر بھی کم نہیں۔ مراۃ العروس وغیرہ میں عورتوں کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ یہ خوبی کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوئی ان کی تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن بہت ہے۔ وہ تشبیہہ اور استعارے سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض وقت مغلق الفاظ

لکھتے ہیں۔ جس کی خاص وجہ غالباً ان کی عربی دانی ہے۔ لیکن جہاں موقع ہوتا ہے وہاں عام ہندی کے الفاظ بھی لانے میں دریغ نہیں کرتے۔ گو متانت اور سنجیدگی کا لحاظ عبارت میں رکھتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کیلئے بعض وقت رکیک اور مبتذل الفاظ بھی لے لیتے ہیں۔ محاورات کا بھی یہی حال ہے۔ عموماً ہر وقت محاوروں کا خیال رکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں بے محل محاورات بھی صرف ہو گئے ہیں (اسی طرح انگریزی الفاظ کی بھی بھرمار رہے) ان کی تحریر میں شوخی و ظرافت بہت کافی ہے۔

ناول نویسی کے موجد عام طور پر اردو کی ناول نویسی کا بانی سرشار کو خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں نذیر احمد اردو کے سب سے پہلے ناول نویس ہیں اس لئے کہ ان کی تصانیف بنات النعش (۱۸۷۲ء) مرأۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) سرشار کے پہلے ناول سے بہت قبل شائع ہو چکی تھیں [۱]۔

نذیر احمد نے قوتِ گویائی میں خاص ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ اکثر بڑے بڑے جلسوں میں پرزور تقریریں بھی کیں۔ اسی طرح شعر گوئی سے بھی آخر میں دلچسپی ہو گئی تھی لیکن اس میدان میں ان کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہوا۔

---

[۱] اس سلسلہ میں اویس احمد صاحب ادیب کی کتاب "اردو کا پہلا ناول نگار" قابلِ ذکر ہے۔ جس پر موصوف کو ہندوستانی اکیڈیمی سے انعام بھی مل چکا ہے۔

سرشار

۱۸۴۶ئہ یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ اس زمانہ میں عربی، فارسی کی تعلیم بچپن میں ایک لازمی چیز تھی۔ سرشار نے بھی فارسی پڑھنی شروع کردی۔ تھوڑے عرصہ میں کافی دستگاہ حاصل کرلی۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو کیننگ کالج میں داخل ہوگئے مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کرسکے۔

سلسلۂ معاش کے لئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرسی کرلی۔ اس وقت ہندوستان اور خاص کر اودھ ایک نئے دور سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف اصلاح اور اختراع اور ایجاد کی دھوم تھی۔ اپنی قومی زندگی درست کرنے کے لئے کشمیریوں نے بھی ایک رسالہ نکالا جس کا نام مراسلۂ کشمیر تھا۔ سرشار کو بچپن ہی سے انشاپردازی کا شوق تھا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر انھوں نے بھی اس رسالہ میں اپنے مضامین دینا شروع کئے۔ اودھ پنچ بھی اپنی خوبیوں کے ساتھ مقبولِ عام ہو رہا تھا۔ سرشار نے اس میں بھی مضامین بھیجنا شروع کئے۔ ان کے طرزِ اسلوب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ مضمون لکھنے کے علاوہ سرشار کو ترجمہ پر بھی بڑا عبور تھا۔ چنانچہ سررشتۂ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا۔ اس میں اخلاقی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مختلف لوگوں کے مضامین ہوتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ دلکشی سرشار کے ترجمہ میں ہوتی تھی۔ بیجا نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں یہ ذکر بھی کردیا جائے

کہ علم طبعی کی ایک کتاب کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا۔ گو مضمون نہایت مشکل تھا اور اصطلاحات خاص طور پر ترجمہ کے لئے مشکل تھیں مگر سرشار نے اس کتاب کو اس خوبی سے اردو کا جامہ پہنایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ تصنیف ہے۔ سرشار نے اس کتاب کا نام شمس الضحیٰ رکھا۔ اب سرشار کی شہرت روز افزوں ترقی کے ساتھ ملک میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ منشی نول کشور نے ان کو اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے لئے منتخب کیا۔

سرشار کی ایڈیٹری کی وجہ سے اودھ اخبار کو جو عروج نصیب ہوا۔ وہ اس کے لئے معراج کمال تھا۔ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کی بنیاد اسی اخبار سے شروع کی جو اردو ناول نویسی کے فن میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں فسانۂ آزاد جستہ جستہ مضامین کی صورت میں نکلتا رہا۔ سال بھر کے بعد کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ زبان کی خوبی اور بیان کی لطافت نے پہلے ہی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

یوں تو سرشار کی تصنیفات کئی ایک ہیں لیکن جس کتاب نے انھیں بقائے دوام کے خلعت سے سرفراز کیا وہ فسانۂ آزاد ہے۔ اس کتاب میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کو دکھا کر اصلاح کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب اردو میں فن ناول نویسی کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فسانۂ آزاد اردو ناول نویسی کا سنگ بنیاد ہے، لیکن ہمارے نزدیک ناول کی ابتدا مولانا نذیر احمد کے ہاتھوں ہو چکی تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرشار نے لوگوں کا رجحان دیکھ کر عین وقت پر ناول نویسی کو اور زیادہ فروغ دیا۔ پرانا طریقہ بعید از کار باتوں اور اشخاص کو چھوڑ کر روز مرّہ کے واقعات

اور ایسے اشخاص کو لیا جو آئے دن پیش نظر رہتے ہیں۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی چند اور کتابیں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً سیرِ کوہسار۔ کامنی۔ پی کہاں۔

بیان میں شگفتگی، زبان میں پاکیزگی۔ طرزِ ادا میں سلاست۔ آمد میں جوش محاورہ میں صفائی۔ روزمرّہ میں لطافت۔ لکھنؤ کی مٹی ہوئی حالتِ تہذیب۔ طرزِ معاشرت۔ زبان۔ سلیقہ۔ علو ہمتی۔ شرافت۔ سوسائٹی کی پوری کیفیت کا نقشہ ان کی تحریر میں اس طرح پایا جاتا ہے، جیسے آئینہ کے اندر تصویر عیوب کو بھی ایسے ظریفانہ طریقہ پر بیان کرتے ہیں کہ سچی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے اور برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ منظر نگاری میں مصوّر کی آنکھ اور شاعر کے دماغ سے کام لیتے ہیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے۔ البتہ علمی نمک کی چاشنی کم ہے۔ سرشار کی طبیعت میں اس قدر تمسخر تھا کہ جب وہ ناصح بننا چاہتے ہیں تو ناکامیاب نظر آتے ہیں ان کے طولانی ناولوں میں عام طور سے پلاٹ غیر مربوط ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا قلم ایک سا نہیں چلتا۔ کبھی کسی کردار کی خصوصیّت یک رنگی کے ساتھ قائم نہیں رہتی البتہ مکالمہ میں ان کو ہر انشا پرداز پر فوقیّت ہے۔ بول چال میں وہ اپنے ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ جو جس طریقہ کا کیریکٹر ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ اس کے اظہارِ خیالات کے لئے لاتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں کبھی کبھی سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔

سرشار کی شہرت ملک میں چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ جہاں ان کا استقبال بہت گرمجوشی کے ساتھ ہوا۔ حیدرآباد جانے سے پہلے کچھ دنوں الہ آباد میں بھی قیام رہا۔ جہاں ہائی کورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد

نے اپنا کلام اصلاح کے لئے سرشار کو دکھانا شروع کیا۔ جس کے عوض میں دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ سرشار کچھ عرصہ تک حیدر آباد میں دبدبۂ آصفیہ بھی نکالتے رہے۔ افسوس ہے کہ مے نوشی نے اتنے قابلِ قدر دماغ کو قبل از وقت خراب کر دیا اور ۱۹۰۲ء میں سرشار نے حیدر آباد ہی میں انتقال کیا۔

ولادت لکھنؤ میں سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ والدین کو خیال ہوا کہ ابتدائی تعلیم یہیں ہو جائے تو اچھا ہے لیکن مکتب میں تین سال گزر گئے۔ ایک سپارہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین نے ان کو کلکتہ مٹیا برج بلا لیا۔ یہاں حکیم صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے۔ اہلِ علم کا بھی اچھا مجمع تھا چنانچہ شررؔ کی علمی نشو و نما یہیں ہوئی۔ عربی فارسی کی کافی قابلیت حاصل کر لی۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں شررؔ کو پھر لکھنؤ واپس آنا پڑا۔

لکھنؤ آکر شررؔ نے اپنا علمی مشغلہ برابر جاری رکھا۔ مختلف اہلِ کمال سے علم حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں حصولِ تعلیم کے لئے دہلی گئے۔ راستہ میں سرسید سے بھی ملاقات ہوئی۔ دہلی پہنچکر شررؔ نے نہ صرف تعلیم ہی حاصل کی بلکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ محمد عبدالوہاب نجدی کا رسالہ توحید ترجمہ کر ڈالا جس کے متعلق صاحب سیر المصنفین لکھتے ہیں کہ اس طریقہ سے شررؔ نے تصنیف اور تالیف کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔

دہلی سے پھر لکھنؤ واپس آئے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں اودھ اخبار کی ملازمت کر لی۔ جس میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ شہرت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں شررؔ نے اپنا خود ایک رسالہ جاری کیا۔ جس کا نام دلگداز رکھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس رسالہ میں ناول کا بھی جزو شامل ہونے لگا۔ چنانچہ ملک العزیز ورجنا،

حسنِ انجلینا۔ منصور موہنا شائع ہوتے رہے۔ لیکن مالی کشمکش کی وجہ سے اطمینان نصیب نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حیدر آباد جانا پڑا۔ جہاں رہ کر انھوں نے تاریخ سندھ لکھنا شروع کی۔ نواب وقارالامرائے کافی قدردانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں انگلستان بھیج دیا۔ جہاں تین سال تک قیام رہا اور وہیں فرانسیسی زبان حاصل کی۔ واپس آکر حیدر آباد گئے اور دلگداز کو اس بار وہیں سے جاری کیا۔ یہاں اور کتابوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھنا شروع کی۔ چونکہ ان کے حالات عام خیالات کے خلاف تھے۔ اس لئے مسلمانوں میں برہمی پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شرر کو حیدر آباد سے لکھنؤ چلا آنا پڑا۔ مگر حیدر آباد کا آنا جانا کچھ دنوں کے بعد پھر شروع ہوگیا لیکن فضا موافق نہ تھی۔ آخر ۱۹۰۹ء میں نظام کے حکم سے عزیز مرزا، ظفر علیخاں، صفی الدین اور شرر چاروں آدمی سلطنت نظام سے ہمیشہ کے لئے باہر کر دیئے گئے۔ شرر کا انتقال ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

شرر اور ناول نویسی

شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجّہ کی اور ناول نگاری کے فن کو اردو میں ترقّی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ کیریکٹر و پلاٹ کو اوروں سے زیادہ اچھا نبھایا۔ انھوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی قائم کرکے ابتذال اور ہرزہ گوئی سے ناول نگاری کو بچا لیا۔

اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بھولی جاتی تھی۔ شرر نے از سرِ نو اپنے ناولوں کی وجہ سے پھر دنیا کے سامنے زندہ کرکے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے آگئے۔ دلوں میں ایک جوش پیدا ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے جوشِ عقیدت کے ساتھ خاص خاص

اسلامی مقام اور اشخاص کو نہایت بلند کرکے دکھایا۔ جس کی وجہ سے ان کا نام اردو کے اور ناول نگاروں سے زیادہ بلند نظر آتا ہے۔

ان کا طرز بیان شگفتہ اور رواں ہے مگر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بے نمک بھی ہے۔ تخیل میں بھی گہرائی کم ہے۔ اگر ان کے افراد قصّہ پر نظر ڈالیے تو حکیم محمد علی خاں کی طرح ان کا ہر ناول ایک مختلف المزاج اور اجنبی کردار پیش نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ایک کردار میں یکسانیّت ہوتی ہے۔ ملک العزیز اور منصور میں بہت کم فرق ہے۔ اسی طرح ورجنا اور موہنا میں بھی نام ہی کا فرق نظر آتا ہے۔ منظر نگاری میں انکا قلم کبھی کبھی مصوّرانہ رنگ آمیزی ضرور کرتا ہے لیکن شاعرانہ تشبیہات اور استعارے کی بھرمار سے تاثیر میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

باوجود ان باتوں کے دلچسپی اور دلکشی کی بنا پر جو پایہ اردو ناول نویسی میں شرر کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ ان کے بعض مشہور ناول مثلاً فردوس بریں۔ ملک العزیز ورجنا۔ فلورا فلورنڈا حسن کا ڈاکو اتنے دلچسپ ہیں کہ شروع سے آخر تک بلا ختم کئے ہوئے کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

ناولوں کے علاوہ شرر نے کثرت سے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں کی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے شرر کی معلومات کی قدر ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے ادیب اس زمانہ میں کیوں نہیں پیدا ہوتے۔

سجّاد حسین

ایک[1] خوش حال اور عالی خاندان سے تھے۔ سجّاد حسین کے والد منشی منصور علی عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر مامور تھے اور بعد پنشن کے ایک عرصہ تک حیدرآباد میں سول جج رہے۔ سجّاد حسین ۱۸۵۶ء میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف ۔اے کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے ہٹ گئی اور ایف۔اے کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں فیض آباد پہنچے اور وہاں فوج میں اردو پڑھانے پر منشی مقرر ہو گئے۔ لیکن طبیعت کو اس شغل سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی۔ سال بھر کے اندر ہی اس کو خیرباد کہہ کر اودھ پنچ کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی بنیاد پڑی۔ منشی صاحب نے اودھ پنچ کے لئے پہلے ہی سال میں ایسے ایسے سحرالبیان و جادو قلم نامہ نگار ڈھونڈ نکالے جو اردو علم و ادب کے آسمان پر چاند سورج ہو کر چمکے۔ ان میں سے پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ نواب سیّد محمد خاں آزاد۔ سیّد اکبر حسین اکبر۔ منشی احمد علی شوق۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اول، دو سال تک اپنے قلم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے۔

---

[1] ماخوذ از گلدستۂ پنچ

سجّاد حسین ۱۸۸۷ء میں کانگرس میں شریک ہوئے اور مرتے دم تک اس کے حامی رہے۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بیمار رہ کر اچھے ہو گئے ۱۹۱۴ء میں فالج کا دوسرا دورہ ہوا اور ۲۲ رجنوری ۱۹۱۵ء کو انتقال ہو گیا۔

منشی سجاد حسین اردو اخبار نویسی میں متین طرز ظرافت کے موجد.......
...... اور اپنے رنگ کے استاد تھے اودھ پنچ کے ذریعے سے جو خدمات اردو لٹریچر کی آپ نے کیں اور جو قابل قدر اضافہ اس زبان میں ان کی کوششوں کی بدولت ہوا، اس قابل نہیں کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت، مذہبی تعصب سے خواہ پالیٹکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ پاک وصاف رکھا اور آزادی وایمان داری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ان کی تحریر میں سب سے پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ بیباکی اور آزادیٔ خیال ہے جو کچھ کہنا ہوتا ہے نہایت کھلے لفظوں میں بے رو رعایت بیان کر جاتے ہیں۔ اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی عامیانہ لفظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ روزمرّہ اور بول چال کا لطف قائم رہ جائے۔ عبارت میں کبھی کبھی مولویانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے باوجود ان کی شگفتہ مزاجی کے بھی کسی قدر خشکی پیدا ہوتی ہے۔ مگر طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی کی لہر کلام میں عموماً نمایاں رہتی ہے۔ جو مشکل سے اس عیب کو ابھرنے دیتی ہے۔

منشی سجاد حسین کا ایک خاص جوہر تشبیہہ واستعارے کے صرف میں نظر آتا ہے۔ اپنی جدّت پسند طبیعت سے وہ موقع دیکھکر نہایت ظرافت آمیز طریقہ پر تشبیہہ واستعارے کام میں لاتے ہیں۔ جس سے دل کشی میں خاطر خواہ اضافہ

ہو جاتا ہے اور ان کی ندرت پسندی کے اندازہ کرنے کا ہم کو کافی موقع ملتا ہے اور غالباً ایسے مقامات پر ان کا اشہبِ طبع مذاقِ لطیف کی بہترین کارگزاری دکھا سکتا ہے۔

جس طرح ذوقؔ شاعری میں ضرب المثل کے استعمال کرنے میں ضرب المثل ہیں۔ اسی طرح منشی سجاد حسین نثر کے میدان میں ضرب الامثال سے اپنی عبارت کو سجانے میں مشہور ہیں۔ وہ تمثیلات کے برمحل صرف سے معنویت میں بہت کچھ اضافہ کر لیتے ہیں۔

منشی سجاد حسین نے نہایت قابلیت کے ساتھ اردو ناول نویسی کے نقائص دور کرنے کی کوشش کی مثلاً ان سے پہلے اردو کی ناولیں ظرافت کی چاشنی سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے اس کمی کو نہایت خوبی سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ کردار نگاری میں ارتقا بھی اردو ناولوں میں بہت کم نظر آتا تھا۔ انھوں نے اس عیب کو بھی دور کرنے کے لئے ایک حد تک کامیاب کوشش کی۔ علاوہ اور ناولوں کے ان کا ناول "حاجی بغلول" ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر ناز کر سکتے تھے۔ "حاجی بغلول" ایسا کردار ہے جو سرشار کے فسانۂ آزاد کی طرح نہایت ہردلعزیز اور ہمیشہ زندہ رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا

مرزا محمد ہادی نام اور رسوا تخلص تھا۔ آغا محمد تقی کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف مازندران سے دلی آئے اور وہاں سے اودھ میں سکونت اختیار کی۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں ہوئی۔ بچپن میں لاڈ پیار سے پرورش پائی لیکن ۱۶ برس کی عمر میں والدین کا سایہ ایک ہی سال میں سر سے اٹھ گیا۔ رشتہ کے ایک ماموں نے ان کی پرورش کی جن کی لالچ پسند طبیعت نے یتیم بھانجے کے ترکہ پر بھی مخالفانہ قبضہ جائز سمجھا۔

مرزا کو اپنے والدین سے ترکہ میں علم ریاضی اور نجوم کا شوق ملا تھا۔ جس کی تکمیل انھوں نے آگے چل کر کی۔ فارسی کی تمام درسیات، ریاضی اور اقلیدس حساب، نجوم کے رسائل اپنے والد سے پڑھے پھر مولویوں سے عربی پڑھی۔ بعد میں انگریزی پڑھنا شروع کیا اور انٹرنس کا پرائیویٹ امتحان پاس کیا۔ پھر رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور کوئٹہ اور بلوچستان کے ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ اس علم دوست طبیعت کو ریل کی پٹریوں سے کیا مناسبت۔ ایک دن اتفاق سے کمسٹری کا ایک عربی رسالہ مل گیا۔ اس کو پڑھتے ہی اس مضمون سے کچھ ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ فوراً نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ کوٹھی کا تمام سامان نیلام کر کے اس سے کمسٹری کے آلات ولایت سے منگوا کر سیدھے لکھنؤ چلے آئے دنیا میں علم کے ایسے دلدادہ مشکل سے ملیں گے۔

علم کے اسی ذوق نے ان کی طبیعت کو ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ نہ کسی کی منت گزاری نہ روپیہ کی ہوس۔ تنخواہ مشن اسکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کر چکے تھے لیکن کیمیا سازی کے مصارف کے لئے یہ تنخواہ کیونکر کافی ہو سکتی تھی۔ آخر ایک بیوپاری کے لڑکے کو اس شرط پر پڑھانے کے لئے ٹیوشن کی کہ کام بند ہونے کے بعد بھٹی مرزا صاحب کے تصرف میں رہے۔

مرزا نے اعلیٰ تعلیم کے درجے بھی گھر بیٹھے طے کر لئے۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا پرائیویٹ امتحان دیا پھر امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

ان کو علم کا جس قدر شوق تھا طبیعت میں اسی قدر قبول علم کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ عربی۔ عبرانی۔ یونانی۔ انگریزی۔ فارسی۔ ہندی۔ سنسکرت زبانوں پر اچھا خاصا عبور تھا۔ مشرقی و مغربی علوم پر حاوی تھے۔ منطق و فلسفہ، ریاضی اور ہندسہ کے ماہر تھے۔

مرزا ایک ایسی غیور طبیعت کے مالک تھے جو رزق دروزی کے لئے بھی کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانا گوارا نہ کرتے۔ نہ کسی سے مدد کے طالب ہوتے تھے۔ نہ عمر بھر کسی کے شرمندۂ احسان ہوئے۔ اسی لئے طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔ انھیں اپنے کام سے کام تھا۔ نہ دنیا اور نہ سامانِ دنیا سے تعلق۔ نہ زینت اور آرائش سے مطلب۔ ان کے بیٹھنے کے کمرہ میں ایک چٹائی بچھی رہتی۔ کونے میں کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا۔ وہ بھی بے ترتیب۔ کاغذات بکھرے رہتے۔ لحاف کہیں پڑا رہتا ہے اور توشک کہیں۔ ایک انگیٹھی رکھی رہتی اور حقہ۔ یہیں اہلِ دنیا سے بے نیاز مرزا مشاغلِ علمی میں مصروف رہتے

رسوا کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

اگرچہ رسوا شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن ان کے کلام کا شیرازہ ایسا پریشان ہوا کہ آج ان کی قدر زیادہ تر بحیثیت ایک نثرنگار کے ہے۔ حالانکہ مرزا کی شاعری میں بھی وہی سلاست، ندرت اور زبان کا لطف موجود ہے۔ جس کی جھلک ان کی نثرنگاری میں پائی جاتی ہے۔ یہاں وہ بحیثیت ایک نثرنگار کے پیش کئے جاتے ہیں۔

رسوا کی کامیابی کا راز زیادہ تر ان کی شیریں بیانی میں مضمر ہے۔ عبارت کا عام انداز رقم کچھ ایسا ہے کہ تحریر میں بات چیت کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر لکھنؤ کی ستھری زبان اور وہاں کے مخصوص روزمرہ پر جو قدرت مرزا رسوا کو حاصل تھی وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ان کے سادہ طرز تحریر میں وہی دلکشی ہے جو آزاد کے پر لطف انداز بیان میں۔ لیکن مرزا کے کلام کی خاص خصوصیت اسلوب بیان کی نرمی ہے جو ہر موقع کی مناسبت سے کہیں لطیف و شیریں تو کہیں طنزیہ و مزاحیہ ہو کر اپنا کام کر جاتی ہے۔ ان کے طرز تحریر میں کچھ ایسی روانی، شگفتگی اور لوچ ہے کہ ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان کی یہی گھلاوٹ دلوں میں نغمہ بن کر اتر جاتی ہے۔

رسوا کے مطبوعہ کلام میں زیادہ تر ناولیں ہی ملتی ہیں۔ انہی میں زور طبع اور زور قلم صرف کیا ہے جو اخلاقی، معاشرتی اور فنی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ مرزا نے نہ صرف ناول نویسی کو ترقی دی بلکہ اصول فن سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

اس وقت تک اردو کے ناول نگاروں میں شرر، حکیم محمد علی اور سرشار ہی خاص طور سے مشہور تھے۔ رسوا نے ناول نویسی کو اس قدر ابھارا کہ اپنے ناولوں کو اپنے زمانہ کا مرقع بنا دیا۔ رسوا کا منشا گویا افسانہ نویسی سے نظام معاشرت کی

فراہمی تھا۔ جہاں اصلیت کو مدِ نظر رکھنا فرض تھا۔ وہ اصل حقیقت سے دُور ہو جانا ایک غلطی خیال کرتے تھے اور فطرت کی پابندی اس لئے ضروری سمجھتے کہ ان سے بہترین مثالیں ہم کو نہیں مل سکتیں۔ مرزا نے اپنے ناولوں کے متعلق "ذاتِ شریف" کے خاتمہ پر خود لکھا ہے :۔

"ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی۔ نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانہ کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔"

مرزا کے ناولوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) ان کے اکثر ناولوں کا موقعِ واردات خود ان کا وطن لکھنؤ ہے، کیونکہ وہ تخیل کی وسعت سے کام لے کر خیالی شہروں کے نقشے پیش کرنا اصلیت اور حقیقت کے منافی خیال کرتے تھے۔ نیز اگلے پچھلے واقعات میں ..... بحث کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دینا جو نہ اس زمانہ کے مطابق ہو۔ نہ اس زمانہ کے موافق، مرزا کے نزدیک اصولِ فن کے خلاف تھا۔

(۲) ان کے کردار افسانہ دراصل لکھنؤ یا قرب و جوار کے لوگ ہیں۔ یہاں بھی وہی اُصول پیشِ نظر ہے کہ حقیقت سے بُعد نہ ہونے پائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنا ذاتی کردار، اپنی برائیاں اور اچھائیاں بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتے

(۳) مرزا اپنے پلاٹ اکثر روزمرہ کی زندگی سے لیتے۔ جہاں بے بنیاد باتوں کو دخل نہیں اور پھر واقعات کو اس طرح بیان کرتے کہ اصل مقصد بھی حاصل ہو جائے اور ناول کی دلچسپی بھی قائم رہے۔

(۴) مرزا رسوا کو فطرتِ انسانی کے گہرے مطالعہ نے ایک ماہرِ فن بنا دیا تھا

ایک طرف اصولِ نفسیات سے دلچسپی۔ دوسری جانب روزمرّہ کے واقعات کو کسی صحیح روشنی میں دیکھنا ایسی خوبیاں تھیں کہ مرزا نے ناول کو زندگی کے اتفاقات، عروج و زوال، برائی اور بھلائی کا آئینہ بنا دیا ہے۔

(۵) مرزا رسوا نے اپنے ہر ناول میں مختلف واقعات کی فراہمی کی ہے۔ بادشاہوں کی زندگی سے لیکر ادنیٰ طوائف کی زندگی کے صحیح نقشے پیش کئے ہیں ایک طرف ان کے یہاں علمی مشاعروں کے مرقعے ہیں تو دوسری طرف میلے ٹھیلے کے حالات، نواب زادوں کی حماقتیں اور اہلِ دربار کی چالاکیاں۔

(۶) مرزا رسوا نے اکثر نیچرل مناظر کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ وہ ہر جگہ کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان جذبات سے جو خود اس ناول میں مرزا نے محسوس کئے تھے، پڑھنے والے بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

ان ناولوں کے علاوہ مرزا کی نثر کے وہ دیباچے خاص طور سے قابلِ قدر ہیں جو انھوں نے کسی علمی کارنامہ کی وضاحت کے لئے لکھ دیئے ہیں۔ ان تحریروں سے وسیع النظری اور اصلاحِ فن کی کوششیں ظاہر ہوتی ہیں۔

ان کی ناولوں کو دیکھکر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جن چیزوں نے مرزا رسوا کی عظمت میں اضافہ کیا اور ان کی تصانیف میں لطف پیدا کیا ہے، وہ دراصل دو چیزیں تھیں۔

(۱) حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ۔

(۲) اور مرزا کا مخصوص طرزِ تحریر۔

راشدالخیری

ظفرعلی خاں، راشدالخیری کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہم میں سے کسی شخص کے اٹھ جانے سے جوجگہ خالی ہو جاتی ہے وہ اکثر خالی ہی رہتی ہے۔ لیکن یہ کلیہ کم ازکم مصنف 'مرأۃ العروس' کی جانشینی کے متعلق مولانا راشدالخیری کے گلریز قلم نے متعدد لطیف و پاکیزہ تصانیف کے سلسلہ سے باطل کردیا۔"

ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح راشدالخیری بھی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے حامی ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور ناول دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صنف نازک کی تمام کمزوریوں اور خوبیوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے لیا۔ اور اسی کو اپنی تحریر کا موضوع بنالیا۔ وہ نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ رسم ورواج پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی تمام برائیوں کو ایک مؤثر پیرائے میں طشت ازبام کرکے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے روکنے کے لئے وہ اپنے بہت سے کرداروں کو خرابیوں میں مبتلا دکھاکر تباہ وہلاک کردیتے ہیں۔ اس طرح ایک عبرت آنگیز نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جس کو دیکھکر طبیعت عرصہ تک مطمئن نہیں رہتی۔

وہ ایک بڑی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے اور نئی روشنی کی تعلیم و تربیت کو ایک فریب سمجھ کر نہایت بے دردی سے اس کا انکشاف کرتے

تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے لیکن تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے۔
ان کے افسانوں کے کردار کی زندگی ہماری روزانہ زندگی سے ملتی جلتی ہوتی ہے
اسی لئے ان کا عروج وزوال ہمارے لئے کافی اثر رکھتا ہے۔

ایک افسانہ نگار سے زیادہ ان کی وقعت ہماری نظروں میں ایک مصلح کی
حیثیت سے ہے۔ عورت کی زندگی کی ہر منزل ایک خاردار راستہ سے ہو کر ملتی ہے۔
انھوں نے مختلف عنوانات سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح
اس کی زندگی کامیاب بن سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے بچوں کی فطرت کا
مطالعہ بھی کیا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان کی ذہنی نشو و نما کا اندازہ
کر کے قصّہ کو غیر فطری ہونے سے بچا لیا ہے۔ انھوں نے جو تاریخی افسانے اور
قصّے لکھے ہیں۔ ان کا مقصد بھی اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے۔

چونکہ ان کے پیشِ نظر اصلاح کا مقصد رہتا ہے اور عورتیں خاص طور پر
اس پیغام کی مخاطب ہوتی ہیں۔ وہ نہایت آسان اور غیر مبہم طرزِ تحریر اختیار
کرتے ہیں۔

مختصر جملوں سے بیان کو نہایت دلآویز بنا دیتے ہیں اور اثر پیدا کرنے کے لئے
کبھی کبھی مقفّیٰ عبارت بھی لکھ جاتے ہیں۔ ان کے یہاں مزاحِ لطیف اور منظر نگاری
کی بہت کمی ہے۔ لیکن اس کی تلافی ان کے دلکش مکالموں سے ہو جاتی ہے۔ ان
کی تحریر میں دلّی کی زبان کا پورا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ نسوانی محاورات کے
استعمال سے رنگینی پیدا کر دینا ان کے لئے کوئی بات نہیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کی
زیادتی الجھن کا باعث ہو جاتی ہے۔

راشد الخیری فطری طور پر حزن و ملال کے دلدادہ تھے۔ ان کا ہر افسانہ
بیکسی کا مرقع اور یاس کی تصویر ہے۔ موت اور ہلاکت کے مناظر، بیماری اور

تکالیف کے نقشے یوں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا(باوجود اس احساس کے کہ صرف قصہ ہے) بے چین ہو جاتا ہے۔ غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکتی ہے۔ ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتی ہے اسی رجحان کی وجہ سے راشد الخیری کے نام کے ساتھ "مصورِ غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے۔

وہ اردو کے ان چند خوش قسمت مصنفوں میں تھے کہ جن کی کتابیں کثیر التعداد ہونے کے ساتھ ہی قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ بار بار چھپتی ہیں اور بک جاتی ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے کم نہیں۔ جن میں سے چند مشہور یہ ہیں:

سمرنا کا چاند۔ صبحِ زندگی۔ شامِ زندگی۔ شبِ زندگی۔ ماہِ عجم۔ محبوبۂ خداوند وغیرہ۔

طبقۂ نسواں کی اصلاح اور بہبودی آپ نے ساری عمر مدِ نظر رکھی اور اسی مقصد کے پیشِ نظر آپ نے "عصمت" اور "بنات" دو ماہانہ رسالے بھی جاری کئے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے انتقال کے بعد بھی "عصمت" برابر کامیابی سے چل رہا ہے۔ راشد الخیری کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

اردو میں ناول نویسی کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ متعدد اہلِ قلم نے ناولیں لکھیں لیکن چند مخصوص حضرات جو اس صنف میں نمایاں شہرت حاصل کر سکے ہیں وہ عصمت چغتائی۔ فیاض علی۔ رشید اختر ندوی۔ قیسی رامپوری۔ رئیس احمد جعفری۔ عادل رشید۔ محبوب طرزی وغیرہ ہیں۔ ان سب کی تصانیف سینکڑوں کی تعداد تک پہنچتی ہیں۔ لیکن فنی لحاظ سے جو اقتدار پریم چند، کرشن چندر، عزیز احمد عصمت چغتائی کو حاصل ہے وہ کسی کو کم نصیب ہوا۔ ان میں سے بعض حضرات کا

تذکرہ چونکہ دوسرے عنوانات میں آچکا ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ لکھنا بے کار ہے مثلاً پریم چند کا ذکر مختصر افسانہ کے ذیل میں آئے گا۔ ہاں پریم چند کی ناول نویسی کے سلسلہ میں اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ انھوں نے فن پر زیادہ زور دیا اور ناولوں کو اصولِ فن سے آگاہ کرنے کی فکر کی گو ان کے ابتدائی ناولوں میں پلاٹ کی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خرابی دور ہو گئی اور ان کا آخری ناول "گئودان" فن کا بہترین نمونہ ثابت ہوا۔

باب پنجم

(مقالات وصحافت)

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں رام پور کے ایک معزز اور شریف خاندان میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم اسی شہر میں ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے علی گڑھ کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخلہ لیا۔ علی گڑھ سے مولانا کو آکسفورڈ بھیجا گیا۔ وہاں سے انہوں نے بی۔ اے کی سند حاصل کی اور ہندوستان واپس ہو کر مہاراجہ بڑودہ کی دعوت پر ریاست بڑودہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز ہوئے۔ مولانا محمد علی ابھی بڑودہ کی ملازمت ہی میں تھے کہ انکے دل میں قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے دو سال کی رخصت لیکر کلکتہ سے "کامریڈ" جاری کر دیا۔ دوران ملازمت میں بھی ان کے مضامین "ٹائمز آف انڈیا" (بمبئی) جیسے وقیع اخباروں میں نکلتے رہتے تھے۔ "کامریڈ" کے اجرا کی تہ میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ

محض ملک و ملت کی خدمت تھا۔ ان کی انگریزی انشا پردازی کی اس قدر دھوم تھی کہ اس دور کے آئی۔سی۔ایس جن میں سے کچھ تو ان کے آکسفورڈ کے ہم مکتب تھے اور صوبوں کے لفٹننٹ گورنر اور گورنر اور وائسرائے بھی ان کے مضامین دلچسپی اور حیرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس اخبار نے سب سے پہلے اسلامی ممالک میں پین اسلامزم کے جذبات پھیلائے۔ اس کے لئے اخبار نے جتنا کام کیا ہے وہ ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

جب حکومت نے دارالسلطنت تبدیل کر لیا تو محمد علی بھی کامریڈ کو کلکتہ سے دہلی لے آئے۔ دہلی آنکر انہوں نے عوام تک پہنچنے کے لئے "ہمدرد" نکالا۔ یہ پہلا روزنامہ تھا جو ٹائپ کے حروف میں چھپا کرتا تھا۔ وہ اپنے زمانہ میں کافی مقبول تھا۔ ابتدائی دور میں مولانا ہمدرد کے لئے بہت کم لکھا کرتے تھے لیکن دوسرے اور تیسرے دور میں وہ باقاعدگی سے اس کے لئے لکھا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے مضامین کو دو جلدوں میں مکتبہ جامعہ نے کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا ہے۔ ان مضامین کو مسرور صاحب نے مرتب کیا ہے۔ ان کی تقریریں بہت طویل ہوتی تھیں مگر ہوتی مدلل تھیں۔ ملک کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے سنجیدہ مضامین نہ لکھے ہوں۔

"کامریڈ" میں انہوں نے ۱۹۱۴ء میں لندن ٹائمز کے ایک مضمون کا جواب دیا تھا جس کا عنوان تھا "ترکوں کی پسند" بعد میں یہ پرچہ ضبط ہو گیا اور اس سے ضمانت لے لی گئی۔ یہ مضمون کئی صفحات پر مشتمل ہے اور تقریباً ۴۰ گھنٹوں کی مسلسل نشست میں لکھا گیا تھا۔ اس معرکتہ الآرا مضمون میں گزشتہ ۷۵ سال کی تاریخ آگئی ہے۔

جہاں تک اردو صحافت کا تعلق ہے محمد علی اپنے زمانہ کے بہترین انشا

پرداز وں میں تھے۔ انہوں نے صحافت کے وقار کو بڑھایا اور جو کچھ لکھا پبلک مفاد کو سامنے رکھکر لکھا۔ انہوں نے اخبار نویسی کو کبھی جلب زر کا ذریعہ نہیں بنایا صحافت ان پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز، شوخی اور مزاح بھی پایا جاتا ہے۔ وہ چٹکیاں لیتے ہیں اور اس کے مزے وہ شخص بھی لیتا ہے جس کے چٹکیاں لیجاتی تھیں۔ مولانا محمد علی شاعر بھی تھے لیکن ان کی شاعری ساری کی ساری آمد تھی اور اس میں آورد کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ جوہر تخلص کرتے تھے

اخبار نویسی کی بدولت انہوں نے قید و بند کی بہت کچھ سختیاں جھیلیں لیکن کبھی اپنے عقیدہ سے منہ نہیں موڑا۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بڑے جری تھے۔ وہ سچے مجاہد تھے۔

میر بشارت علی جالب

یہ اردو زبان کے سب سے معمر جرنلسٹ تھے۔ ان کا تعلق متعدد اخبارات سے رہا۔ پہلے وکیل (امرتسر) اور پیسہ اخبار (لاہور) میں انہوں نے ملازمت کی اور وہاں کے اخباروں کو چمکایا۔ پھر "ہمدرد" میں آگئے۔ اس کے بعد جب "ہمدرد" بند ہوا تو وہ لکھنؤ چلے گئے اور "ہمدم" سے وابستہ ہو گئے۔ "ہمدم" سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنا روزنامہ "ہمت" نامی جاری کیا جس سے وہ مرتے وقت تک وابستہ رہے۔

ان کی طرز تحریر سلیس، مدلل اور دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ ان کے لیڈنگ آرٹیکلز انگریزی اخبارات کے ہم پلہ ہوا کرتے تھے اور اسکی وجہ یہ تھی کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ اس کا بہت اچھا استعمال کرتے تھے۔ ملک کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر وہ لکھنے

کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔

میر جالب دہلی کے رہنے والے تھے اور اس لئے ان کی زبان بہت شستہ تھی۔ انکی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے سوائے ایک کتاب کے جس کا تعلق پانی پت کی تیسری لڑائی سے تھا جسے رسالہ "زمانہ" نے ایک خاص نمبر میں شائع کیا تھا۔ انہوں نے یہ کتاب بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ پورا پورا حق ادا کر دیا ہے

وہ بہت منکسر المزاج آدمی تھے۔ اونچی اونچی جگہوں پر فائز ہونے کے باوجود وہ اپنے بچپن کے غریب دوستوں کو نہیں بھولے۔

میر جالب کا کمال یہ تھا کہ وہ ہفتہ میں چھ دن لیڈنگ آرٹیکلز کے علاوہ نوٹ وغیرہ بھی خود لکھا کرتے تھے۔ جو لوگ صحافت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے وہ کتابوں کے کیڑے تھے اور دفتر جاتے اور آتے وقت اخبارات اور رسائل کا بہت بڑا پلندہ ان کے بغل میں ہوا کرتا تھا جس مضمون پر وہ قلم اٹھاتے تھے پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیا کرتے تھے۔ وہ لکھنے میں بیحد محتاط تھے اور ہمیشہ قانون کی سختی سے پابندی کرتے تھے کہ کسی مضمون پر حکومت وقت گرفت نہ کر سکی۔ ویسے وہ بہت پرجوش آدمی تھے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے اخبار کو رائے عامہ کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی۔ ان میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے سیاسی خیالات رکھنے والے "آقا" کے ساتھ بغیر تصادم کے کام کر سکتے تھے۔

ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد کی کوئی مستقل ادبی تصنیف تو معلوم نہیں ہوتی مگر الہلال اور مخصوص اندازِ تحریر نے ان کو اردو کے بہترین انشاپردازوں کی صف میں جگہ دلادی ہے۔ الہلال نے اپنی خوبیوں کی وجہ سے اتنی دلکشی حاصل کرلی تھی کہ جب تک یہ اخبار ہاتھ میں نہ آتا تھا۔ لوگ بے چینی سے انتظار کیا کرتے۔ آزاد کی تقریر کی طرح تحریر میں بھی ایک سحر ہوتا ہے کہ جس کو اوّل سے آخر تک بغیر پڑھے ہوئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

آپ کی طرزِ تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خواہ جملے طولانی ہوں مگر توازن اور تسلسل میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ایک جملے کے بعد دوسرا بھی اسی انداز سے آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبارت میں اتنا ربط ہوتا ہے کہ ذرا بھی آپ ترتیب میں فرق نہیں ڈال سکتے۔ ایک لفظ کو اگر جگہ سے ہٹاکر دوسری جگہ رکھنا چاہیں تو تمام عبارت کے بے لطف ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

الفاظ کا انتخاب زیادہ تر عربی وفارسی کے ذخیرہ سے ہوتا ہے۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی آمیزش سے آپ جو ادبیت پیدا کرتے ہیں وہ خاص طور پر عبارت کو دلکش اور موضوع کو بلند کردیتی ہے۔ ان کی تشبیہ واستعارے عربی وعجمی انداز کے ہوتے ہیں مگر اردو کی فضا میں اس طرح برجستہ آجاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اسی سرزمین کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے

ایک طرف تو ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مضمون میں شگفتگی بڑھ جاتی ہے۔

ابوالکلام آزاد اپنے انداز بیان کی دلکشی کی وجہ سے بڑے سے بڑے مفہوم کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں اور جب انفرادی اور روزمرہ کے امور کو عالمگیر اصول سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ مضمون کی سطح اونچی ہو جاتی ہے بلکہ دماغی قوتوں کو بیداری کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس طرح سے نثر میں اعلیٰ ذہنیت و معنویت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

جوش و اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد کی تحریریں عام طور سے جوش اور پیام عمل ہوتا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر آدمی مایوسی کی دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ پہاڑ ایسی مصیبتوں کے بعد بھی اس کو کام اور کامیابی کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جوش کے موقع پر ان کے ہر فقرے میں سرگرمی کی آگ بھری نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ہنگامہ خیز مضامین سے ہر تغافل آمیز سکون کو سراپا حرکت بنا سکتے ہیں۔ آزاد کی نثر میں جوش اور ایثار کا عنصر اس کثرت اور شان کے ساتھ آتا ہے کہ ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکشی اور امتیازی خصوصیت پیدا کر دیتا ہے۔ جو ان کی انفرادیت کا بیّن ثبوت ہے

ابوالکلام آزاد کی ایک اور ممتاز خوبی قوت گویائی ہے۔ اس وقت فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو کرنے والا شاید ان سے بہتر کوئی نہیں۔ زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے تقریر میں بھی ایسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں جیسے تحریر میں ترشے اور شستہ الفاظ آتے ہیں۔ کبھی کبھی تحریر میں تقریر کی جھلک آجاتی ہے۔ خطیبانہ انداز سے وہ اپنی عبارت کو پر لطف اور

پُرتاثیر بنا لیتے ہیں۔

ابو الکلام نے قرآن کا مطالعہ اتنی گہری دلچسپی سے کیا ہے کہ ان کی کوئی تحریر یا تقریر قرآنی تعلیمات کے حوالے سے خالی نہ ملے گی۔ اس سلسلے میں بھی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو آیاتِ قرآنی کو عبارت میں برمحل جگہ دینا اور دوسرے ان کا ترجمہ اس خوبی سے اُردو زبان میں بیان کر دینا کہ پورا مفہوم آسانی و خوبی سے ذہن نشین ہو جائے۔

ابو الکلام کی تحریروں کا موضوع زیادہ تر سیاست ہے اور گو اردو ادب کو خاص طور پر فائدہ پہنچانے کے لئے انھوں نے شاید کبھی فرصت نہیں پائی لیکن براہِ راست نہ سہی اردو کو جو فائدہ آپ کی تحریر و تقریر سے برابر پہنچتا رہا ہے۔ وہ خود اپنی اپنی جگہ پر اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ آسانی کیا مشکل سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اردو نثر کو فن لطیف اور دلچسپ بنانے والوں میں آپ کا ہمیشہ ایک خاص مرتبہ سمجھا جائے گا۔

آپ نے الہلال میں جو مضامین لکھے تھے وہ اب "مقالاتِ آزاد" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کارنامے کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ "غبارِ خاطر" بھی اردو کی انشا پردازی میں ایک اضافہ ہے۔ "غبارِ خاطر" میں وہ خطوط ہیں جو آزاد نے قیدِ فرنگ کے زمانے میں یعنی ۱۹۴۲ء میں زندان احمد نگر سے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے۔

آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اِس وقت وہ حکومتِ ہند میں محکمۂ تعلیم کے وزیر ہیں۔

ظفر علی خاں

ظفر علی خاں کا نام جہاں آیا اور زمیندار بھی یاد آگیا۔ گویا اُنکے نام کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس اخبار کو اتنا فروغ دیا کہ ایک زمانہ میں ہر طرف سے قبولِ عام کی سند ملی۔ لوگوں نے آپ کے مقالات کو صحافت کا بہترین نمونہ سمجھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ نہایت دلفریب اور بے لوث طریقہ سے کہا جاتا ہے۔ مطالب کو ذہن نشین کرانے میں ایسا پیرایۂ بیان عموماً اختیار کیا جاتا ہے کہ خیال براہِ راست منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ تمدّنی و سیاسی و آئینی اُمور کے ہر پہلو پر نہایت صاف روشنی ڈالنا ظفر علی خاں صاحب کا خاص حصّہ ہے۔

خیال ہوتا ہوگا کہ ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے ظفر علی خاں صرف سیاسی و آئینی معاملات کے میدان میں تگ و دو کر سکتے ہیں لیکن یہ بالکل سطحی خیال کا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے کہ موصوف کی فکرِ رسا نے محدود دائرے میں قیام کرنا کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ مختلف شعبوں کی سیر کرنا اپنا فرض سمجھا۔ شعر و شاعری سائنس و مذہب ہر ایک کی فضا میں گزر ہوا۔ عزت و وقار کا دامن کہیں ہاتھ سے نہ جانے پایا۔ قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے آپ نے معاشرتی اصلاح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خود بھی مضامین لکھے اور کارآمد سمجھ کر مغربی مصنفین کے خیالات کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔

اس سلسلہ میں آپ کی تصنیف معاشرت قابلِ دید ہے۔

ظفر علی خاں کے ناولوں میں گھریلو زندگی کا نہایت صاف اور اصلی نقشہ نظر آتا ہے۔ جس کے دیکھنے سے موصوف کی دقّت نظری اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کس خوبی سے روزمرّہ کی زندگی اور شریف گھرانوں کے نظام پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ انسانی جذبات کی وہ کیفیتیں جو بشرے سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ان کا اندازہ بھی آسانی کے ساتھ آپ کر لیتے ہیں اسی حسن کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانے پر قادر ہیں مختلف اوقات میں مختلف حرکات و سکنات جو لوگوں سے صادر ہوتے ہیں ان کے اُن پہلوؤں پر بھی آپ غور کر لیتے ہیں جو اپنی نزاکت کی وجہ سے ہر شخص کی نگاہوں میں نہیں آتے اور جن کے نہ معلوم ہونے سے نفسیاتی اُمور کا پُورا اندازہ ہم کو نہیں ہوتا۔

ظفر علی خاں کی نثر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ عموماً اتنے ہی الفاظ کام میں لاتے ہیں جتنے سے اُن کا مطلب واضح ہو جائے۔

روزمرّہ اور محاورات پر اُن کو بہت بڑی قدرت ہے۔ فارسی ترکیبیں زیادہ مرغوب ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ بھی کافی صرف کرتے ہیں کبھی کبھی جوشِ بیان میں ایسے الفاظ و فقرے بھی ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں جو نہ صرف نامانوس ہوتے ہیں بلکہ زبان کے لوچ پر بھی بار معلوم ہوتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی طرزِ تحریر کی خوبیوں کے مقابلے میں یہ نقص بہت اہم نہ سہی مگر جی یہی چاہتا ہے کہ یہ خرابی بھی نہ ہوتی۔

موصوف کا قلم شعر و شاعری کی دنیا میں بھی رواں رہتا ہے۔ نظموں کا ایک مجموعہ بہارستان شائع بھی ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر سیاسی و مذہبی نظمیں ہیں۔ لیکن آپ کی پُرگوئی کو دیکھتے ہوئے یہ مجموعہ ضخامت کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے نظم سے زیادہ نثر کی طرف توجہ کی ہے۔

تشبیہہ و استعارے کی جدّت، بیان کی برجستگی، خیال کا واضح طور پر چند الفاظ میں ادا کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو ظفر علی خاں کو ایک خاص طرزِ تحریر کا مالک بنا دیتی ہیں زبان میں عموماً روانی ہوتی ہے۔ زور اور تاثیر کی بھی کمی نہیں بلکہ جس بات کی اردو ناولوں میں کمی تھی اس کی تلافی کی بھی کوشش آپ نے کی ہے۔ یعنی مزاح کا عنصر موقع سے داخل کرکے عبارت کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ زبان کسی قدر عالمانہ ہے اور یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے خواہ ناول کا میدان ہو یا معرکۂ مذہب و سائنس کا سامنا ہو۔

حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی غالباً اردو کی دنیا میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی سوانح عمری خود لکھکر اردو ادب میں ایک قسم کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کا نام "آپ بیتی" ہے۔ ہم اس کتاب سے خواجہ صاحب کے مختصر حالات انھی کے الفاظ میں لکھدینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے والد کا نام حافظ سید عاشق علی میری قومیت سیّد ہے۔ پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء پرانی دہلی ہے اور وہیں آجکل اقامت ہے۔ معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔"

اس کے بعد صفحہ ۲۳ پر ولادت اور زندگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

"تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب سنہ ۱۲۹۶ھ میں ۲ محرم کو جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ فارسی کی چند معمولی کتابیں پڑھیں

اس کے بعد عربی صرف ونحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا) بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی؛

اپنی شادی اور ابتدائی عہد کی پریشانیوں اور بعض سفر کے حالات بیان کر کے صفحہ ۳۴ پر فرماتے ہیں :

"تقصہ مختصر ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک حسن نظامی کی زندگی مضامین نویسی، تصنیف و تالیف کتب و خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدائے تعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں" لہ

تعداد کے اعتبار سے جتنی کتابیں خواجہ صاحب نے لکھی ہیں، اتنی اردو کے موجودہ دور میں شاید کسی ایک ممتاز مصنف نے نہیں لکھیں اور لکھ بھی کیسے سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کتاب لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

"حالانکہ پہلے ہر مہینے ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی"۔

خیال فرمائیے کہ جو شخص ہر مہینے ایک کتاب لکھ ڈالتا ہو۔ اس کا مقابلہ کون کرے۔ کثرتِ تصنیف کے علاوہ ایک اور قابلِ قدر خوبی یہ ہے کہ آپ نے زیادہ تر ایسے مضامین پر قلم اٹھایا ہے جن پر ابھی تک شاید کسی نے کچھ نہ لکھا تھا۔

لہ یہ بیان "آپ بیتی" کے تاریخ تصنیف کے وقت کا ہے۔ جو غالباً ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی ہے اب خدا معلوم کتنی تعداد کتابوں اور مریدوں کی ان کی وفات تک بڑھ گئی ہوگی۔

خواجہ صاحب کی تصانیف پڑھنے والے پر ابتدا ہی سے طرزِ تحریر کی دلکشی کا اثر ہونے لگتا ہے۔ شروع سے آخر تک عبارت میں انتہا درجہ کا بے ساختہ پن اور بے تکلفانہ انداز ہے جو آمد کا پہلو لئے ہوئے ان کے اسلوبِ بیان میں ایک خاص ندرت اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ دوسری ممتاز خوبی ان کے بیان میں سوز و گداز کا پہلو ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں۔ موقع کو دردناک بنا دیتے ہیں۔ اس قدر دردناک کہ دل سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن بعض وقت یہ خوبی تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہے۔ ایک فقرہ سے دل کو چوٹ کھانے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسرا فقرہ نشتر کی طرح رگِ جان کو چھیڑ دیتا ہے۔ اس طرح پیہم نشتر زنی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سانس لینے کی ذرا فرصت مل جائے۔ خواجہ صاحب کا دل خدا جانے کتنے مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے متاثر ہوا ہے کہ جہاں کہیں ان کی ابتری نظر آئی ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم غمناک مناظر بیان کرنے میں کبھی نہیں تھکتا اور اتنا اثر لئے کر صفحہ کاغذ پر رواں ہوتا ہے کہ دیکھنے والے بھی روتے ہیں اور بہت روتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھنا ہو تو "غدر کے انسانوں" کو دیکھئے جو اپنے رنگ میں عدیم المثال ہیں۔

خواجہ صاحب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ جو سادہ و شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ محمد حسین آزاد کی طرح ایسی عام فہم زبان ہے کہ اب اس سے زیادہ سہل اور کامیاب لب و لہجہ اختیار کرنا بہت مشکل ہے۔ موصوف ٹھیٹ ہندی کے فقرے بھی استعمال کرتے ہیں اور عربی و فارسی کے ادق الفاظ بھی لیکن دونوں ایسے موقع سے کہ بارِ خاطر ہونا تو کیا معنی روانی میں کہیں سے فرق نہیں آنے پاتا۔ چھوٹے چھوٹے جملے نشتر کا کام دیتے ہیں۔ نہ تو تشبیہہ کی بھرمار ہے نہ استعاروں کی بوچھار۔ عبارت میں صفائی

اور چستی کی وجہ سے تاثیر و پختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔
خواجہ صاحب کی نثر میں رعایت لفظی کا نہایت لطیف پہلو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔ جس سے عبارت میں شگفتگی اور جان آجاتی ہے۔ اسلوبِ بیان میں متانت و سنجیدگی خاص طور سے نمایاں ہے اور بزرگانہ انداز تو ایسا ہے کہ تبسم و مزاح کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہونے پاتا لیکن خشکی و پھیکے پن کی ہوا بھی دامنِ مضمون تک نہیں آنے پاتی۔
مضامین کی نوعیت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ موضوع نہ فلسفیانہ ہے نہ عالمانہ بلکہ روزمرہ اور کام کی باتوں پر اخلاق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خامہ فرسائی کی گئی ہے خواجہ صاحب کا فطری مذاق صوفیانہ ہے۔ چنانچہ اہلِ معرفت کے دائرے میں آپ کا نہایت بلند مرتبہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ معرفت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرّے میں آپ کو ایک خاص روحانیت نظر آتی ہے۔ ادنیٰ چیزوں سے بھی وہ غافل انسانوں کو درسِ معرفت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کی کتاب "سی پارۂ دل" کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس خوبی سے ایک مختصر مضمون اور بے جان چیز مثلاً لالٹین یا برف وغیرہ سے وہ سوتے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ اسی کتاب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اس صنفِ تصنیف کی یہ پہلی نمایاں مثال ہے جسے انگریزی میں (ESSAY) کہتے ہیں (یعنی تخیّلی مضمون نگاری) جس میں موضوع کی محض منطقی تحلیل نہیں ہوتی بلکہ ان دلفریبیوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو ایک کیفیت اور حیرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرزِ تحریر کا نقشِ اوّل آزاد کے نیرنگِ خیال کے بعض حصّے کہے جا سکتے ہیں۔
حسن نظامی کا انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

سلیمان ندوی

ان کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ کے ایک گاؤں دیسنہ میں ہوئی۔
ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور
بعد میں یہیں استاد بھی مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔
اس کے بعد ادارے کو بڑی خوبی سے چلاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے
یہاں ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو ان کے پیدا ہونے کی تاریخ
ہے وہی مرنے کی بھی ہے۔

شبلی کے بعد جس خوبی سے دارالمصنفین کی ترقی اور دنیائے ادب میں
نمایاں حیثیت سلیمان ندوی نے قائم رکھی ہے وہ ہر طرح ان کو شبلی کا صحیح
جانشین ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ شبلی کی طرح ان کو بھی تاریخ سے خاص
شغف تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اسلام کے سیاسی اور ادبی کارناموں پر اس
خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں کہ گمنامی اور غلط فہمی کی تاریک گھاٹیوں سے واقعات
نکل کر حقیقت کی سطح پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

سلیمان نثر لکھنے میں ایک طرزِ خاص کے مالک تھے۔ ان کی عبارت میں
ادبیت و پختگی کے علاوہ علمیت کا بھی ذخیرہ رہتا ہے۔ لیکن علمیت ایسی نہیں
جو کانوں کو گراں معلوم ہو۔ اس میں بے موقع عربی کے بڑے لفظوں کا استعمال نہیں
بلکہ عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ ہوتے ہیں۔ جن کا استعمال کرنا آپ ہمارے لئے

ناگزیر ہو گیا ہے جن کے بغیر ہم اپنے بلند خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے۔

سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہیں بناتے۔ ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ اپنے خیالات اور الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے وہ فارسی و عربی کے عالم تھے مگر اردو نثر میں مولویانہ رنگ کبھی نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی نہ تو مضمون میں خشکی ہوتی ہے اور نہ بے محل ادق الفاظ سے زبان کی لطافت گھائل ہوتی ہے، نہ روانی میں فرق آتا ہے بلکہ خشک مضمون کو بھی وہ اپنی طرزِ تحریر سے دلچسپ بنا لیتے ہیں اور الفاظ کے برمحل استعمال سے سلاست ہر جگہ قلم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور کبھی کبھی شگفتگی شوخی و ظرافت کی حد تک پہنچ کر مضمون کو بے حد مزیدار بنا دیتی ہے۔

سلیمان ندوی اردو کے ایک اچھے مقرر بھی ہیں لہٰذا عبارت میں کبھی کبھی خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اندازِ بیان میں برجستگی اور مضمون میں ایک خاص لطف آجاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے قوم و ملک کو کورانہ و نمائشی تقلید سے بچانے کے لئے اکثر نہایت پُر اثر الفاظ میں لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن جو بات کہتے ہیں وہ ناصح مشفق کی طرح نہیں بلکہ نہایت خلوص اور لطیف اشاروں سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا رسالہ معارف ایک عرصہ سے ادب و قوم کی قابلِ قدر خدمت کر رہا ہے اور اپنے علمی مضامین کے اعتبار سے ملک میں ایک بلند پایہ جریدہ سمجھا جاتا ہے۔ منجملہ اور کتابوں کے سلیمان ندوی کی تصنیف خیّام نہایت ہی اعزاز کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔

آپ کی اردو زبان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نے آپ کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی جو آپ کے لئے بہت مناسب ہے۔
آخر وقت میں وہ پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں کراچی میں ۱۹۵۳ء
میں انتقال ہوا۔

قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ سب سے پہلے وہ پبلک سے اس وقت روشناس ہوئے جب وہ "ہمدرد" کے اولین دور میں ایڈیٹر کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آئے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا یا جو طرز تحریر انہوں نے اختیار کیا وہ زیادہ تر مولانا محمد علی کی صحبت اور اصلاحوں کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ انہیں صحافت کے گر نہ بتاتے تو وہ اس بلندی پر نہیں پہنچ سکتے تھے جس پر وہ بلآخر پہنچ گئے۔

"ہمدرد" کے بند ہو جانے پر انہوں نے حیدرآباد کا رخ کیا اور وہاں سے "پیام" نام کا اخبار نکالا۔ جو چسکا انہیں لگ چکا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہا۔

ان کی تصانیف بھی متعدد ہیں۔ اور اپنے زمانہ میں کافی مشہور ہو چکی ہیں۔ تین پیسے کی چھوکری۔ مجنوں کی ڈائری۔ لیلیٰ کے خطوط اور حیات حکیم اجمل خاں وغیرہ ان کی شہرت کو ہمیشہ قائم رکھیں گی۔

وہ بہت آن بان کے آدمی تھے۔ اور ان کا خوش سلیقہ اور خوش لباس لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اردو کی صحافت کی تاریخ میں ان کا نام جلی حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے کہ وہ ساری عمر صحافی رہے۔ محمد علی جس طرح

صحافت کو پبلک کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے اسی طرح قاضی صاحب بھی اسے سمجھتے تھے۔

ان کا طرز تحریر شگفتہ تھا۔ ان کے مضامین کی ابتدا کسی نہ کسی شعر سے ہوتی تھی اور تان بھی کسی نہ کسی شعر پر ٹوٹتی تھی۔

عبدالماجد دریابادی

عبدالماجد صاحب دنیائے اردو میں اپنی فلسفہ دانی کی وجہ سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ انھوں نے اس معرکہ میں کارنمایاں کئے ہیں اردو میں فلسفہ بہت کم تھا جو ذخیرہ تھا بھی اس میں بیشتر حصّہ ترجمہ کا تھا۔ مگر عبدالماجد نے نہایت جانفشانی و قابلیّت کے ساتھ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھیں اور کارآمد کتابوں کا غیر زبان سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

آپ کی تصانیف میں "فلسفہ جذبات" اور فلسفہ اجتماع اور ترجمہ میں "مکالمات برکلے" نہایت قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ ترجمہ میں سب سے پہلی چیز جہاں لوگوں کو لغزش ہو جاتی ہے وہ زبان کا میدان ہے۔ انگریزی نما اردو لکھکر لوگ سمجھتے ہیں کہ مترجم کا اہم فرض ادا ہو گیا۔ لیکن یہ وہ ٹھوکر ہوتی ہے کہ جس کی بدولت قبولِ عام کا شرف ہمیشہ دور باش کی صدا دیتا ہے۔ عبدالماجد نے اس ترجمہ میں علاوہ اور باتوں کے زبان و طرزِ بیان کا خاص طور سے خیال رکھا

ہے۔ محاورہ اور روزمرّہ کی چاشنی مناسب مقامات پر دیتے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی ہر وقت باقی رہتی ہے۔ تصنیفات میں زبان عالمانہ ہے۔ غالباً فلسفہ کی اہمیت و دقت پسندی کا خیال رکھکر وہ عربی و فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے عبارت میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ جیسا ماحول ہوتا ہے ویسی ہی زبان اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً فلسفہ کا مضمون لکھنا ہے تو پیرایۂ بیان عالمانہ ہوگا۔ الفاظ بھی عربی اور فارسی کے ذرا مشکل قسم کے صرف ہوں گے۔ مرزا رسوا کی سوانحمری یا شاعری پر تنقید ہوگی تو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوگا اور الفاظ بھی کچھ کم مشکل رہیں گے لیکن مرزا شوق کی مثنویوں (زہر عشق وغیرہ) کے متعلق اظہارِ خیال فرمائیں گے تو زبان اور الفاظ بھی اسی قبیل کے ہوں گے جو مرزا شوق کے کلام کو اور زبان کو پوری طرح ذہن نشین کرا دیں یعنی اس وقت ان کی لغت میں نہایت عام فہم اور شوخ لفظ نظر آتے ہیں۔ اسلوبِ بیان بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عامیانہ مضامین کی فضا کو نہ تو اتنا پست ہونے دے کہ مبتذل نظر آئے اور نہ اتنا بلند ہی کر دے کہ فلسفہ کی طرح دماغ کو رسائی کے لئے تخیل کے پر پرواز کی ضرورت پڑے۔ مختصر یہ کہ ہر ماحول کو اس کی اصلی حالت پر قائم رکھتے ہوئے مفہوم و نکات کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں۔ باوجود ان باتوں کے بھی طرزِ بیان کی انفرادیت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ان کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز ہے کہ مضمون کے درمیان میں کبھی کبھی سوالات خود ہی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح پر بحث طلب نکتہ کے متعلق

جتنے موافق و مخالف سوال ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ گویا ہر خلش
کو جو ایک سمجھدار آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ نہایت خوبصورتی سے دور
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں پڑھنے والے کو علاوہ قدرت بیان کے
تاثیر اور زور کا بھی اندازہ ہوتا جائے گا بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں
آپ بول چال کے وہ الفاظ کبھی کبھی لے آتے ہیں جو غالباً بولنے ہی کے لئے مخصوص
ہیں۔ مثلاً "ہا" جو اظہار غم کے وقت زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ مرزا
رسوا کے قصے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ:

"کیسے کیسے افسانہ گو، افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں
سنانے بیٹھے مگر "ہا" دیکھتے دیکھتے خود ان ہی کی زندگی افسانہ بن گئی"

اس کو قدامت پسندی سمجھئے یا وضعداری کہئے کہ عبدالماجد کی عبارت میں
کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو اب زیادہ پسند نہیں کئے جاتے مثلاً تئیں،
اور پس وغیرہ اور کبھی کبھی عبارت کا مقفّیٰ ہونا بھی آپ کی نثر میں نظر آجاتا ہے۔ لیکن
باوجود متروک ہونے کے بھی یہ چیزیں اس خوبصورتی سے عبارت میں جگہ پاتی ہیں
کہ بدمزگی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

نصیر حسین خیاؔل

نصیر حسین پٹنہ میں ۲۱ مارچ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ تین سال کے تھے کہ ان کے والد سیّد نوروز حسین خاں کا انتقال ہوگیا نصیر حسین کی دادی نے ان کی پرورش کی۔ نصیر حسین خاں کا خاندان فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں عظیم آباد (پٹنہ) آیا اور بس گیا۔ نصیر حسین کے آبا و اجداد کو شاہانِ مغلیہ کی طرف سے بہار میں جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔

نصیر حسین سات سال کے تھے کہ ان کی دادی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب ان کے چچا سیّد جعفر حسین خاں اور ماموں شاؔد عظیم آبادی نے ان کی ذمّہ داری اپنے سر لے لی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق نصیر حسین کو اردو فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد انگریزی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نصیر حسین کو علم و ادب سے فطری شغف تھا چنانچہ جب ۱۷ سال کے تھے تو ادیب نام کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ نکالا تھا۔ ان کو سیر و سیاحت کا بھی کافی شوق تھا ۱۹۲۰ء میں یورپ گئے اور اسی سلسلہ میں ایشیا کے بھی بعض ممالک کے دورے کئے۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں دفعتاً قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ اور وہیں انتقال ہوا۔

نصیر حسین خیاؔل جس پایہ کے نثر نویس تھے۔ اس کا خیال کرکے اگر ان کو آزاد ثانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہی دہلی کی ٹکسالی نرم و شیریں زبان ہے۔

یہی روانی اور فصاحت ان کی عبارت کی بھی جان ہے۔ جس طرح آزاد روزمرہ اور عام فہم الفاظ سے تاثیر کا طلسم باندھتے تھے۔ ایسا ہی ان کو بھی زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ زور کے موقع پر زور اور غمناک منظر کے لئے نہایت چبھتے ہوئے دل ہلا دینے والے الفاظ بلکہ آپ کو ان کے یہاں نظر آئیں گے۔ ہر موقع کی تصویر نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش نظر کر دینا ان کا خاص رنگ ہے۔

عبارت میں شروع سے آخر تک کہیں بھی ناہمواری نہ ملے گی۔ فارسی و عربی کے ادق الفاظ اور ہندی کے ٹھیٹ الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر اس حسن سے کہ یکسانیت مجروح نہ ہونے پاتی ہے۔ اور بجائے ثقل کے ایک خاص قسم کا لطف و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کو کام میں لانے کے پہلے وہ محلِ استعمال کو اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ سلاست و روانی میں فرق آجائے۔ گویا ان کا دریائے طبع نشیب و فراز تمام مراحل سے گزر کرتا ہے۔ مگر ذوقِ نگہ کو کہیں کہیں سے بھی بے لطف نہیں ہونے دیتا۔

خیال اپنے مطلب کو ادا کرنے کے لئے صرف اتنے ہی الفاظ لاتے ہیں جتنے کہ ان کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکیں۔ زائد الفاظ و بیکار جملوں کو وہ سخت ادبی گناہ سمجھتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو سے ان کو اس قدر فطری ذوق و غیر معمولی محبت تھی کہ اس کی تفضیلت اور اپنی سمجھ میں اس کی بہبود کے لئے کبھی کبھی تحقیق و دلیل کی زحمت نہیں فرماتے مگر عبارت کی دلکشی و طرزِ بیان کی خوبی اس کو بھی مشکل سے نظر میں کھٹکنے دیتی ہے۔

خیال کے اسلوبِ بیان کی یہ خوبی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جس فضا کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق اسی قبیل کے الفاظ و جملے بھی لاتے ہیں تا کہ منظر میں دلکشی اور بیان میں شگفتگی زیادہ ہو جائے لیکن متانت و

سنجیدگی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ سادگی سے رنگینی پیدا کرنا یہ آپ کی نثر کا امتیازی پہلو ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی متانت آمیز رنگینی آجاتی ہے اور بڑے سے بڑے مفہوم کو اس پردے میں اشاروں کے ساتھ نہایت خوبی سے اہلِ نظر کے سامنے پیش کر کے قدرتِ بیان اور زبان پر عالمانہ تصرف کی داد لیتے ہیں۔

تنقید

غدر کے پہلے جس طرح اُردو شاعری ایک بنے بنائے راستہ پر چلتی رہی اور معاشی و معاشرتی حالات نے زندگی میں کوئی طوفان نہیں اٹھایا اسی طرح طرزِ تنقید پر بھی ایک جمود سا طاری رہا۔ قوتِ نقد کا اظہار انہی مقررہ اصولوں کے ماتحت ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آتے تھے اور جو اُردو شاعری یا ادب کی پیدائش سے پہلے بن چکے تھے۔ یہ طرزِ تنقید موجودہ فنِ تنقید سے بہت الگ تھی......... معنی اور مواد نے اسلوبِ بیان اور جدتِ ادا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے جس کے اثر سے نقاد کو بھی صرف اسلوب اور طرزِ ادا سے دلچسپی رہ گئی تھی اور شاعر کے لئے "خوش گو" "بامزہ" "خوش فکر" کے سے لفظوں کے استعمال میں تلاشِ مضامینِ تازہ "جدتِ ادا" پر قدرت رکھنے کی جانب اشارہ

ہوتا تھا۔

اردو شاعری کی طرح اُردو تنقید میں بھی انیسویں صدی میں ایک اہم دور شروع ہوا۔ معاشرتی اور معاشی نظام کی تبدیلی سے اصلاح پسندی کے ساتھ ساتھ عقل پرستی کا رواج ہوا اور مذہب، سیاست، تعلیم، شعر و ادب ہر ایک میں عقل سے کام لے کر اصلاح کی کوشش کی گئی، نئے نقادوں نے اسی مادی اور معاشرتی تغیر کی روشنی میں اپنا رستہ بنایا۔ جو مغربی اثرات کے پھیلنے، ہندوستان کے نیم صنعتی نیم جاگیردارانہ ہوجانے کی وجہ سے عمل میں آیا، قدیم وجدید کی جنگ، روایات و اصلاح کی جنگ ہر جگہ جاری تھی اور میدان آہستہ آہستہ تاریخ کی نئی طاقتوں کے ہاتھ میں آرہا تھا۔ مشرق و مغرب کے اس تصادم میں دونوں اصول نقد کا جائزہ لیا گیا اور جس طرح تقریباً ہر شعبہ میں مغرب کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی اسی صورت سے مغربی اصولِ نقد بھی اُردو پر حاوی ہوگئے۔

سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں نئے انداز سے اردو ادب پر تنقید کی پھر اس کے بعد حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر فن تنقید کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی، شبلی نے شعر العجم کے چوتھے حصہ میں اصول تنقید پر روشنی ڈالی، موازنہ انیس و دبیر لکھ کر راستہ بتایا کہ کسی شاعر کے کلام میں خوبیاں و خرابیاں کیسے دیکھی جائیں۔

مغربی تعلیم کی روشنی میں تنقید پر روز افزوں ترقی کرتی رہی، انگریزی کے اصول نقد سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے ہمیشہ سے زیادہ اس طرف توجہ کی رفتہ رفتہ یہ سے اتنی بڑھی کہ اب اُردو کا خزانہ فن تنقید کے لحاظ سے حقیر نہیں کہا جاسکتا۔

چکبست

سب سے پہلی چیز جو ہمیں چکبست کے مضامین میں متاثر کرتی ہے وہ ان کی تنقید کا صحیح معیار ہے، ان کو زبان پر بہت بڑی حد تک قدرت حاصل تھی اور اس لئے خیالات کے اظہار میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ نہایت صاف الفاظ میں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے تنقید کے اصول کا صحیح صرف پیش نظر رکھ کر کہتے تھے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر مضامین ان لوگوں پر لکھے ہیں جن سے انہیں عقیدت تھی یا جن سے وہ محبت رکھتے تھے لیکن عصبیت نام کے لئے بھی نہیں وہ کمزوریوں کا اظہار اس بے باکی سے کرتے ہیں جس طرح محاسن بیان کرتے ہیں، متانت و منصف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب گلزار نسیم کی اشاعت کرکے ان کو ایک ہنگامہ سے دوچار ہونا پڑا اس وقت بھی انھوں نے نہایت متانت وسنجیدگی سے اس ادبی معرکہ میں قدم رکھا ان کا مباحثہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے، وہ ہر اعتراض کی تہ تک پہنچ کر اس کی بیخ کنی کی کوشش کرتے تھے اور ان کی فطری ذہانت اور جدت ان کی دستگیر ہوتی تھی اس لئے ان کا تیر ہمیشہ نشانے پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ مباحثہ کا انداز ان کے پیشہ نے سکھا دیا ہو۔

چکبست کی نثر اپنی سادگی اور روانی کے اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ تنقید کا ساخشک مبحث بھی ان کے قلم سے چھو جانے کے بعد رنگین اور دلچسپ نظر آنے لگتا ہے، اثر ان کے کلام کا ساتھ کہیں نہیں چھوڑتا اور اثر ہی پیدا کر دینا ان کی نظم و نثر دونوں کی امتیازی خصوصیت ہے ان کی عبارتوں میں فسانۂ عجائب کی مضمون آرائی نہیں لیکن مؤثر بنانے کے لئے الفاظ کا انتخاب بیشک جملوں میں رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی مقفیٰ عبارت کا استعمال بھی اسی پسند کا نتیجہ ہے۔ عبارت کو زوردار بنانے کے لئے کبھی خطیبانہ انداز بھی کام میں لاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں گویا وہ ان سے ہم کلام ہیں۔ ظرافت کی ہلکی سی لہر مباحثوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن نہ تو وہ طنز میں شمار کی جا سکتی ہے اور نہ عام لوگوں کے مذاق کی ہوتی ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا رنگ تنقید شوخ ہو جاتا ہے بلکہ سارے مضمون میں ایک شگفتگی اور تازگی کی روح دوڑ جاتی ہے۔

مضمون نگار کا ایک اہم فرض یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ مضمون کے مبحث اور موضوع سے اچھی طرح ہمدردی رکھے ورنہ اس کے قلم میں وہ زور اور بندش میں وہ چستی آ ہی نہیں سکتی جس سے مضمون عام سطح سے بلند ہو جائے چکبست جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خلوص اور اثر کا عنصر بہت کافی ہوتا ہے عموماً ہم کو بھی ان کے احساسات میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ منشی سجاد حسین مرحوم تربھون لال ہجر اور کشن نرائن درد کا مرثیہ جب اُن کے قلم سے بیان ہوتا ہے تو ہمیں اس میں قومی نقصان اور ادب کی بربادی کا نقشہ نظر آنے لگتا ہے یہ اثر انگیزی ان کی عبارت کی جان ہے۔

عبدالحق

ڈاکٹر عبدالحق ایک عرصہ سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں، آپ کی سرپرستی میں آئے دن دکن کے پرانے دبے ہوئے دفینوں کی اشاعت بجائے خود ایک اعلیٰ قسم کی علمی خدمت ہے گو موصوف کی ابھی تک کوئی بڑی تصنیف ہمارے سامنے نہیں آئی لیکن جو مقدمات مختلف کتابوں کے شروع میں آپ نے لکھے ہیں وہ کتابی صورت میں کسی قابلِ قدر تصنیف سے کم نہیں۔ خوش قسمتی سے یہ مقدمے دو جلدوں میں شائع ہوگئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے سب سے پہلی چیز جس کا اثر دلوں پر ہوتا ہے وہ عبدالحق کی طبیعت کی ہمہ گیری ہے۔ مختلف مسائل پر آپ نے خامہ فرسائی کی ہے اور قابل قدر انداز سے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گوناگوں مسائل پر کس قدر عبور ہے۔

عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے جس میں دلّی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ عبارت میں عموماً سادگی اور روانی رہتی ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کر دینا آپ کا امتیازی اسلوبِ بیان ہے۔ طرزِ بیان میں شگفتگی اتنی کافی ہوتی ہے کہ مشکل باتیں بھی آسانی سے

واضح ہو جاتی ہیں جس طرح موقع و محل کے لحاظ سے عربی و فارسی کے بڑے الفاظ مطلب براری کے لئے استعمال کرتے ہیں اسی طرح مناسب جگہ پر ہندی کے بھی الفاظ مثلاً کھنڈت، دکھیا را وغیرہ بھی کام میں لے آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں روزمرہ اور بامحاورہ اُردو کی چاشنی، نثر میں ایک خاص قسم کا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ جستجو و تحقیق سے اس قدر شغف ہے کہ وہ یہ بھی نہیں پسند کرتے ہیں اور شوخ عبارتیں ان کے مفہوم واضح کرنے کے راستے میں حائل ہوں لہٰذا آپ کو ہر جگہ سیدھی سادی عبارت ان کی نثر میں ملے گی۔

ڈاکٹر عبدالحق کا تذکرہ تشنہ رہ جائے گا اگر ان کے رسالہ اُردو کا تذکرہ اس کتاب میں نہ آ سکے۔ یہ رسالہ بالکل علمی رسالہ ہے۔ اپنی حیات سے ایک آج تک اس نے اُردو داں طبقہ کی معلومات میں جو علمی اور ادبی اضافہ کیا ہے۔ وہ آسانی سے کیا مشکل سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

ان عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی گولڈن جوبلی (۱۹۳۷ء) کے موقع پر آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی جس کے آپ یقیناً مستحق تھے۔

مقدمات کے علاوہ آپ کے ریویو "چند تنقیداتِ عبدالحق" اور "خطباتِ عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

نیاز

موجودہ دور کی نثر نگاری مختلف راستوں پر گئی، طرزِ تحریر کی شگفتگی کے لئے جدت پسند طبیعتوں نے مخصوص انداز اختیار کئے، نیاز فتحپوری کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو ادب میں اپنے رنگ سے ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ الفاظ اور ترکیبوں کی خوبصورتی ایک خاص جوش سے مل کر ایک ایسا بیان اختیار کرتی ہے جو صرف نیاز کی تحریر میں پایا جا سکتا ہے انھوں نے مخزن اور نقاد میں جنم لیا اور پھر خود نگار نکال کر ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کر لی لکھنے کے لئے تو انھوں نے مختلف موضوعات پر مقالے اور مضامین لکھے لیکن ان کا خاص رنگ افسانہ نگاری میں پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ سیرتِ انسانی کے باریک اور پوشیدہ راز، کیفیاتِ قلب کے مختلف اثرات اس قدر دلکش انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ذہن مسحور ہو کر اسی دنیا میں کھو جاتا ہے، ان کا پہلا طویل افسانہ "ایک شاعر کا انجام" اپنی دلکش اور نادر ترکیبوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالتا ہے۔ جس میں کردار نگاری پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے کردار نفسیاتی نقطۂ نظر سے چند ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو ان سے کسی

حالت میں علیحدہ نہیں ہوتے ان کی زندگی کے نشیب و فراز اسی حد تک ان میں تغیر پیدا کرتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے لئے ضروری ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیاز کے افسانوں کا موضوع صرف محبت ہوتا ہے جس میں شاعرانہ رنگینیاں تو بہت کچھ پائی جاتی ہیں لیکن کوئی ایسا اخلاقی سبق جو موجودہ دور کشمکش کا حل پیش کر سکے نظر نہیں آتا۔

نیاز کے یہاں جو چیزیں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں وہ ان کا مخصوص طرزِ بیان اور زورِ قلم ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اکثر معمولی سی بات کو بھی اتنا رنگین بنا کر سامنے لاتی ہے کہ وہ ضرور دلکش نظر آنے لگتی ہے۔ ان کی "مذہبیات" سے قطع نظر کر کے ہم ان کے ادبی کارناموں کو دیکھتے ہیں تو وہ ادب کے لئے ایک عمدہ ذخیرہ ہیں، انھوں نے عربی اور فارسی کے بہت سے خیالات اور الفاظ کو اردو میں اس طرح ملا دیا کہ وہ زبان کا ایک جز دبن گئے ہیں۔ ان کی جدت پسندی انہیں ہمیشہ عام راستوں سے الگ لے جاتی ہے اس لئے ان کے مضامین عام مذاق کے نہیں ہوتے اور ان میں علمیت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ایک اچھے رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ وہ کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں اور اس وقت تک کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" "تاریخ الدولتین" "فراست الید" "جذبات بھاشا" "ترغیبات جنسی" وغیرہ اردو داں حضرات نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔

کتابوں کی یہ فہرست ہی بتا دے گی کہ نیاز اکثر مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ وہ اس ادبی شان کو برقرار رکھتے ہیں جو ان کیلئے مخصوص ہے نیاز کی تحریر میں بیباکی اور آزادیٔ رائے قدم قدم پر موجود ہے۔

مسعود حسن

آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو فارسی کے صدر تھے، اب ۵۴ء میں سبک دوش ہو گئے ہیں۔ کتب بینی کا ذوق آپ کا ایک فطری مشغلہ ہے یہاں تک کہ اس کا اثر آپ کی بینائی پر پڑ چکا ہے۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ نایاب اور کار آمد کتابوں کا بیش بہا خزانہ ہے۔ غالباً مطالعہ سے آپ کو اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے حالانکہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے اور ادیبؔ تخلص ہے لیکن ادبی دنیا آپ کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے جانتی ہے۔ آپ کی کتاب "ہماری شاعری" اردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، حالیؔ کے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ "ہماری شاعری" کا وجود بہت بر وقت ہوا۔ انجمن ترقی اُردو نے اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا اور اس کتاب کو اپنی طرف سے شائع کیا۔ جب سے یہ کتاب چھپی ہے اُسے قبولِ عام کی سند ایسی حاصل ہوئی ہے کہ متعدد بار چھپ چکی ہے۔

آپ کے ادبی کارنامے "ہماری شاعری" تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ کئی کار آمد کتابیں آپ مرتب بھی کر چکے ہیں جیسے ذکرِ میرؔ، روحِ انیسؔ، اندر سبھا، دیوان فائز۔ ان میں آپ نے مقدمات بھی لکھے ہیں جن کو اپنی جگہ

بہ خود ایک مستقل مضمون کی اہمیت حاصل ہے۔ ان مقدمات میں بھی آپ کے الفاظ و زبان، نرمی اور روانی کے لحاظ سے دلکشی اور دلچسپی کا سرمایہ ہیں۔ ویسے کئی کتابیں اور بھی آپ لکھ چکے ہیں۔

صحیح اور سادہ نثر لکھنا مسعود صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے جو باوجود اپنی سادگی کے نہ تو بے کیف ہوتی ہے اور نہ خشک بلکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے ایک خاص روانی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے، شروع سے آخر تک آپ کا طرزِ نگارش یکساں اور ہموار ہے باوجود ثقیل اور وزنی مسائل پر گفتگو کرنے کے پڑھنے والوں کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں، آپ زبان اور طرزِ نگارش پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنی تنقید میں زیادہ تر انہی چیزوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر کسی طبقہ کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے یہاں عمق اور فلسفہ بہت کم ہے تو یہ ایسی کمی ہے جو ابھی تک تمام اُردو تنقید میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔

اصولِ تنقید کے لحاظ سے مسعود صاحب قدامت پسند نظر آتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ اُردو شاعری کی روش آپ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ اس افادی شاعری کو خطابت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ قدیم رنگ کی جذباتی شاعری میں ایک سکون اور نجات کا دریا موجزن پاتے ہیں اور موجودہ رجحان اور حقیقت نگاری کو شاعری میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ غالباً اس لئے کہ زندگی کی حقیقتوں اور پریشانیوں سے یہاں بھی

دو چار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہماری زندگی موجودہ حالات میں سراپا پریشانیوں کا مرقع ہے اور ان کا دور کرنا ہمارے لئے اب ناگزیر ہوگیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین اور شعراء حیات کو ادب سے ہم آہنگ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، قدامت پسندی کے لحاظ سے زندگی کی کشمکش سے سکون حاصل کرلینا ہی ادب کا مقصد ہے۔ لیکن موجودہ شاعر اس کو فراریت سے تعبیر کرتا ہے اور قدیم روّیہ کو اُردو ادب کی ترقی میں ایک روڑا سمجھتا ہے، بہر حال یہ فرق جدید اور قدیم خیالات اور اصول زندگی کے ہیں۔ یہاں اس بحث کو زیادہ بڑھانا نامناسب اور شاید بیکار بھی ہے۔

مسعود حسن صاحب جس انہماک کے ساتھ اپنی تحقیق اور تدقیق کی سرگرمی کو قائم کئے ہوئے ہیں اور جس وسیع النظری کا ثبوت اب تک انھوں نے دیا ہے اس سے اُمید ہے کہ وہ موجودہ ادبی رجحانات سے بھی اپنے کو دور نہ پائیں گے۔

محیؔ الدین زورؔ

ڈاکٹر زورؔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو ادب کے پروفیسر ہیں۔ انگلستان سے ادب کے ڈاکٹر ہونے کی سند بھی لائے ہیں۔ اردو ادب کی خدمت کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ تعداد خود اپنی جگہ پہ ڈاکٹر زورؔ کے علمی شغلہ

کی شہادت کے لئے بہت کافی ہے۔.....................
لیکن جب ہم تصنیفات کے مختلف موضوعات پر نظر ڈالتے ہیں تو وقعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

آپ نے اُردو ادب میں تنقید کی کمی محسوس کرکے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ انگریزی کے فن تنقید سے مدد لے کر اپنے ادب کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ نہایت محنت کے ساتھ اصولِ تنقید، اقسامِ تنقید پر مواد فراہم کیا، اُردو ادب پر ان کی روشنی میں نظر ڈالی۔ مختلف مصنفین کے کارناموں پر بحث کی۔ شبلی کی طرح اُردو کو فائدہ پہنچانے کے لئے اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی نثر و نظم پر تنقیدی نظر ڈالی بعض انگریزی شعراء کے کلام پر رائے زنی کرکے ہماری رہنمائی کے لئے عمدہ نمونے پیش کئے، ڈاکٹر زور کا یہ تمام کارنامہ اپنی جگہ پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تصانیف میں ہم کو کافی ایسا مواد مل جاتا ہے جو ادبی و علمی معلومات کے لئے بہت کار آمد و ضروری ہے۔ اپنے مطالعہ سے خود ہی فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ جو کچھ عمدہ چیزیں کہیں منتشر صورت میں بھی نظر آجاتی ہیں، ان کو اُردو ادب میں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کے سامنے کتابی صورت میں مع اپنی رائے کے فوراً پیش کر دیتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک قابلِ قدر خوبی یہ ہے کہ انگریزی فن تنقید کے وسیع مطالعہ سے آپ بیجا طور پر مرعوب و متاثر نہیں ہوئے۔ مشرق و مغرب کے طرزِ معاشرت کے نقطۂ نظر کے اختلافات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ کسی نوجوان اور بھکے ہوئے انگریزی داں یا مغرب زدہ کی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو حقیر نہیں سمجھا۔ ہاں کمی ضرور محسوس کی ہے۔ جو واقعہ بھی ہے اور بغیر اس احساس کے ادب کی ترقی بھی ناممکن ہے۔

ڈاکٹر زور کو غالباً کثرتِ مطالعہ نے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اپنے اسلوب بیان میں کوئی خاص انفرادیت پیدا کرسکیں۔ انکے طرز بیان میں سادگی و روانی تو ہے، سنجیدگی و متانت کی بھی کمی نہیں۔ لیکن جملوں میں ذہن جوش و زور کو ڈھونڈتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس فقدان کی وجہ سے عبارت میں ایک پھیکا پن کبھی کبھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ادبیت کی بھی کمی ہے۔ ڈاکٹر زور نے تنقیدی مقالات میں ایک جگہ "حالی کی طرزِ تحریر اور ان کی بعض نمایاں خصوصیات کی فہرست دی ہے ان میں سے کافی ایسی ہیں جو ہم خود ڈاکٹر زور کی خصوصیات میں کم و بیش پاتے ہیں خود ان ہی کے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی تحریر کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) ان کی عبارت میں ظرافت، شوخی اور طعن و تشنیع بالکل نہیں۔ برخلاف اس کے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔

(۲) ان کے کلام میں فارسی و عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی جدید ترکیبیں بہت کم ہیں۔ جو آج کل کے نوجوان انشاپردازوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ بازاری سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

(۴) تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کام لیتے ہیں۔

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" قائم کرکے زور اُردو کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں اس ادارہ سے بہت سی کتابوں کے علاوہ "کلیاتِ سراج" "کلیاتِ قطب شاہ" بہت اچھی طرح شائع ہو چکی ہیں۔

عندلیب شادانی

ان کا نام وجاہت حسین ہے۔ اصل وطن سنبھل، ضلع مراد آباد ہے۔ نانہال رامپور میں ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ دسویں درجہ میں پڑھتے پڑھتے رامپور سے لاہور چلے گئے۔ وہاں حصول تعلیم میں مصروف رہے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم، اے کیا۔ اس سے پہلے ہی کچھ دنوں حیفس کالج لاہور میں ملازم رہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں فارسی کے لکچرر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اب تک آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی عرصہ سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے کئی مجموعے نظم و نثر میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا قلم نثر و نظم دونوں میدانوں میں یکساں رواں ہے اس کا فیصلہ کرنا آسان کام نہیں کہ وہ شاعر زیادہ ہیں یا نثر نگار۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے نظم میں وہ زیادہ نرالے خیالات قلم بند کرتے ہیں جو اچھوتے ہوں۔ ان کے تجربات یا محسوسات پر مبنی ہوں اسی لئے ان کے کلام میں شگفتگی و تازگی کافی ہوتی ہے۔ الفاظ و خیالات ہم آہنگ ہوتے ہیں اور مناسب بحروں کا ساتھ پا کر پوری دلنشینی و تابناکی کے ساتھ دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔

نظم سے زیادہ ان کی نثری خدمات اردو میں دقیع و قابل قدر ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور اپنی رائے پر اتنا غور کرتے ہیں اور اس کے مخالف و موافق پہلوؤں پر جذبات سے الگ ہو کر اتنا سوچتے ہیں کہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ جاندار اور مدلل ہوتا ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو منطقی ماحول وہ اپنے دلائل کو عطا کرتے ہیں اس دائرے سے باہر نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ جس موضوع یا مصنف پر وہ رائے زنی کرتے ہیں نہایت بے باک ہو کر اظہار خیالات کرتے ہیں۔ خوبی یہ ہے لہجہ یا انداز بیان میں ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ ساری فضا ایک نقد و تبصرہ کے آغوش میں جھومتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے شادانی صاحب گرامر اور ادبی رسمیات پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ سماج کے بدلتے ہوئے رنگ سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے لسانی تغیرات و ضروریات کو رواداری کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے عہد ماضی کے پرستار ہیں، دورِ جدید پر بزرگانہ نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ اتنی صحیح زبان لکھتے بولتے دیکھنا چاہتے ہیں کہ نہ اجتہاد کے قائل ہیں اور ادیبوں کی جرأتِ رندانہ کی داد دے سکتے ہیں نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ کبھی کوئی شاعر ان حالات کو قلم بند کرے جو باوجود حقائق پر مبنی ہونے کے عام طور سے ناگفتنی سمجھے جاتے ہیں۔

شادانی صاحب کا نثر میں اسلوب بیان نہایت سیدھا سادا ہے۔ وہ تشبیہات و استعارات کے سہارے پر قلم نہیں اٹھاتے بلکہ مواد کی فراوانی اور خیال کی مضبوطی سے متاثر ہو کر دل کی بات کہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں ان کی عبارت میں عموماً بول چال کی چاشنی ہوتی ہے۔ محاورات و ضرب الامثال موقع سے پیش کر کے دل کشی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ

وہ ثقیل الفاظ و بے کیف عبارت سے مضمون کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔
شوکت سبزواری نے ایک جگہ شادانی صاحب کے بارے میں لکھا ہے
کہ "انھوں نے اردو اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نگاہ سے کیا ہے۔ اسے ذاتی
معیاروں پر پرکھ کر دیکھا اور جب انھیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد
نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے۔ اگر وہ انفرادیت
کے تنگ دائرے سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو
وہ ان شعرا کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق نہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اس
میں انھیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دُکھتے
دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے" ——— اس رائے
سے ہم کو بھی اتفاق ہے

———•••———

اختر حسین رائے پوری

آبائی وطن عظیم آباد ہے۔ رائے پور سی۔ پی۔ میں ۱۹۱۲ء میں
پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کلکتہ، علی گڑھ اور یورپ
میں حاصل کی۔ جوانی ادبی آوارہ گردی میں صرف کی اور اسی زمانہ کی یادگار
وہ تخلیقی اور تنقیدی شاہکار ہیں جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے
اب وزارت تعلیم حکومت پاکستان میں ڈپٹی سکریٹری ہیں۔
اختر رائے پوری کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "ادب اور انقلاب"

اور "سنگ میل" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور یہ مبالغہ نہیں کہ انہوں نے اُردو تنقید کے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ اُن سے ان کے عمیق مطالعہ اور انقلاب آفریں زاویۂ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختلف ملکوں اور زبانوں سے ذاتی واقفیت کی وجہ سے ان کی تحریر میں غیر معمولی وسعت آ گئی ہے جو اور کہیں مشکل سے ملے گی۔ ان کے افسانوں اور مقالوں کا ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کسی زمانہ میں وہ "رسالہ اردو" میں "ناخدا" کے نام سے کتابوں پر جو ریویو لکھتے تھے، ان کی ادبی دنیا میں بڑی دھوم رہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص اسلوبِ فکر اور طرزِ بیان کے موجد ہیں۔

آلِ احمد سرور

سنہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے والد کی ملازمت کی وجہ سے ہائی اسکول تک کی تعلیم مختلف مقامات پر ہوئی، مثلاً پیلی بھیت، بدایوں، گونڈہ، غازی پور وغیرہ۔ بی۔ ایس۔ سی مئی سنہ ۱۹۳۲ء میں سینٹ کالج آگرہ سے کیا۔ پھر علی گڈھ سے سنہ ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی میں جگہ بھی مل گئی۔ چنانچہ دو سال تک انگریزی پڑھاتے رہے۔ پھر بحیثیت استاد کے شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ کئی سال کام کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہو کر چلے آئے۔ سنہ ۵۵ء میں پروفیسر ہو کر پھر مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔

سرور صاحب کی چار کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، تنقیدی اشارے

نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ، ان کے علاوہ نظموں کا ایک مجموعہ بھی ہے۔

نقاد کی حیثیت۔ سرور صاحب نے بہت جلد ایک خاص شہرت حاصل کر لی جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ سائنس سے بھی واقف تھے۔ انگریزی ادب کے بھی ماہر تھے اور اردو کے تو پروفیسر ہی ہیں۔ انھوں نے اردو کا مزاج سمجھتے ہوئے سائنس کا طرز تخئیل بھی اردو میں لانے کی کوشش کی اور انگریزی ادب سے بنیادی اصولوں اخذ کر کے اپنی زبان کو ہر لحاظ سے وسعت عطا کی۔ مختلف معلومات کے امتزاج کی وجہ سے انکی تنقید نگاری نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ چونکہ بچپن ہی سے ان کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ اسلئے ادبی شعور کے ساتھ ان کی طبیعت کا جزو ہو گیا۔ وہ اردو کے معائب و محاسن پر اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے تھے۔ مشرق و مغرب کے انداز بیان، طرز معاشرت کا فرق پوری طرح محسوس کرتے رہے یہ نہ تھا کہ انگریزی ادب پڑھ کر اس سے اتنا متاثر ہو جائیں کہ اردو کو بالکل انگریزی کی عینک سے دیکھیں لیکن باوجود اختلاف مزاج کے بھی انھوں نے اردو کی ایسی خصوصیات پر جو بادی النظر میں عیوب سے تعبیر کی جاتی تھیں، ٹھنڈے دل سے غور کر کے حقیقت حال بیان کرنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ ان تشبیہات و استعارات و تلمیحات کے پردے ہٹا کر دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ادیبوں کے پیش نظر کیا چیزیں تھیں۔ اردو کے بات کرنے اور سوچنے کا ڈھنگ درحقیقت انوکھا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیئے اردو کے مزاج سے واقفیت ضروری ہے۔

سرور صاحب کا طرز استدلال دلکش ہے۔ وہ جس بات کو سمجھانے ہیں اس کی وضاحت پوری طرح کرتے ہیں۔ عبارت میں ابہام و الجھاؤ نہیں ہوتا

کہ ذہن اصل مقصد تک پہنچنے میں دقت محسوس کرے ایک اور خاص انداز ان کے بیان میں نظر آتا ہے ۔ وہ تنقید کو وہی زبان دیتے ہیں جو اس کے لئے مناسب ہوتی ہے نہ ادبیت زیادہ ہوتی ہے اور نہ زور بلکہ عبارت ایک دھارے کی طرح اپنے راستہ پر چلی جاتی ہے ۔ اس انداز بیان سے بعض لوگوں کو شکایت بھی ہے کہ سرور صاحب کے طرز بیان میں جوش و خروش کی کمی ذہن میں ایک افسردگی پیدا کر دیتی ہے ۔ غالباً اسی قسم کی شکایت کا احساس کرتے ہوئے سرور صاحب نے اپنی کتاب "تنقید کیا ہے" کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھدیا ہے کہ " ایک بات مجھے اپنے اسلوب کے متعلق کہنی ہے ۔ میں نے اپنے مضامین میں جابجا شاعرانہ انداز بیان یا جذباتی اسلوب کے خلاف آواز بلند کی ہے ۔ میرے یہاں اشعار کی کثرت یا اقتباسات کی بھرمار نہ ملے گی لیکن اشعار کے حوالوں ، کتابوں کے نام ، ادبی شخصیتوں کے تذکرے ، ادبی تحریکوں کے متعلق اشاروں سے آپ کو تنقید کے وزن کا اندازہ ہوتا ہے .... مجھے وہ نثر بھی بھلی معلوم ہوتی ہے جس میں خیال آئینے کی طرح واضح ہے جس میں علمیت کا رعب ڈالنا مقصود نہیں " آخر میں اسی کتاب کے دیباچہ سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سرور صاحب کے خیالات تنقید کے بارے میں بھی آپکے سامنے پیش کر دیں وہ لکھتے ہیں " میں تنقید کو ایک سنجیدہ اہم اور مشکل کام سمجھتا ہوں اور اس کا مقصد لطف سخن نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت جانتا ہوں اس لئے پڑھنے والوں سے بھی سنجیدگی اور متانت نہ غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہوں "

وقار عظیم

یہ ان کا تاریخی نام ہے جس سے سنہ ۱۳۲۷ ہجری ان کا سن پیدائش نکلتا ہے میرٹھ کے رہنے والے تھے اب پاکستان میں اورنٹیل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ ہی میں ہوئی۔ پہلے مکتب میں پڑھتے رہے پھر انگریزی اسکول کے پانچویں درجہ میں نام لکھا کر انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ بی۔اے لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا اور ام۔اے الہ آباد یونیورسٹی سے۔ ہر امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرتے رہے بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ یہاں تک کہ دوران تعلیم ہی میں دو مشہور کتابیں "ہمارے افسانے" اور "افسانہ نگاری" ایسی لکھیں جو نہایت کارآمد ثابت ہوئیں۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسب معاش کے لئے مختلف مقامات کا چکر لگاتے رہے۔ مختلف عہدوں پر وقتاً فوقتاً کام کرتے رہے۔ جب حکومت ہند نے سرکاری جریدہ "آج کل" نکالنا چاہا تو سب سے پہلا ایڈیٹر انھیں کو منتخب کیا۔ وقار عظیم صاحب بڑی قابلیت سے مدیر کا فرض ادا کرتے رہے تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے۔ اور وہاں حکومت پاکستان کا رسالہ "ماہ نو" مرتب کرتے رہے۔ گویا ہر سرکاری جریدے کی ابتدا دونو ملکتوں میں ان ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں لکچرر کی حیثیت سے چلے آئے اور اب تک وہیں ہیں وقار عظیم صاحب کا علمی و ادبی ذوق ہمیشہ اہل علم و صاحب فن سے

ملنے پر مائل کرتا رہا۔ چنانچہ وہ برابر پڑھے لکھے لوگوں سے ملتے رہے۔ علم سینہ اور علم سفینہ دونوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ لکھنے پڑھنے کی دھن شروع ہی سے تھی چنانچہ اب تک ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جب لکھنے پر آتے ہیں تو نہ کسی ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ سکون کی فکر کرتے ہیں۔ ان کا قلم ہر حال میں چلتا رہا ہے چاہے شور وغل ہو یا لوگ پاس میں بیٹھے ہوئے دوسری تفریحات میں مصروف ہوں ان کو اپنے کام سے کام، وہ ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی طرح لکھتے وقت ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر فوراً سب کچھ لکھ جاتے ہیں۔ ان کی اس عجلت پسندی میں ایک خرابی بھی کبھی کبھی نظر آتی ہے۔ تفکر و تجسس کے عناصر کم ہو جاتے ہیں لیکن ان کے احاطہ تنقید سے کوئی قابلِ ذکر بات رہ نہیں جاتی جس موضوع کو لیتے ہیں اسی کا پورا جائزہ لیتے ہیں اور بے لوث ہو کر معائب و محاسن پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔

وقار عظیم صاحب کا طرز تخیل دبستان قدیم سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے تنقیدی شعور کو نئے نظریات سے ہم آہنگ نہیں کرنا چاہتے زیادہ تر ان کا خیال الفاظ و زبان کی صحت پر رہتا ہے۔ فن اور مواد پر دھیان کم رہتا ہے لیکن جو بات کہتے ہیں وہ نہایت واضح اور صاف، غالباً ان کی طرز تحریر میں ابہام رنگینی کی گنجائش بھی نہیں۔ ان کے خیال میں بھی سادگی ہے۔ بیان میں بھی سادگی اور طرز تحریر میں بھی۔ ان کی تصانیف پڑھتے وقت آپ کو کہیں ذہن پر بار نہ محسوس ہوگا۔ آسانی سے ہر بات سمجھ میں آجائے گی اور آخر میں محسوس ہوگا کہ بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہوا۔

وقار عظیم صاحب سے اختلاف رائے پر زیادہ دیر تک بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اپنی تائید میں اتنے حوالہ جات پیش کر دیتے ہیں کہ اختلاف کرنے والا مجبور ہو جاتا

ہر کہ ان مستند مصنفوں سے بحث کرے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس استدلال اور وثوق کے بعد جب وقار صاحب انفرادی حیثیت سے کسی ادبی تصنیف یا مسئلہ پر رائے دیتے ہیں تو ان میں پختگی اور شعور کا بڑا حصہ ہوتا ہے ایک اور خوبی ان کے یہاں یہ ملتی ہے کہ نقطۂ نگاہ میں فرسودگی یا بیان میں تکرار نہیں۔ اپنے محدود دائرۂ تخئیل میں وہ آزاد ہو کر نئے پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ طریق کار وسیع النظری سے ہم آہنگ ہو جائے تو ہمکو وقار عظیم صاحب کے یہاں شاید کوئی کمی نہ محسوس ہو۔

ممتاز حسین

ان کی جائے ولادت ضلع غازی پور کا ایک قصبہ 'بارہ' ہے ابتدائی تعلیم غازی پور ہی میں ہوئی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد میں بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم، اے پاس کیا۔ مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔ مزاج میں ہمیشہ سے سیر و سیاحت کا مادہ تھا۔ چنانچہ تقسیم ہند کے پہلے کوئٹہ اور سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں میں نوکری کرتے رہے۔ پھر سب سے دست بردار ہو کر ذوق سیاحت کی تشنگی کو بجھانے کے لئے کبھی مدراس، کبھی میسور، کبھی بمبئی غرض کہ ہندوستان کے ہر گوشہ کی سیر کر ڈالی۔ فی الحال وہ کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

تمام سیر و سیاحت میں انھوں نے اپنا علمی مشغلہ نہ چھوڑا جہاں کہیں بھی رہے

اور جس عالم میں رہے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ پڑھنے کو تو اور بہت سے لوگ پڑھتے رہتے ہیں اور ہر حال میں پڑھتے رہتے ہیں لیکن ممتاز حسین کی انفرادیت قابل قدر ہے کہ جو معلومات وہ حاصل کرتے تھے۔ ان پر غور و فکر برابر کرتے رہتے اور تمام خیالات یا نظریوں پر اپنی رائے قائم کرتے کورانہ تقلید کی نہ کبھی کوشش کی — نہ اپنے ذہن کو بڑے سے بڑے ... مفکر کے سامنے صرف اس لئے مفلوج کرنے کی عادت ڈالی کہ یہ خیال یا فکر ایک بڑے آدمی کے ذہن کا نتیجہ ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کے عادی ہو گئے۔

جہاں تک معلوم ہے ممتاز حسین کبھی فلسفہ یا تاریخ کے باقاعدہ طالب نہیں رہے بلکہ اپنے طور پر ان علوم کا مطالعہ کرتے رہے مگر ان کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ و تاریخ ان کے خاص مضمون تھے۔ مختلف علوم و فنون سے آراستہ ہو کر جب انھوں نے قلم اٹھایا تو بڑی تیزی سے شہرت میں اضافہ ہوا لکھنے کو تو انھوں نے افسانے بھی لکھے مگر فن تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اس میں ایک عالمانہ انداز اور مخصوص فکری عناصر سے قدم اٹھایا۔ جدلیاتی طرز اردو تنقید میں پرانی چیز نہ تھی اس کے سمجھنے اور جاننے والے اردو میں بہت کم تھے۔ ممتاز حسین نے اپنی تنقید کو اس عنصر سے مالدار بنانے کی کوشش کی اور ایسی صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ان سے بہتر اردو میں ابھی تک کسی کا کارنامہ اس نقطۂ نظر تک نہیں آیا۔

ممتاز حسین کی تنقید بڑی ٹھوس اور پر مغز ہوتی ہے اس میں جذبات سے زیادہ عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اپنے خیالات کو دلائل اور تاریخی واقعات سے مضبوط کرتے ہیں۔ اپنی ہر رائے کے لئے ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مغرب و مشرق کی اہم شخصیتوں کے خیالات و اقوال تائید میں لاتے رہتے ہیں۔ ہر

قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے مفکرین کے رشحات فکر کو اپنے ذہن میں جگہ دی ہے انکی تحریر میں اتنا مغز ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر تک پڑھنے کے بعد کتاب رکھ کر سوچنا پڑتا ہے۔ کہ ہم نے کیا پڑھا اور ممتاز حسین نے کیا لکھا اس ہم نے ذہن میں کہاں تک محفوظ رکھا اور آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے پڑھا کم لیکن معلومات زیادہ حاصل ہوئیں ۔ ذہن میں بہت سی نئی باتیں آگئیں ۔

ان کی تحریروں میں نہ تو زور شور رہتا ہے اور نہ غصہ وطنز کی لہریں نظر آتی ہیں بلکہ ایک پروقار سنجیدگی اور ذہنی ابھار کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے صرف کمی یہ ہوتی ہے کہ طرز تحریر میں شگفتگی وہ نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے، الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ساخت کبھی کبھی نامانوس معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ انھوں نے لکھنا بہت دیر میں شروع کیا۔ طرز تحریر میں بے ساختگی نہیں پیدا ہو سکی۔ عبارت میں آمد سے زیادہ آورد ہے ہو سکتا ہے کہ یہ احساس اس لئے ہو وہ غور طلب اور نئی باتوں کے لانے کی فکر میں انشا پردازی کا لحاظ کم کرتے ہیں۔ یا پھر نامانوس باتوں کو نئے سانچے میں دیکھ کر پرانے سانچے میں ڈھلی ہوئی ادبیت ان کی تحریر میں وہ جاذبیت نہ حاصل کرتی ہو جو اسے کرنا چاہیئے ۔

احتشام حسین

آپ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس اعظم گڑھ کے ویسلی ہائی اسکول سے پاس کر کے حصولِ تعلیم کے لئے الہ آباد آئے اور یہاں سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار مقرر ہو گئے۔ اس تقرر سے پہلے ہی اپنی غیر معمولی ذہانت اور اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے دنیائے ادب کی نگاہوں کا مرکز بن چکے تھے، یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد جب فکرِ معاش سے اطمینان ہوا تو آپ نے اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مضامین اور افسانے لکھنے کی طرف اور زیادہ توجہ کی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ملک کے تمام وقیع رسائل میں آپ کے مضامین نظر آنے لگے۔

احتشام حسین صاحب نے مغربی ادب کا بڑی دلچسپی اور شغف کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ان غیر ملکی خیالات کو اپنے ادب پر منطبق کرنے میں کورانہ تقلید کے بجائے احتیاط مدِنظر رکھی ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہیں۔ وہ معاشی اور مادی توجیہ کو ہر دوسرے ادبی نقطۂ نظر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی اور ادب دونوں اساسی قدریں مادی

قدریں ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے ان کی تنقیدوں میں ایک طرح کی انفرادیت ہے۔ "فانی" پر ان کا مضمون تنقید میں ایک نئے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے آپ کی تصنیف "تنقیدی جائزے" اُردو کی فن تنقید نگاری میں ایک اضافہ ہے جو ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ احتشام صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

روایت و بغاوت، ادب اور سماج۔ "اُردو لسانیات کا خاکہ" (ترجمہ) "ویرانے" (افسانوں کا مجموعہ)، "تنقید اور عملی تنقید" ساحل و سمندر، ذوق ادب اور شعور۔

طرز تحریر میں علاوہ شگفتگی کے ایک خاص ندرت و لطافت ہے جس سے دلکشی میں قابل قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

۵۴ء میں احتشام حسین صاحب کو امریکہ کی ایک انجمن نے وہاں کے ذہنی رجحانات کے مطالعہ کے لئے ایک خاص وظیفہ دے کر مدعو کیا تھا۔ اس کے معنی ہیں کہ غیر ممالک کے لوگ بھی ان کی قابلیت اور طرزِ تحریر کے قائل ہیں۔ اس وقت اُردو کے سب سے بڑے نقاد سمجھے جاتے ہیں۔

سال بھر کے بعد احتشام صاحب امریکہ اور لندن وغیرہ کے سفر سے واپس آئے۔ وہاں کے چشم دید حالات اور اپنے تاثرات کو کتابی صورت میں ساحل و سمندر کے نام سے شائع بھی کر دیا ہے۔

باب ہفتم

مختصر افسانہ

قریب قریب دنیا کی ہر زبان میں افسانوں کی ابتدا مافوق الفطرت عنصر سے ہوئی، مصر و یونان، انگلستان سبھوں نے ابتدا میں مبالغہ آمیز قصوں سے قوم و ملک کے دلوں کو مسخر کرنے کی تدبیر کی۔ ہندوستان والے بھی اس راستہ سے الگ نہ چل سکے۔ ان کے یہاں بھی مہابھارت میں اسی قسم کی باتیں آگئیں۔ ناممکن تھا کہ اُردو اس فضا سے الگ رہتی۔ چنانچہ ابتداء میں یہاں بھی داستانِ امیر حمزہ، بوستان خیال، الف لیلہ، فسانہ عجائب وغیرہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں قصوں کی بنیاد زیادہ تر غیر فطری باتوں پر قائم ہوتی۔

اردو میں افسانوی ادب کا دوسرا دور غدر وغیرہ سے ذرا بعد میں شروع

ہوا جس کی ابتدا میں فطری اور غیر فطری عنصر کو ایک جگہ خوبصورتی سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لحاظ سے رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد قابلِ دید کتاب ہے۔ مگر رفتہ رفتہ غیر فطری عنصر کم ہوتا گیا یہاں تک کہ حقیقتوں کا خیال کر کے ناول لکھے جانے لگے۔ ناول کا دور دورہ کم و بیش پچاس سال تک رہا۔ نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار نے طبع زاد ناولوں کی ابتدا کی اور شرر سے رسوا کے زمانہ تک آتے آتے ناول کی رفتار بڑھ کر دفعتاً کم ہوگئی۔ پریم چند اور فیاض علی کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ عمدہ ناولیں اب تک اُردو ادب میں پیش کر رہے تھے۔ درمیان میں ایک ایسا دور بھی آیا جس میں ناول نویسی کی اردو میں رفتار بہت سست ہوگئی۔ اس کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی تھی۔ مگر اب ادھر حال ہی میں پھر ناول کی رفتار بہت تیز ہوگئی، اچھے بُرے ناولوں کا ایک ذخیرہ ہوگیا ہے۔

ناول کی طرح مختصر افسانہ کے لئے بھی اُردو ادب زیادہ تر انگریزی ادب کا رہینِ منت ہے۔ گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کے قدیم افسانوں میں اور بوڑھی عورتوں کی ان کہانیوں میں جو بچوں کو سوتے وقت سنایا کرتی تھیں بعض اجزاء ایسے بھی مل سکتے ہیں جو موجودہ افسانوں کی بنیاد قرار پا سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مجموعی خصوصیات ان افسانوں میں اسی وقت پیدا ہو سکیں جب انگریزی ادب سے آبیاری کی گئی۔ اس سے پیشتر نہ تو کسی افسانے کے اجزاء اور نہ کہانیاں خود مختصر افسانے کی ضمن میں بلا ترسیم کے شمار کئے جانے کی مستحق تھیں۔ ان افسانوں کا سرچشمہ انگریزی ادب توثیق کے ساتھ اس لئے بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ اُردو میں پہلے انگریزی افسانوں کے ترجمے شائع ہوئے، اور اب بھی ترجمے یا تلخیص کا مخزن انگریزی ادب ہے

اور اسی کی دیکھا دیکھی ترکی، روسی اور فرانسیسی زبانوں کے مختصر افسانے اُردو میں آگئے ہیں۔

اُردو میں مختصر افسانوں کی عمر ابھی مشکل سے پچاس سال کی ہوگی مگر جو ہردلعزیزی اور خوبیاں اس قلیل مدت میں اس نے حاصل کرلی ہیں وہ ہر طرح قابل ستائش ہیں جو کچھ خامیاں رہ گئی ہیں وہ بھی غالباً بہت جلد دور ہو جائیں گی، پریم چند کے زمانے سے فن مختصر افسانہ نویسی میں بڑی بلندی آئی اور اب وہ پہلے سے بھی بلند تر ہو گیا ہے۔

پریم چند

جس طرح میر دنیائے غزل میں اسی طرح پریم چند دنیائے افسانہ میں ابھی تک یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ہردلعزیزی کا دائرہ صرف اُردو ہی کی دنیا تک محدود نہیں بلکہ ہندی والے بھی اتنی ہی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنی کہ اُردو والے غالباً افسانہ لکھتے وقت پریم چند کہتے ہوں گے۔ ع

ہاتھ چومیں گے مرے گبر و مسلماں دونوں

پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ خیال

نہیں ہو سکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں۔ وہی روزمرہ کی زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے افسانوں کے دلچسپ مواد ہیں۔ جس عام زندگی کو ہم خشک اور اتنی سادی سمجھتے تھے کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو اسی کو پریم چند اپنے اندازِ بیان سے بغیر تصنع کے اتنی پر لطف بنا کر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سرتاپا دلکش ہو جاتی ہے۔

ان کے افسانوں کا مخزن دیہات ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی، سیرت، سچائی، اور ایمانداری اور کبھی کبھی بعضوں کی بے ایمانی، چالاکی فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے۔ دیہات والوں کی عام زندگی کا مرقع دیکھنا ہو تو ان افسانوں کو دیکھئے جن میں لوگوں کی بیچارگی کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ غریب کاشتکاروں کو کبھی پولیس، کبھی زمیندار کبھی تحصیل کے عملے، کبھی قحط سے ایسا سابقہ رہتا ہے کہ آرام سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ان واقعات کو ایسے دردناک پیرائے میں پریم چند نے بیان کیا ہے کہ دل بھر آتا ہے پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ دیہاتیوں کی جہالت نے انہیں کس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ کہیں جہالت کا زور ہے۔ کہیں توہم پرستی کا جس سے ان کی زندگی اور دوبھر ہو گئی ہے۔ مگر وہ لوگ باوجود ان باتوں کے اپنے پرانے خدا پر شاکر ہیں۔

ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت و اصلیت واقعات کی بناوٹ یا رنگینی میں پوشیدہ نہیں ہونے پاتی۔ روئداد قصہ کو پریم چند اسی روپ میں جانے دیتے ہیں جو اس کی واقعیت صحیح طور پر طلب کرتی ہے۔ اپنی طرف سے نہ تو پیچیدہ کرکے

اسے دماغی کاوش کا جولانگاہ بناتے ہیں اور نہ کاٹ چھانٹ سے اس کو بے لطف ہونے دیتے ہیں ۔ بلکہ ایک ایسی حد کے اندر پلاٹ کو رکھتے ہیں کہ سادگی و اصلیت کے ساتھ قصہ کی صداقت کا پورا لطف قائم رہے ۔

پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں جس مزاج کا آدمی وہ اپنے افسانے میں لاتے ہیں اسکی افتاد طبیعت کا بالکل صحیح نقشہ رفتہ رفتہ آپکے سامنے پیش کر دیتے ہیں نفسیاتی اُمور پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے ۔ انکے افسانوں میں عورت، مرد، بوڑھے بچے، نیک نفس بدکردار عالم جاہل سب کو جگہ ملی ہے لیکن ہر ایک کی امتیازی خصوصیت آئینہ وار پیش نظر ہو جاتی ہے اور اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ اپنے الفاظ کو نہیں بلکہ واقعات کے نشیب و فراز کو اس خوبی سے کام میں لاتے ہیں کہ پوری طرح اس جوہر کو نمایاں کر دے ۔ آزمائشوں کی کسوٹی پر ہر کردار اتنا کسا جاتا ہے کہ اس کا اصلی رنگ صاف نظر آنے لگتا ہے ۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ عام طور پر وہ اپنے افسانے میں ان ہی لوگوں اور باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو کبھی انہوں نے دیکھا ہو ۔

پریم چند کے افسانوں میں مکالمہ نہایت مستم بالشان خصوصیت ہے ۔ یہ کبھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو آدمیوں کی گفتگو کتاب میں پڑھ رہے ہیں ۔ بلکہ اس انداز بیان سے یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہم پس پردہ خود لوگوں کی بات چیت اپنے کانوں سے سن رہے ہیں ۔ اور باتوں ہی باتوں میں ہر ایک کا کردار بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے واقعات بھی مختصر ہوتے جاتے ہیں اور جذبات کی تصویر بھی سامنے آتی جاتی ہے ۔

پریم چند کی زبان نہایت شائستہ اور رواں ہے ، سادگی اس کا جوہر ہے یوں تو فارسی و ہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب نکالنے کے لئے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں ۔ جو اردو

میں رائج نہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔
زبان کے لطف کو قائم رکھنے کے خیال میں انھوں نے عموماً دیہاتیوں کی بولی لکھنے سے احتراز کیا ہے۔ کبھی کبھی نئے تشبیہ و استعارے سے لطف اور زیادہ ہوجاتا ہے۔ مگر جہاں کہیں مزاح کا پہلو پیدا ہوجاتا ہے وہاں شگفتگی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ایک لطیف ہنسی کا موقع مل جاتا ہے۔

پریم چند اپنے افسانوں میں ہندو سوسائٹی کے رسوم، خصائل عقائد وغیرہ کا عموماً ذکر کیا کرتے ہیں۔ چونکہ ان چیزوں سے انکو فطری لگاؤ اور ذاتی واقفیت بخوبی ہے اس لئے نہایت شد و مد کے ساتھ ان کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں۔ علاوہ اور مقاصد کے پریم چند کا ایک مقصد ہندوؤں کی کھوئی ہوئی عظمت کا دوبارہ زندہ کرنا بھی ہے۔

وہ اپنے مختلف افسانوں میں ان کے اسلاف کے کارنامے بیان کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہوگئے۔ راجپوتوں کی شجاعت کا آپ اکثر ذکر پائیں گے۔ ایسے موقعوں پر بعض وقت حقیقت کے ساتھ شعریت بھی وہ اپنے افسانوں میں شامل کردیتے ہیں۔ اسی طرح پر دلچسپی اور جوش ضرور زیادہ ہوجاتا ہے لیکن اس انداز میں شعریت حقیقت پر غالب نظر آتی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سماج کا مطالعہ زیادہ گہرا اور سنجیدہ ہوجاتا ہے۔ ادب کے "ترقی پسند" مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کردیتے ہیں۔
ہندوستانی پس منظر کو قائم رکھتے ہوئے ان کے افسانوں اور ناولوں میں

ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے ۔ یہ تمام خصوصیات ان کے افسانہ "کفن" میں بہ یک وقت مرکوز ہو گئی ہیں ۔ لہذا اس کو ہم پریم چند کا شاہکار کہہ سکتے ہیں ۔ اور غالباً اسی لئے یہ اتنا پسند کیا گیا کہ دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ۔

پریم چند کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا ۔ حالانکہ موت قبل از وقت تھی لیکن اتنی قلیل مدت میں انھوں نے اتنے اچھے اور زیادہ افسانے و ناولیں دنیا کے سامنے پیش کر دیئے ہیں کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا ۔

سدرشن

پنڈت بدری ناتھ سدرشن اُردو کے ان چند کامیاب مختصر افسانہ نویسوں میں ہیں جو پریم چند کی طرح کامیابی کے ساتھ دنیائے افسانہ میں شہرت و ہر دل عزیزی حاصل کر رہے تھے ۔ اپنے افسانوں کی دلکشی اور طرز بیان کی خوبی کی وجہ سے عرصہ ہوا وہ قبول عام کا شرف حاصل کر کے خاموش ہو گئے ۔

سب سے پہلی چیز جو سدرشن کے افسانوں کو طلسم تاثیر بنا دیتی ہے، وہ روداد قصہ ہے ۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ہر قدم پر اشتیاق بڑھتا جاتا ہے کہ اب اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے اور یہ خصوصیت روداد کی پیچیدگی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ واقعہ یا ماجرا کا انتخاب اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ باوجود سادہ ہونے کے بھی دلوں پر ہر وقت ان کا قبضہ رہتا ہے

سدرشن کے افسانوں کی دوسری نمایاں خوبی سادگی ہے، زبان

میں بھی سادگی بیان میں بھی سادگی۔ اور خیال میں بھی سادگی، زبان کی سادگی کبھی خشکی کی وجہ سے بے کیف نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے عام فہم الفاظ کو اس حسن سے ترتیب دیتے ہیں کہ نرمی اور اس کے ساتھ تاثیر عبارت میں خودبخود آجاتی ہے۔ اسلوبِ بیان نہایت سیدھا اور سلیس ہے تشبیہات میں البتہ جدت ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تشبیہیں زیادہ تر ہندوستانی ہوتی ہیں۔

جذبات کے اثر کو الفاظ میں پوری طرح بیان کر دینا سدرشن کا ایک خاص کارنامہ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نفسیاتی امور سے خاص دلچسپی ہے۔ غمناک واقعات یا مناظر کو معمولی الفاظ سے دردناک بنا دیتے ہیں۔ شاید وہ کبھی بڑے اور ہیبتناک الفاظ ایسے موقع پر استعمال نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیرِ غم جگر کے پار نہیں ہوتا۔ بلکہ "نیم کش" ہو کر عرصۂ دراز تک دل میں چٹکیاں لیا کرتا ہے۔

سدرشن نے اپنے افسانوں کا سرچشمہ ایک ہی جگہ نہیں رکھا وہ کبھی دیہات کی زندگی اور واقعات بیان کرتے ہیں تو کبھی شہر والوں کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں عموماً غریبوں اور دولتمندوں کی زندگی کا موازنہ ان کے افسانوں کا ماحصل ہوتا ہے جہاں وہ دکھلاتے ہیں کہ امیروں کو باوجود دولت کے قناعت وسکون نصیب نہیں اور غریبوں کو افلاس کی حالت میں بھی طمانیت اور محبت کی لازوال دولت حاصل ہے۔

سدرشن کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے۔ ان کے افسانوں کے اکثر کردار ہماری زندگی کے افراد سے بالکل مطابق ہیں۔ خصوصاً اوسط درجہ کی سوسائٹی کے لوگوں کے کرداروں کو وہ بے حد فطری انداز میں پیش کرتے ہیں ان میں جابجا تبدیلیاں بھی نظر

آتی ہیں لیکن پڑھنے والا یہ نہیں محسوس کرتا کہ یہ تبدیلی بغیر کسی خاص وجہ کے پیدا ہو گئی۔

سجاد حیدر یلدرم

جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اردو میں دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ کرکے اس ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی فہرست میں سجاد حیدر کا نام زرّیں الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ترکی تخیل کو اردو کے پیرایہ میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی شان آ گئی ہے، ترکی طرز معاشرت و حسنِ ادا کو اردو کی دنیا میں مانوس ہونے کے لئے آپ نے اکثر اردو کی ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بیشتر مقامات پر ان کو ایسی اثر پذیر کامیابی ہوئی ہے کہ اس خدمت کو اردو ادب میں ایک اضافہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مگر کبھی کبھی اپنے لطیف جذبات کو بیان کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو سننے والے کو غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

ترکی ترجموں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سجاد حیدر صاحب یلدرم کے طبع زاد

افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی رومانیت جابجا نظر آنے لگی۔ آپ کے ترجموں میں وہ برجستگی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کی ذاتی تخئیل کا نتیجہ۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شاعری کا مزہ پیدا کر دیتا ہے۔ جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے اس نے افسانوں کو جنتِ نگاہ اور عبارت کو فردوسِ گوش بنا دیا ہے۔

سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے اور ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حسیات و جذباتِ انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی ان خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلاسفر کو دنیا کا خشک ترین انسان بنا دیتے ہیں۔ سجاد حیدر صاحب کے یہاں کبھی فطرتِ انسانی کا مطالعہ اس لطیف طرز پر ہوتا ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو کبھی کردارِ افسانہ سے وہ اٹکھیلیاں ہوتی ہیں کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے بدل جاتی ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" دنیائے اردو میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے۔ جس میں کچھ افسانے تو ترکی ادب سے آئے ہیں۔ اور کچھ انگریزی سے۔ لیکن زیادہ تعداد طبع زاد افسانوں کی ہے۔ طبع زاد افسانوں کی خوبیوں کے انبار میں ایک خرابی بھی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی "افسانہ" افسانہ ہو کر ہی رہ جاتا ہے۔ یعنی اصلیت اور واقعہ دونوں مشکوک نظر آتے ہیں۔ بہر حال "خیالستان" کے محاسن اتنے ہیں کہ زمیندار اخبار کی رائے ہے کہ "اردو زبان کی ادبیاتِ

سلیقہ میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں" اس مجموعے میں ان کی ایک ناول زہرہ ہے جو بہت مشہور و قابلِ قدر ہے۔ یہ ترکی قصہ کا آزاد ترجمہ ہے اور بہت عمدہ ہے۔

سلطان حیدر جوشؔ

سلطان حیدر صاحب جوشؔ عرصہ دراز سے دنیائے اردو میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا مقصد اعلیٰ ہندوستانیوں کو مغرب کی کورانہ تقلید سے بچانا ہے جس کے لئے موصوف نے حکیمانہ مضامین بھی لکھے، ناولیں بھی لکھیں اور مختصر افسانے بھی تصنیف کئے۔ لوگوں کو طنز سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ کبھی اکبر کی طرح مذاق میں سنجیدگی اور دور اندیشی کی دنیا سے روشناس کرانے کی فکر کی۔ بہر حال ہر وقت اور ہر صورت میں اپنا مقصد پیشِ نظر رکھا۔ اپنا تبلیغی مقصد ان کو اتنا عزیز ہے کہ افسانوں میں کبھی کبھی ناصحانہ اندازِ بیان پیدا ہو جاتا ہے یعنی بجائے اس کے کہ کردار کے حرکات و سکنات اقوال سے سبق آموز نتائج نکالے جائیں وہ خود ہی بیتاب ہو کر دنیا کے نشیب و فراز بیان کرنے لگتے ہیں ابتدائی دور میں افسانہ کی جو حالت تھی اس کے لحاظ سے وہ قابلِ قدر کہے جا سکتے ہیں مگر اب اردو میں افسانہ نویسی اتنی ترقی کر گئی ہے کہ "افسانۂ جوشؔ" اور "فکرِ جوشؔ" کو فن کی حیثیت سے کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

جوشؔ صاحب کے افسانوں میں کبھی کبھی ایسی تمہید ہوتی ہے جو ناولوں

ہی کے لئے موزوں تھی۔ مختصر افسانوں میں یہ لمبی چوڑی تمہیدیں مستحسن نہیں ہو سکتیں اتنا زیادہ حصہ افسانے کا نذرِ تمہید ہو جاتا ہے کہ اصل قصہ کی رفتار کو اتنا حصہ کبھی نہیں ملتا جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلی قصہ دلچسپ نہیں ہونے پاتا۔ اور ختم کر دیا جاتا ہے یعنی کبھی کبھی افسانہ کو شباب سے پہلے موت آجاتی ہے۔

زبان میں شگفتگی اور بیان میں کافی پختگی و روانی ہے۔ اسلوب بیان کو جوش صاحب اپنی ندرت پسند ادبیت سے دلکش بنانے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ محاورات و تشبیہات بھی نئی لاتے ہیں۔ غالباً زبان کو مالدار بنانے کی فکر رہتی ہے مگر اس جستجو میں کامیابی و ناکامیابی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اعظم کریوی

اعظم کریوی شاعر بھی تھے، اور افسانہ نگار بھی۔ ان کے پہلو میں ایک حساس دل تھا۔ اس لئے وہ زندگی کے نازک واقعات اور لطیف احساسات کا ایک نظر میں جائزہ لے سکتے تھے کوئی واقعہ جس میں اثر کا عنصر موجود ہے ان کے افسانہ کا موضوع بن سکتا ہے، اکثر سچے واقعات کو رنگین اور دلکش بنا کر افسانے کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ جن واقعات سے متاثر ہوتے ہیں انہی کو افسانہ بنا کر لکھ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھتے وقت ہم ایک حقیقی دنیا میں ہوتے ہیں۔

مقامی رنگ کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کرنے کا فخر اعظم کریوی کو حاصل ہے۔ پریم چند۔ علی عباس حسینی اور سدرشن نے بھی اسی راہ پر گامزنی کی ہے، لیکن جو دلکش طریقہ اعظم کریوی نے اختیار کیا وہ سب سے الگ ہے۔ وہ دیہاتی مناظر کے حسین نقشے۔ معاشرت کے طریقے۔ پنچایتوں اور بازاروں کی گفتگو کے مناظر، آپس کے تعلقات اور ان کا اثر، سب کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ تمام جزئیات سے واقف معلوم ہوتے ہیں لیکن انہی کو سامنے لاتے ہیں جو افسانے کو ایک خوبصورت تصویر بنا دیں۔ ان کے کردار عموماً نیچے طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں لیکن اعظم کریوی کو ان سے بڑی ہمدردی ہے۔ ہارڈی کی طرح انھوں نے بھی ان کی آپس کی بے تکلف گفتگو کے نقشے کھینچے ہیں جس میں صداقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ بوڑھوں کا طریقۂ تکلم، ان کی نقل و حرکت اپنے فطری انداز میں جلوہ گر ہے، عورتوں کی بات چیت، اور ان کے اشتعال، ان کی سیرت کی خصوصیتیں سب مکمل طور پر بیان ہوتی ہیں۔ اس سے اعظم کریوی کی قوت مشاہدہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

زمیندار اور رعایا کے تعلقات، حکام اور ان کا عام لوگوں سے برتاؤ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اعظم کریوی نے ان مظالم کا احساس کیا ہے جو غریب لوگوں پر ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات موجودہ رسم و رواج کے تار و پود بکھیر دینے کی کوشش کی ہے۔ انہیں دیہات کے معمولی لوگوں سے بہت محبت ہے اور وہ ان کی صحیح حالت دکھا کر لوگوں کو ان کی طرف سے ہمدردی رکھنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔

محبت ایک پاک مقدس جذبہ ہے اور ہر حال میں وہ کسی نیک

کام کی تلقین کرتا ہے۔ عشق کرنے والا ہمیشہ ایثار اور بنی نوع انسان کی ہمدردی سے معمور نظر آتا ہے۔ اور جب محبت ہلاکت کی جانب لے جاتی ہے اس وقت ان کے کردار محبت کی عظمت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ اور کوئی بھی گھبرا کر محبت کو برا بھلا نہیں کہتا۔

دیہات کے مناظر یوں ہی خوشنما ہوتے ہیں۔ لیکن اعظم کریوی کے قلم سے نکلنے کے بعد ان میں جان آتی ہے۔ کھیتوں اور دریا کی تصویریں برسات اور جھولے کے پُر لطف مناظر ان کے افسانوں کی رنگینی اور جاذبیت کو بہت بڑھا دیتے ہیں۔ واقعہ نگاری کے سلسلے میں خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ان کا قلم ایک ہی انداز میں چلتا ہے۔ وہ جذباتِ انسانی کے اچھے ترجمان ہیں اور اصلیت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ان کی زبان کا لوچ، مکالمے کا فطری انداز، جملوں کی شیرینی اور گھلاوٹ سارے افسانے میں ایک خاص گداز کی کیفیت ان کی کامیابی کا راز ہے دیہاتوں کی زبان لکھتے وقت انہی کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی دیہات میں ایک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش جو اعظم کے یہاں نظر آتی ہے اردو کے اور افسانہ نگاروں کے یہاں کم پائی جاتی ہے۔

اعظم کریوی عرصہ سے خاموش ہیں۔ اب نہ ان کے افسانے نظر آتے ہیں نہ کوئی اور تحریر۔ غالباً لکھنا پڑھنا بند کر چکے ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاری اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اکثر پہلے کے لکھنے والے خاموش رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔

ایڈیشن کے چھپتے چھپتے افسوس ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ جون ۱۹۵۵ء میں وہ کراچی میں قتل کردیئے گئے اس کا سبب اب تک نہیں معلوم ہوسکا۔

علی عباس حسینی

طبعزاد افسانے لکھنے والوں میں علی عباس حسینی ایک خاص انداز کے مالک ہیں، انھوں نے اپنے پلاٹ، کردار، اور طرز بیان کے ذریعے سے ایک انفرادیت اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ بقولِ پروفیسر رشید احمد ہندستان کے تمام مضمون نگاروں کا طرز بیان، مضمون کی ابتدا اور انتہا ایک ہی سی ہے لیکن اب اس کی عام کوشش ہورہی ہے کہ ہر شخص اپنا ایک مخصوص اسلوبِ بیان رکھے۔ حسینی صاحب کے یہاں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی سیرت نگاری ہے۔ ان کے کردار بعض خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور دہی قصہ کی ارتقائی منزلوں میں، قصہ کی تکمیل میں اور ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کردار کے سمجھنے اور سمجھانے میں نفسیات اور تحلیل نفسی کا جاننا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ علی عباس صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھ کر افسانہ کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں جگہ جگہ پر نفسیاتی صداقت کی کمی تھی

صرف اثر پیدا کرنا مدِ نظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے افسانوں میں یہ کمی دور ہو گئی اور تحریر کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری میں بھی پختگی آ گئی۔

حسینی صاحب کے یہاں ایک قصہ گو کی طرح تفصیلات کی بھرمار ہے وہ جزئی باتوں کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے۔ بعض اوقات معمولی باتوں کی تفصیل میں بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔ یہ تفصیل سیرت اور کردار کے سمجھنے میں مدد تو ضرور دیتی ہے لیکن کبھی کبھی بارِ خاطر ہو جاتی ہے۔ اسی جگہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اسی کے برعکس وہ بعض جگہوں پر اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایک مکمل نقشہ پیش کر دیتے ہیں

آج کل کے بہت سے افسانہ نویسوں کی طرح علی عباس حسینی بھی مقامی رنگ کے دل دادہ ہیں انہیں دیہات کی فضاؤں میں سکون ملتا ہے اور وہیں کے لوگ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ وہیں کے رسوم و رواج اور اخلاق پر وہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک خاص انہماک کے ساتھ انہی مناظر میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ دیہات کی زندگی پر وہ مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالتے ہیں، کھیت اور فصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن ان سے افسانے کی دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

علی عباس کے افسانوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہوتے ہیں اور اصلاحِ معاشرت کا کوئی پہلو ایک ہلکے رنگ کی طرح پورے افسانے پر چھایا ہوتا ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ مقصد اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ محبت کو وہ ایک پاک، مقدس جذبہ سمجھ کر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر جگہ اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظرافت اور مزاحِ لطیف کی چاشنی نے طرزِ تحریر کو بے حد شگفتہ بنا دیا ہے۔ یوں تو ان کے یہاں ہر جگہ ایک درد کی کسک اور تڑپ نظر آتی ہے لیکن یہ ہلکا سا مزاح اسے نطری بنا دیتا ہے۔

زبان کی سادگی اور روانی افسانے کے لئے بے حد ضروری ہے حسینی صاحب با محاورہ اور عام فہم زبان میں فلسفہ اور نفسیات کے مشکل مسائل حل کر دیتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب، تشبیہ اور استعاروں کی مدد سے عبارت میں بے انتہا اثر اور گداز پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے فارسی اور عربی کے نامانوس الفاظ سے کنارہ کشی کر کے ہندی کے خوبصورت اور سادے الفاظ پسند کئے ہیں لیکن دبی زبان سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کوشش میں اکثر انہوں نے ہندی کے نامانوس الفاظ سے کام لیا ہے جس کی جگہ پر مروجہ اردو کے الفاظ بہ آسانی استعمال کئے جا سکتے تھے۔

آپ کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے کا عنوان "آئی سی۔ ایس" اور دوسرے افسانے۔ دوسرے کا "باسی پھول" اور دوسرے افسانے۔ اور تیسرے کا نام "کچھ ہنسی نہیں ہے"۔

حسینی صاحب کے کردار عموماً متوسط طبقہ سے آتے ہیں اور اسی طبقہ کے رسوم و عادات و حالات کو وہ اپنے خیالات کا مخزن بنائے ہوئے ہیں۔ سرکاری ملازمت سے پنشن لینے کے بعد اب وہ ہمہ تن افسانہ نویسی میں مصروف ہیں۔

مجنوںؔ

مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر اپنا الگ رنگ قائم کر لینے والوں میں مجنوں کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے وہ انگریزی افسانہ نگار ہارڈی سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں جس کا انکو خود اعتراف ہے ان کے پیش نظر زندگی کے بہت سے وہ راز ہیں جنکا انکشاف اب تک نہ ہو سکا خیر و شر کا تصادم جبر و اختیار کے حدود زندگی اور موت یہی وہ سوالات ہیں جن کے جواب کی جستجو نے انھیں ایسی چیزیں لکھنے پر مجبور کیا۔ جو عام لوگوں کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی نگاہیں ایسے ہی واقعات کا انتخاب کرتی ہیں جہاں حیات کی کش مکش کوئی دلدوز تمثیل پیش کر رہی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار اپنی مظلومیت کی وجہ سے ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے دنیا اور اس کی تمام دلچسپیاں کوئی دلکشی نہیں رکھتیں۔ ان کا غم و الم ان کی تکلیف اور ایذا فضا کو غمناک بنا دیتی ہے اور دنیا سے بیزار ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرتے ہیں جو عبرت نہیں پیدا کرتی بلکہ موجودہ نظامِ تمدن سے بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مجنوں کی ذہنیت انقلاب پسندی کے جراثیم سے پُر ہے۔ وہ تہذیب کی موجودہ روشن میں نجات کی راہ نہیں دیکھتے۔ ان کا ہر کردار کسی ایسی دنیا کی تلاش میں مصروف نظر آتا ہے جہاں امن و سکون ہو اور اسی جستجو میں وہ ہلاکت کے دروازہ پر پہنچ جاتا ہے۔ عام زندگی اور نظامِ معاشرت میں تصادم ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس کا شکار مجنوں کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے

اور ان کے افسانے میں ایک مظلوم کی شکل میں پیش ہوتا ہے، اخلاق ومحبت
کے وہ نازک مسائل جن کو چھیڑنا لوگ مناسب نہیں سمجھتے مجنوں کے خاص
موضوع ہیں۔ ان کا ہر افسانہ محبت کے جذبات سے لبریز ہے۔ بعض اوقات
محبت کی شدت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں
محبت کرنے والا کسی اور کام کا نہیں رہتا، وہ محبت کے لطیف سے لطیف
جذبے کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔ عورت خاموش محبت کرتی ہے۔ اور یہاں
تک ضبط سے کام لیتی ہے کہ اس کا انجام دیکھا نہیں جاتا۔ مجنوں کے
قصوں کا خاتمہ عموماً المیہ ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ تیکھاپن
اور وہ تلخی جو روح شکن ہو رہی تھی کم ہو جائے۔ لیکن پھر بھی وہ نرمی اور
گھلاوٹ نہیں آنے پاتی جس سے اس قدر شدید قنوطیت کی تلافی ہو سکے

منظر نگاری بہت کم ہے۔ لیکن جہاں کہیں ہے دلچسپ ہے مجنوں
نے کبھی کبھی مزاحِ لطیف کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن اس یاس انگیز فضا
میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کسی روتے ہوئے شخص کو گدگدا کر ہنسا دیا
جائے۔

مجنوں نے اپنے افسانوں کے لئے ایک مخصوص طرزِ تحریر بنا لیا ہے جس
میں اثر کا عنصر زیادہ موجود ہے۔ برجستہ اشعار بلکہ وہ اثر بیحد بڑھا دیتے ہیں ان
کے کردار آپس میں بہت کم ملتے ہیں لہٰذا وہ خود اُن کے خیال کی ترجمانی کرتے
ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں جذبات نگاری پر کافی قدرت حاصل ہو گئی ہے
وہ محسوساتِ قلب کو نہایت صاف اور سادہ الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں
زبان رواں ہے۔ لیکن افسانہ اس سے بھی زیادہ رواں ہوتا ہے۔ وہ جذبات
کی ترقی کرتے وقت زبان کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ قصہ کو دلچسپ اور رواں بنانے کیلئے زبان کی

بندشوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں انکے افسانوں کے دو مجموعے "خواب و خیال" اور "سمن پوش" شائع ہو چکے ہیں جو بہت اچھی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

مجنوں کے ادبی کارنامہ کا ایک دوسرا پہلو بھی نہایت درخشاں ہے۔ تنقید نگاری میں آپ خاص شہرت کے مالک ہیں۔ نفسیاتی تحلیل کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافت اور ذہنی ارتقا پر روشنی ڈالنا آپ کا خاص حصہ ہے مستقبل کی تاریخ غالباً مجنوں کو افسانہ نگار سے زیادہ تنقید نگار کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔ مغربی تنقید سے انھوں نے اُردو کے دامن کو بہت کافی مالامال کیا ہے۔ لیکن طرزِ ادا کا اچھوتا پن اور اُردو کے ماحول کا خیال کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی تنقیدات ہمیشہ پُر مغز، ذہنی اور مرکزی نکات کو بے نقاب کر دیتی ہیں اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجنوں کے ساتھ اُردو فنِ تنقید ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے۔

"ادب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشئے" ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ جن کے پڑھنے کے بعد آدمی ان کی اِس خصوصیت کی جانب اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس شاعر یا جس مصنف کی بابت وہ لکھتے ہیں اسے اپنا ہیرو بنا لیتے ہیں اور اس کی انتہائی تعریف کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ مجنوں نے اب لکھنا بہت کم کر دیا ہے اگر کچھ لکھتے ہیں تو تنقیدی مضامین۔ آج کل (۵۵ئہ) وہ اپنے وطن گورکھپور کے "سنٹ انڈ ریوز کالج" میں پروفیسر ہیں۔

جلیل قدوائی

اپنے روبرو اچھے افسانوں کی مثال رکھنے کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ غیر ممالک کے مشہور افسانہ نویسوں سے استفادہ کریں۔ اور پھر اسی روشنی میں اپنی افسانہ نگاری کو بھی فنّی حیثیت سے مسلم بنالیں جلیل قدوائی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے روسی معجز نگار چیخوف کو اپنا رہنما بنایا۔ اس کے افسانوں کے ترجمے کئے اور پھر جب خود طبعزاد افسانے لکھنے بیٹھے تو چیخوف کا اتنا اثر قبول کر چکے تھے کہ اس رنگ سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ وہی سیرت طرازی اور جذبات ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

جلیل دنیا کو ایک بہتا ہوا سمندر سمجھتے ہیں جس کے ہر حصے میں لہریں ہی لہریں ہیں اور ہر لہر زندگی کا کوئی رُخ پیش کر سکتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے ہزارہا نقوش میں سے وہ کوئی ایک نقش لے کر ایک افسانہ مکمل کر لیتے ہیں اور در حقیقت افسانہ کے لئے یہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ کہ اس کی مدت زیادہ نہ ہو۔ جلیل نے عام افسانہ نویسوں کی طرح صرف عشق و محبت ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ حیاتِ انسانی کے ہر رخ پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور جس جگہ وہ زندگی کے معمہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہی ان کا افسانہ ہوتا ہے۔ نہایت پُرخلوص طور پر وہ خود سمجھ کر دنیا کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

جلیل کے افسانوں کے کردار ہمارے سامنے اس طرح آتے ہیں کہ

ہم ان میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے بارہا مل چکے ہیں جلیل ان میں خود شریک ہو کر اثر انگیزی کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ہر کردار کی سیرت کی خوبیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں جیسے خود اُن پر گزر رہی ہے۔ جذبات نگاری افسانوں کی جان ہوتی ہے۔ جلیل کے یہاں اس کی کمی نہیں۔

البتہ افسانے بعض اوقات اس قدر تلخ اور سخت ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن جلیل کے یہاں دردناک افسانوں میں حوادث کا تذکرہ اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے قابو ہو جائے۔ ایک طرح کی نرمی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے جس میں سوز و گداز اور اثر پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔

جلیل کے افسانے منظر نگاری سے بھی خالی نہیں ہیں۔ منظر نگاری کے پوری رنگینی اور آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی بلکہ قریب قریب پچھلے لکھنے والوں کے نقش قدم پر گامزنی کی ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے جلیل کے اکثر افسانے ترجمہ ہوتے ہیں۔ ترجمہ میں اصل افسانہ کی خوبیوں کا برقرار رکھنا ایک مشکل بات ہے۔ لیکن جلیل اس وادی سے کبھی نہایت کامیابی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ بعض اوقات عبارت کے زور اور روانی میں کمی نظر آتی ہے، طرز ادا غیر مانوس ہو جاتا ہے۔ لیکن بیشتر اصلی زبان کا لطف موجود ہے۔ روانی اور عبارت کے زور میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی ترجمہ کرتے کرتے جلیل نے اپنے لئے خود ایک مخصوص طرز تحریر بنا لیا۔ جو طبعزاد ہونے

کے باوجود افسانوں کو ترجمہ کی شکل دے دیتی ہے۔

جلیل کی زبان سلیس اور صاف ہے۔ وہ عبارت آرائی اور مشکل الفاظ سے مضمون کو بیکار نہیں بناتے بلکہ ایک فطری انداز میں ہر گتھی کو سلجھاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ طرز بیان کی شگفتگی مفہوم کو آسان اور زود اثر بنانے میں بہت معاون ہوتی ہے۔

جلیل قدوائی نے جب سے سرکاری ملازمت کی ہے ان کے ادبی ذوق میں کمی آگئی ہے۔ گو وہ اب بھی لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ مگر اس سلسلہ سے پہلے جہاں تک وہ پہنچ چکے تھے اس میں اب ترقی نہیں نظر آتی۔ جلیل شاعر بھی ہیں۔ حسرت کے رنگ میں اشعار کہتے ہیں جس کا شاہد ان کا مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" ہے۔

اختر رائے پوری

اختر رائے پوری ملک کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے مغرب کی فن کاری کو بڑی کامیابی سے اردو ہندی ادبیات میں منتقل کیا اور اردو میں افسانہ نگاری کے معیار کو بلند کر کے ہمارے ادب میں بعض قابل قدر خوبیوں کا اضافہ کیا۔

اختر صاحب کے آرٹ میں موجود نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کو محسوس کرانے کے لئے پرزور اور باثر انداز بیان موجود ہے۔ ان کی نظریں

بیماروں، بیکسوں، فقیروں اور ہراس چیز پر پڑتی ہیں جن کو آپ ہمارے سماج کا ناسور سمجھ سکتے ہیں، وہ ان مقامات کو بڑی پُرکاری کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں بیان میں ایک خاص متانت و دلکشی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ضبط و اثر اور اختصار و معنی آفرینی خاص طور پکار فرما ہوتی ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمیں ان کی ذہنی باریک بینی اور ان کے جذبات و خیالات کے مخصوص تیور کا احساس ہوتا ہے۔

ایک خاص بات جو ان کو رومانی قسم کے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام ادیبوں اور شعراء کی طرح ہماری روح میں تسکین اور خواب کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بےچین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں جس سے ہمارے دلوں میں موجودہ نظام کی خرابیوں کا صحیح احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی مفکرانہ طرزِ تخئیل افسانہ پڑھنے والوں کو خاص طور پر متاثر و مرعوب کرتی ہے۔ جس کے سبب سے بعض وقت روانی کا فقدان معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "محبت اور نفرت" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات افسانوں کی طرزِ نگارش مضمون اور مقالہ نگاری سے متصل ہو جاتی ہے اور ان کے افسانے اصولِ افسانہ نگاری سے ذرا بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن موقع و محل کا خیال کرکے، اس وجہ سے عبارت میں دلکشی مجروح نہیں ہونے پاتی۔

اختر صاحب اپنے پڑھنے والے کو ایک ایسی منزل پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے امید یا ناامیدی کا کوئی راستہ نہیں نکلتا بلکہ ایک عجیب قسم کی کشمکش ذہن کو محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے محبت اور نفرت کو علیحدہ حیثیتیں دی ہیں اور ان کو علیحدہ حد پر اپنے آرٹ میں شامل کیا ہے۔ جو بجائے خود ایک کمزوری ہے۔

ایک اعلیٰ فن کار کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں انسانی جذبات کو ایک ساتھ پیش کرے۔ اگر کوئی ادب ہمارے دلوں میں صرف محبت یا صرف نفرت کے رجحانات پیدا کرتا ہے تو یقیناً یہ فن کے لحاظ سے ایک نقص ہے۔

اخترمائے پوری اپنی تنقیدوں سے اردو ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل وہ کراچی یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

کرشن چندر

مغربی طرزِ تنقید کی بنا پر ہندوستان کے بھی فنِ تنقید نے دو اسکول مصنفین کے قائم کر دیئے ہیں۔ ایک ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند، لیکن یہ تقسیم کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ کسی مصنف کو قطعی رجعت پسند یا ترقی پسند کہنا آسان نہیں کیونکہ خود یہ دونوں قسمیں اپنی جگہوں پر اتنی الگ نہیں ہیں کہ اطمینان کے ساتھ کسی تخصیص کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دونوں کی حدیں ابھی ملتی جلتی ہیں، پھر ممکن ہے کہ مغرب میں کسی طرح سے حدِ فاصل قائم بھی ہو سکے مگر ہندوستان میں ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، مغرب میں سرمایہ داری، شہنشاہیت یا اشتراکیت کا پہلو اختیار کر چکی ہے۔ حقیقت میں ابھی ہندوستان نے سماجی یا معاشی حالات کی بنا پر کوئی مخصوص اور مستقل حدِ فاصل نہیں قائم کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دقتیں ہیں جن کو دیکھتے ہوئے رجعت پسند یا ترقی پسند قطعی طور پر کسی کو کہنا آسان نہیں۔ لیکن چند ظاہری خصوصیات کی بنا پر ہم کرشن چندر کو ترقی پسند

مصنفین کی صف میں پاتے ہیں۔

ان کا فن مجموعی حیثیت سے پُراثر اور دیرپا ہے جو ان کے تمام افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظرِ قدرت کے مقامی رنگ ربو سے وہ عموماً اپنے افسانوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانے پڑھنے والوں کو چاہے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے کاروباری مناظر میں دلکشی پیدا کر دیں یا دیہات کی اونچی نیچی زمین، دریا یا جنگل کے مناظر سے دل بہلا دیں مگر بالآخر دنیا کی تلخ حقیقتوں سے دوچار کرا دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال "گل فروش" ہے۔ ان کا نظریہ عام نوجوان شعراء و ادباء کی طرح صرف مزدوروں ہی تک محدود نہیں رہ جاتا وہ متوسط درجہ کی الناک زندگی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

کرشن چندر حقیقت پسند اور زبردست حقیقت پسند ہیں۔ اگر وہ تنگ و تاریک گلیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تیرہ و تار مناظر سے نکال کر روشنی اور کشادہ سڑکوں کی بھی سیر کرا دیتے ہیں۔ اب یہ پڑھنے والے کی صلاحیت پر ہے کہ وہ نبض شناسی سے کام لے اور مصنف کی حقیقی ہمدردی کا اندازہ کرے۔ وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیوں کر سنوارنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں ان کا افسانہ "زندگی کی موڑ پر" بہت خوب ہے۔ وہ عام نوجوان ادیبوں کی طرح موجودہ سماج کی کاروباری زندگی کے بے تکے پن پر شدید حملہ کرتے ہیں اور ایک برتر و بہتر مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن شدتِ احساس سے کبھی کبھی جذباتی طور پر چیخ اٹھتے ہیں جو بعض لحاظ سے نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں، رومان

وحقیقت کا ایک دلکش امتزاج مطالعہ کی باریکی اور فراوانی موجودہ سماج اور نظامِ معاشی سے انتہائی اور دلی نفرت کا جذبہ، طنز اور مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش، دلکش رمز یہ نگاری اور انسانی نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔

کرشن چندر موجودہ افسانہ نویسی میں ہر افسانہ لکھنے والے سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو کی اس صنف کو جس خوبصورتی اور فنی کمالات سے انھوں نے آگے بڑھایا ہے وہ زبان و بیان کے لحاظ سے پریم چند کے کارناموں پر اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

ان کے افسانوں کے مجموعے متعدد ہیں۔ لیکن وہ مجموعے جن کے افسانے کرشن چندر کے ذہنی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں حسب ذیل ہیں "زندگی کے موڑ پر" "ٹوٹے ہوئے تارے"۔ ان افسانوں میں رومانی طرزِ تخیل و اندازِ بیان کا مظاہرہ ہے۔

دوسرا دور جب اشتراکیت سے وہ قریب تر ہو گئے ہیں اس وقت کے افسانوں کے مجموعے میں نظارے خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ تیسرا دور تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں ان کا بہترین شہ کار "ہم وحشی ہیں" ہے۔ اس کے بعد کئی ایک مجموعے افسانوں کے وہ ادب کو دے چکے ہیں جو نہایت قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

ان کی شوخیٔ تحریر سے ایک دنیا نقشِ فریادی ہے۔ ان کے کرداروں کا پیرہن کاغذی نہیں بلکہ گوشت پوست کا ہے، وہ فرضی نہیں حقیقی ہیں ہماری طرح انسان و دنیادار ہیں۔ سماج کی خودغرضی اور نظامِ حکومت کی ابتری نے ان کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے جسم بیچنے پر مجبور ہیں اور اپنی انسانیت و خودداری کو دوسروں کی تفریح و ہوس کے لئے ذلیل کرکے پیش کریں۔ یہ طبقہ ہمیشہ سے موجود تھا۔ لوٹنے والے اور لٹنے والے تاریخ کے ہر دور میں یہاں بستے تھے۔ چنانچہ آج بھی ہیں مگر لٹنے والوں کی خستہ حالی اور مجبوری پر کسی نے اقتصادی زاویۂ نگاہ اور معاشرتی ارتقار کے خیال سے نظر نہ ڈالی بھیانک اور گندی دنیا سمجھ کر، گناہوں کا مجسمہ تصور کرکے اربابِ حل وعقد نے ہمیشہ اس طبقہ سے چشم پوشی بہتر سمجھی۔ حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں اس طبقہ کو کبھی غیر ضروری کبھی نہیں سوچا گیا۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی لوگوں کے پوست کندہ حالات پیش کئے ہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف ناقابلِ برداشت مصائب کا ذکر کیا ہے۔ ان کی گندی طرزِ معاشرت اور ذلیل ماحول پیش کیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ان کا منشا اس گناہگار و بدنام طبقہ کی زندگی کو دکھا کر غالباً زمانہ کو یہ سمجھانا تھا کہ اس دیار کے رہنے والے بے بس ہیں اور اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ دنیا نے ان کو اس گڑھے

میں ڈھکیل دیا ہے۔

طوائفوں یا اسی طبقہ کے دوسرے کرداروں کو وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی ان ہی لوگوں میں گزری ہو۔ جنسی کیفیت اور نفسیاتی خواہشات کے مظاہرے بڑی تفصیل و بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان تفصیلات میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے پیشِ نظر اصلاح نہیں بلکہ لطف اندوزی ہے۔ ایسے ہی مقامات پر ابتذال و تکلیف دہ شوخی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کسی لحاظ سے قابل برداشت نہیں۔

منٹو کے دل و دماغ پر جنسیات کا غلبہ ہے وہ بہت کچھ فرائڈ کے فلسفہ سے متاثر ہیں اور دنیا کو یا کم سے کم ایک خاص طبقہ کو نفسیاتی خواہشات کا شکار پاتے ہیں مگر نہ اصلاح کا کوئی طریقہ بتاتے ہیں اور نہ ابتری کو مکروہات کے سمجھنے کا موقع دیتے ہیں بلکہ ذہن کو مشتعل و گمراہ کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنفر کے بجائے ایک لذت انگیز الجھن پیدا کر دیتے ہیں جو اس مقصد کے برعکس ہے۔ جو ہم نے اوپر کی سطروں میں بیان کیا ہے۔ ان کی طرزِ تخئیل پہ جنسی غلبہ ہے ایسے ہی افسانہ نویسوں کے لئے غالباً اقبالؔ نے کہا تھا۔

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار۔

منٹو کی بے باکی اور عریانیت کو دیکھ کر ایک زمانے کو خیال ہوا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے تحت ہیں یہ معرکہ سر کر رہے ہیں مگر یہ سراسر غلط فہمی تھی۔ ترقی پسند تحریک کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ یہ ان کا ذاتی فعل ہے اور ان کی ذہنی اپج کا نمونہ ہے۔ ترقی پسند تحریک ادب کو حیات سے قریب تر کرنا چاہتی ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے۔ وہ بھی معاشرت کے صحت مند اجزا

میں تبدیل ہو سکیں وہ طوائف یا اس قبیل کے دوسرے کرداروں کو تعیش اور ذہنی اشتعال کے لئے نہیں قلم بند کرتی اس کا منشا گرے ہوئے طبقہ کو ابھارنے کا ہے۔ منٹو کے یہاں یہ مقصد ہم کو بہت کم ملتا ہے۔

منٹو کے اسلوب بیان میں روانی کافی ہے۔ سادگی بہت ہے مگر عمق بالکل نہیں۔ موضوع میں تنوع بھی کم ہے۔ ایک ہی طرح کی بات زیادہ تر کہتے ہیں البتہ نفسیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ متحرک کرنے والے جذبات یا متحرک ہو جانے والے اثرات کو بڑی اچھی طرح پیش کرتے ہیں نفسیاتی خواہشات کے دام میں پھنسنے اور پھنسانے والوں کی ذہنیت کی ترجمانی پر وہ پوری طرح قادر ہیں۔ ان کی زندگی کا نقشہ اور ان کی گلی کا خاکہ پوری وضاحت کے ساتھ اثر پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں منٹو کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان میں ہوا۔

مزاحیہ افسانے

گزشتہ صفحات میں اکثر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض اہل قلم نے افسانوں اور مضامین کو اپنے اصلاحی مقاصد کا آلہ کار بنا دیا۔ انھوں نے وہ عبرت انگیز داستانیں پیش کیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے سبق آموز ہوں، جن کا دردناک اثر ہماری کمزوریوں اور برائیوں کی یاد دلاتا ہے۔ موجودہ باب میں ان اربابِ قلم کا تذکرہ ہوگا جن کے یہاں اصلاح کا زاویۂ نظر بالکل تبدیل ہوگیا ہے۔

اودھ پنچ اور اس کے مضامین لکھنے والوں نے اکثر سیاسی، تمدنی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کا مذاق اڑایا۔ خود ہنسے اور دوسروں کو ہنساتے رہے لیکن اس ہنسی ہی ہنسی میں وہ کام کی باتیں بھی بتا جاتے تھے۔ جب اردو ادب میں مزاح نگاری کا رواج ہوگیا تو انہیں لوگوں نے ناول اور

مضامین کی طرف توجہ کی اور ایک تفریحی سرمایۂ ادب اپنے بعد چھوڑتے گئے۔ اودھ پنچ کے شائع ہونے سے ملک میں ظرافت نگاری کا ایک رواج سا ہوگیا۔ اور کچھ لوگوں نے اس میدان میں بھی قدم بڑھائے۔ لیکن ان سب میں ایک مخصوص رنگ کی جھلک تھی۔

مغربی علوم کے اثرات سے ظرافت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس میں طنز اور مزاحِ لطیف کا رواج ہوا۔ افسانے اور مضامین اکثر پلاٹ کے ذریعہ سے خندہ آفریں بنائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی صرف زبان اور الفاظ کی دلکشی سے، یہ ضرور ہوا کہ بہت سے لکھنے والوں نے صرف ہنسانے کو اپنا مقصد سمجھ کر ادب اور زبان پر چھری چلا دی۔ ان کے یہاں نہ صرف مزاح مفقود ہے بلکہ ہنسی ان کی ہنسانے کی ناکام کوششوں پر آتی ہے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد مزاح نگاری میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی ادبیات کے اثر سے مزاح کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ لکھنے والوں میں کسی نے سیرت نگاری کا کمال دکھا کر وہ کردار پیدا کئے جو ہمیں سبق دے جائیں۔ کسی نے اپنے اسلوب بیان اور زبان کی لطافتوں سے ہنسا کر اپنا کام نکالا۔ کسی نے پلاٹ میں وہ واقعات بیان کئے جو ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیں۔ اس طرح مزاحِ لطیف کا عام رواج ہوگیا جس نے ادبِ اردو میں ایک گراں بہا اضافہ کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جس کے بغیر ہمارے یہاں رجائیت اور مزاح کی کمی تھی۔

فرحت اللہ بیگ

ہنسنے اور ہنسانے کا کوئی اصول مقرر نہیں ہو سکتا۔ تمام مزاح نگار اپنا
انداز جداگانہ رکھتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ (آغا فرحت یا مرزا الم نشرح)
کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے۔ جسے عظمت اللہ بیگ نے ''خوش مذاقی''
کہہ کر یاد کیا ہے۔ خوش مذاقی یا مزاحِ لطیف میں قہقہہ کا موقع کم ملتا ہے
ہاں تبسم کے مواقع بہت ملتے رہتے ہیں۔ ان سب سے زیادہ ان کے یہاں
ایک طرح کا انبساط حاصل ہوتا ہے جو دیرپا کہا جاسکتا ہے۔ مرزا صاحب
کی علمی اور ادبی رنگ کی شوخی سے انھیں مزاح نگاروں میں ایک خاص جگہ
حاصل ہے۔ خالص مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے ادبی مباحث
پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی شوخی نے وہاں بھی گل
کھلائے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے یہاں سوقیانہ پن نام کو بھی نہیں ہے۔
ان کے مضامین پڑھتے وقت ایک طرح کی دماغی ورزش ہو جاتی ہے جس
کے بعد فرحت حاصل ہوتی ہے۔

مولانا نذیر احمد کی طرح قوتِ بیان کافی موجود ہے۔ تفصیلات سے
مضمون بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی لطیف اور پُر معنی تحریر
تفصیل کے موقع پر بھی اپنی لطافت کا ساتھ نہیں چھوڑتی انکی لطیفہ پسند طبیعت انکی رنگین بیانی
مضمون کے بیچ میں وہ واقعات لاتی ہے۔ جو لطف پیدا کرنے کے ساتھ مفہوم

کو واضح بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ کبھی کبھی خفیف سا طنز بھی نظر آتا ہے۔ جو سمجھنے والوں کے لئے کافی اثر رکھتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دلچسپی کے کئی سامان ہیں۔ ان کی مزاح نگاری سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی دلّی کی زبان اور محاورات کا کیف باقی رہ جاتا ہے۔ وہ اکثر ایسے الفاظ اور محاورے اپنی عبارت میں لاتے ہیں جو دلّی کے لوگ صرف گفتگو میں استعمال کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب انہی سے بلا تکلف اپنے مضمون کو سجاتے ہیں اور توازن میں کوئی فرق نہیں ہونے پاتا بلکہ مکالمہ کا پورا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ روانی۔ الفاظ کی خوبصورت نشست، مضمون اور خیال کا دست و گریباں ہونا، فرحت اللہ بیگ کی خصوصیات ہیں۔ پڑھنے والا ان کے مضمون سے کبھی اکتا نہیں سکتا۔

رشید احمد صدیقی

رشید احمد جون پور کے ایک دیہات مڑیا کے رہنے والے ہیں ۱۸۹۲ء سال ولادت ہے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آئے مگر تعلیم جاری رکھنے کے لئے ان کو تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا اس لئے کہ مالی مشکلات پناہ نہیں لینے دیتی تھیں۔ علی گڑھ سے انہوں نے ام۔ اے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ملازم بھی ہو گئے۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانہ ہی سے

اپنی انشاپردازی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ ان کی مخصوص انشا پردازی ان کی انفرادیت کی ضامن ہوگئی تھی۔

وہ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں اُردو ادب کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو محض ادیب بناتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے زیادہ ادب کی خدمت کرنے کا خیال رکھ کر خود بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں، رشید احمد صدیقی آخر الذکر طبقہ میں ایک ممتاز اور بلند مقام پر ہیں۔

طنز ایک مشکل صنفِ ادب ہے۔ ذرا سی لغزش بھی مضمون کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ رشید احمد طنز کے واحد لکھنے والے ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ سب سے جداگانہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔ رمز و کنایہ میں تنقید کے دشوار و گزار مراحل کو طے کر لینا رشید احمد کا کام ہے۔ ان کے ذاتی جذبات اور احساسات جو کسی واقعہ کے متعلق ہوتے ہیں ایک طنزیاتی انداز میں اس طرح ظاہر کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا۔ وہ کانٹوں کی طرح دامن سے اُلجھ کر اپنا اثر پیدا کر ہی لیتے ہیں۔

رشید احمد کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ ہر قدم پر وہ واقعات کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں۔ صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو تاریخ و سیاسیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ایک بات کہہ کر گزر جاتے ہیں اور ذہن اس کے اجزا کو جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ان کے خیالات کی دوررسی، گہرائی اور نزاکت عام مذاق سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ رشید احمد کے یہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کی مثالیں ان کے مضامین کی جان ہیں۔ وہ "ادھر کا کھیت" ہی کیوں نہ ہو لیکن

وہ اس کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے دوش بدوش دکھا سکتے ہیں۔ طائر خیال کی یہ پرواز مثال کے موقع پر وہ چیزیں لاتی ہے جن سے ذہن کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

ان کی زبان مشکل عربی و فارسی الفاظ سے نقش و نگار حاصل کرتی ہے ان کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے لیکن ایک طرح کی روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ شگفتگی، مضمون کے ہر حصہ میں نظر آتی ہے۔ فلسفیانہ مباحث بھی اسی شگفتہ اندوزی میں بیان ہو جاتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ رشید احمد صاحب ہمیں بہت کم اپنے مضامین سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ عرصہ سے وہ خاموش ہیں۔ ہم منتظر ہیں کہ وہ پھر جلد ہی کچھ کہتے ہوئے نظر آئیں۔ "مضامین رشید" اور "خنداں" ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ادھر ایک مجموعہ "خنداں" کے نام سے بھی شائع کر چکے ہیں ان میں رشید احمد صاحب نے بعض اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اور اپنے طرز تحریر کے زور سے انھیں اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ موضوع غیر دلچسپ ہوتے کے باوجود عبارت میں وہ شگفتگی اور جان ہے کہ جی بالکل نہیں گھبراتا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے ان کی بعض ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہوا ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔

پطرس

انگریزی ادب کے ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے ملک اور زبان سے بھی دلچسپی ہے۔ مغربی ادبیات سے پوری طرح مستفید ہونے کے سبب سے آپ نے اپنے مضامین میں ان تمام لطافتوں کا اظہار کیا ہے جو ہمیں مغرب میں نظر آتی ہیں۔ پطرس نے اردو مزاح نگاری کو ایک ایسے راستے پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں فطری انداز موجود ہے۔ وہ ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کا تسلسل اور کرداروں کے حرکات وسکنات فطری طور پر اس طرح دکھاتے ہیں کہ خواہ مخواہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے انکے افسانوں کا مقصد محض ہنسنا و ہنسانا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے ذریعہ سے وہ اصلاح کا کوئی نکتہ مدِ نظر رکھتے ہوئے علمی اور ادبی خدمات کرنا چاہتے ہیں۔

پطرس کو اس کا احساس بخوبی ہے کہ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں اس لئے وہ کسی کی کمزوری پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ نہایت بے باکی اور زندہ دلی سے اس کمزوری کا اظہار کرکے ایک ہمدردانہ لہجہ میں واقعات کے نشیب وفراز کا لطف اٹھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پڑھنے والوں کی ہنسی میں محبت اور ہمدردی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔

پطرس نے کردار نگاری اور سیرت طرازی میں ایک ماہر نفسیات کا کمال دکھایا ہے۔ ان کے کردار اپنے فطری انداز میں سب کچھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی کہ ان کی حرکتوں کا اثر دوسروں پر کیا پڑ رہا ہے۔ پطرس کا مشاہدہ بہت خوب ہے۔ وہ سیرتِ انسانی اور اس کی جزئی باتوں کو بھی غور سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو کیا کیا کرتا رہتا ہے۔ انھیں یہ بھی خبر ہے کہ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں کیا انداز پیدا ہوتے ہیں۔ حرکات و سکنات، رفتار و گفتار ہر ایک بات کے بیان میں نفسیاتی مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مضامین پڑھتے وقت ہم ان باتوں پر بھی ہنس لیتے ہیں جو ہم میں خود موجود ہیں۔ لیکن اس وقت ہم نے انھیں کبھی غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ پطرس کے کردار ارتقا کے اصول کی پابندی پر کاربند نظر آتے ہیں۔

پطرس نہایت ذکی الحس اور ذہین صاحبِ قلم ہیں۔ ان کا پلاٹ کوئی گورکھ دھندا یا بھول بھلیاں کا منظر نہیں پیش کرتا۔ بلکہ اس کا فطری ارتقا، چڑھاؤ مکالمہ اور روانی سب ایک جگہ ہو کر معمولی سے خیال کو بھی بلند کر دیتے ہیں۔ ان کا پلاٹ خاموشی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے مناظر سے ہم رنگ ہوتا ہوا ارتقا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ ہم ہنستے ہیں اور خود اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ برجستگی اور ندرت ایک سیدھی سی بات کو بھی خندہ آفریں بنا دیتی ہے۔

منظر نگاری کا موقع پطرس کو زیادہ نہیں ملا۔ لیکن جس جگہ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے وہاں تصویر کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا ہے معاشرت اور عام گھروں کے نقشے ان کے قلم سے حقیقت کا رنگ لئے نکلے

ہیں۔ مختصر یہ کہ پلاٹ اور کردار، سیرت اور منظر نگاری میں ہر جگہ اصلیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

پطرس کی زبان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بعض پنجابی محاورات سے قطع نظر کرنے کے بعد ان کی زبان سادہ اور دلچسپ ہے۔ روانی اور زور کے ساتھ ہی ساتھ ایک لوچ اور دل کشی ایسی بھی موجود ہے جو انہیں صاحب طرز بنانے میں مدد دیتی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان زبان کی تمام لطافتوں سے بھرا ہوا ہے۔ شگفتگی نے معمولی باتوں میں بھی جان ڈال دی ہے۔ وہ اپنے بیان کو اس قدر خوش گوار اور پُرلطف بنا لیتے ہیں کہ جیسے پڑھنے والا ان کا راز دان ہے اور وہ اس سے ہم کلام ہیں۔

پطرس بہت کم لکھتے ہیں۔ اب تک ان کا ایک مختصر سا مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے۔ اور کچھ مضامین رسالوں میں نکلتے رہے لیکن اس کمی کے باوجود بھی انھوں نے ملک کے اچھے لکھنے والوں میں اپنے لئے ایک مقتدر جگہ پیدا کر لی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی

مزاحیہ افسانہ نگاری کے ذریعے سے اصلاحِ رسوم کا مقصد پیش نظر رکھنے والوں میں عظیم بیگ چغتائی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے آپ کو طالب علمی ہی کے زمانے سے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ چغتائی کے افسانوں کی تمام تر دلکشی ان کے انوکھے پلاٹ میں پائی جاتی ہے۔ افسانہ پڑھتے پڑھتے وہ وہ باتیں واقع ہو جاتی ہیں جن کی ہم کو امید نہ تھی۔ بعض اوقات ان کے افسانوں کے کردار وہ حرکتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو اگرچہ ہم روزمرہ زندگی میں نہیں کرتے لیکن انکی تمنا ضرور ہمارے خانۂ دل میں نہاں ہوتی ہے۔ بوڑھا اور بچہ۔ عورت اور مرد ہر ایک مشغول نظر آتا ہے۔ کوئی خاموش بیٹھنا چاہتا ہی نہیں عظیم بیگ کی تصانیف پڑھتے ہوئے ان کی بنائی ہوئی دنیا میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ہنگامہ خیز دنیا ہمیں حقیقی معلوم ہوتی ہے عظیم بیگ عرصہ تک دق کے مہلک مرض میں مبتلا بستر پر پڑے رہے۔ اُن کے افکار میں حرکت و ہنگامہ کی نفسیاتی وجہ یہی ہے کہ ان کا ہمزاد یہ نت نئی شرارتیں اور ہنگامے بپا کرتا رہتا تھا۔

طالب علمی کی شرارتیں ان کے افسانہ کے ہر فرد میں پائی جاتی ہیں شادی

بیاہ، نکاح وطلاق، پردہ وغیرہ کے متعلق وہ موجودہ صورتوں میں کچھ اصلاح چاہتے ہیں۔ اور ان کے بہت سے افسانوں کی بنیاد انہی خیالات پر ہے ان کا اثر ان پر اس قدر زیادہ ہے کہ افسانوں کے علاوہ انھوں نے "قرآن اور پردہ" جیسی سنجیدہ کتاب بھی لکھ کر اپنے مقصد کو واضح کیا ہے۔ ان کی تصویریں ہماری موجودہ سوسائٹی سے ہی تعلق نہیں رکھتیں بلکہ چغتائی کی ذہنی سوسائٹی کا بھی مرقع ہیں۔ انھوں نے دردناک افسانے لکھنے کی بھی کوشش کامیاب کی ہے۔ لیکن ان کی شہرت "شریر بیوی" اور "کولتار" اور "خانم" پر قائم ہے۔ زبان اور محاورہ کا انھیں کوئی خاص خیال نہیں تھا ان کے یہاں جملوں کی ایسی ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں جو اہلِ ذوق پسند نہ کریں گے۔ اگر زباں دانی اور قواعد سے ہٹ کر ہم ان کے افسانوں پر ان کی کردار نگاری یا پلاٹ کی خوبیوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس بساط پر عظیم بیگ ہی نظر آئیں گے۔ اُردو کے اور مزاح نگار اپنے مکالمہ اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ جن میں افسانوں کے علاوہ اور کتابیں بھی شامل ہیں۔ فنی طور پر عظیم بیگ نے خوابوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے ان سے پہلے خوابوں کی نفسیاتی اہمیت پر ہمارے کسی فن کار نے زور نہیں دیا تھا۔ عظیم بیگ نے "قل بوٹ" اور "خانم" میں اور تفویض Dream Sequence کی تکنیک کو اُردو کے افسانوی ادب میں پہلی مرتبہ شعوری طور پر پیش کیا۔

اگست ۱۹۴۱ء میں عظیم بیگ نے انتقال کیا اُس وقت وہ ریاست جودھپور کے چیف جسٹس تھے۔

مُلّا رموزی

ملا رموزی گلابی اردو اور نکاتی اردو کے موجد خیال کئے جاتے ہیں اس پر ان کو خود بڑا فخر ہے۔ اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں "ہماری اُردو جملوں میں الفاظ کو بے ترتیب بنا دینے سے گلابی ہو جاتی ہے"۔ بالعموم فعل اپنے فاعل اور مفعول کے قبل آجاتا ہے۔ اور اس کی شان ان تراجم کی ہو جاتی ہے جو اردو کے ابتدائی زمانے میں عربی سے کئے جاتے تھے۔ اس میں ایک طرح کی ندرت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد سارا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اس عجیب و غریب الفاظ کا تسلسل تکلیف دہ محسوس ہونے لگتا ہے جب وہ سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں تو ان کے یہاں روانی نظر آتی ہے اور مزاح سے ایک فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے عبارت کافی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

مُلا رموزی کے یہاں سیاسی واقعات کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی طنزیاتی انداز میں ان پر تبصرہ بھی کر جاتے ہیں ان کے دل میں مذہب اور قوم کا ایک درد سا ہے وہ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی ممالک کا تذکرہ کرتے وقت ایک جوش اور زور نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ ان میں کسی طرح کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی کمزوری نہیں دیکھنا چاہتے۔ ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "ان کی مضمون نگاری کا راز ان کی اصلیت نگاری میں

ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کو ہر سچی بات کہنے والے کی طرح نقصان اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے بیباک تنقید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور اپنے لطیف اشاروں میں اپنے مزاحیہ جملوں میں معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالات پر برابر نکتہ چینی کرتے رہے۔

مُلّا رموزی کا انتقال جنوری ۱۹۵۲ء میں بھوپال میں ہوا۔

شوکت تھانوی

اگرچہ غزلوں کا ایک مجموعہ "گہرستان" شائع کر کے شوکت نے اپنے کو ایک شاعر کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے لیکن ان کی شہرت اور ان کی مزاح نگاری "تبسمات" کی رہینِ منت ہے۔ شوکت کا شمار ان لکھنے والوں میں ہے جن کو فطری طور پر مزاح نگاری کی قوت ودیعت ہوئی ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ کی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں کیونکہ وہ افسانے کم لکھتے ہیں بلکہ روزانہ کی زندگی اور ان کی معمولی باتوں پر تنقید ہوتی ہے جس میں موجودہ رسوم و رواج پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان کی دلکشی کا مدار ان کا بے ساختہ پن ہے۔ سادہ الفاظ میں وہ ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ سنجیدہ پڑھنے والوں کے لب پر بھی تبسم آ ہی جاتا ہے۔ "سودیشی ریل" ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ ڈرامائیت افسانویت اور پلاٹ کی خوبیوں سے معرا ہے۔ لیکن مکالمہ اور اندازِ تحریر نے متانت شکن

شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔
چار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن کے نام بجائے خود ان کی افتادِ طبیعت کا پتہ دیتے ہیں "موجِ تبسم" "بحرِ تبسم" اور "سیلابِ تبسم" "طوفانِ تبسم" یہ ایسے نام ہیں۔ کہ اپنی جگہ پر خود شگفتگی اور تبسم کے ذمہ دار معلوم ہوتے ہیں۔
ایک کتاب "شش محل" بھی ان کی لکھی ہوئی ہے۔ جس میں ان حضرات کی بعض خصوصیات ہیں جن سے شوکت بذاتہ واقف ہیں اس کتاب میں سیرت نگاری کی صلاحیت کافی نمایاں ہے۔ اپنے خاص انداز میں انھوں نے لوگوں کی اچھی اور بری صورت و سیرت کو پُر لطف طریقہ سے پیش کیا ہے۔

کنھیا لال کپور

اردو کے مشہور طنز نگار ہیں۔ زندگی کے ہر مخصوص شعبے پر ان کی دوربین نگاہیں برابر پڑا کرتی ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی۔ خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر و تخئیل میں فلسفیانہ عمق نہیں۔ وہ کسی جماعت کے نظریہ سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے، وہ اپنے طور پر سمجھتے ہیں اور سماج یا فرد کی خرابیوں کو بے لوث ہو کر کہنے کی باتوں کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ ادیب ہو یا کوئی لیڈر۔ عورت ہو یا سینما کا ڈائرکٹر ہر ایک کی بے راہ روی پر کنھیا لال کپور کی نظریں پڑتی ہیں۔ ان کی حماقتوں کو بڑی

سنجیدگی سے متعارف کرادیتے ہیں ۔ باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیرِ لب مسکراہٹ پر مجبور ہوتا ہے اور انجام سے باخبر ہو کر ایسے کرداروں سے گریز کرنے لگتا ہے یہ کردار نگاری اور بھی مؤثر ہو جاتی ہے ۔ جب اپنے زعمِ باطل میں لیڈر یا ڈائرکٹر وغیرہ اپنی زبان سے اپنی حماقت آمیز خصوصیات پر تبصرہ کرتا ہے ۔

کنھیالال اپنے افسانوں میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ ایک طرح سے اشخاص یا رجحانات کی کمزوریوں کا ماتم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر اسلوبِ بیان کی شوخی اور بے باکی فضا میں ایسی لہر دوڑا دیتی ہے جو سمجھنے والوں کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی چلی جاتی ہے ۔ ان کی وسیع النظری نے ان کے افسانوں کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیا ۔ بلکہ ان میں اچھا خاصا تنوع پیدا ہو گیا ہے ۔ معمولی باتوں میں بھی انھوں نے نکات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اور اکثر کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں گہرائی نہیں پیدا ہو سکی ۔ مگر دلآویزی سے یہ مقامات خالی نہیں ۔

ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی اور سادگی ہے ۔ ان کے افسانے ایسے لکھے گئے ہیں جیسے کوئی بے تکلف باتیں کر رہا ہو ۔ غور سے دیکھئے تو افسانوں کے بجائے وہ مضامین معلوم ہوتے ہیں ۔ جو ظاہر میں تحریر کی سنجیدگی سے متصف ہیں ۔ لیکن باطن میں نشترِ مزاح اپنا کام کر رہے ہیں ۔ ان میں ایک مقصد ہے ۔ وہ محض ہنستے ہنسانے یا لکھنے لکھانے کے لئے نہیں لکھے گئے غلط میلانات اور مہلک جراثیم کو آپ کے سامنے بغیر فلسفیانہ اندازِ اختیار کئے ہوئے روزمرہ کی باتوں میں سامنے پیش کر کے کنھیالال ان کی اصلاح پر آپ کو متوجہ کر دیتے ہیں ۔

کنھیا لال کی زبان ٹکسالی اُردو کا نمونہ ہے۔ ان کی تحریر میں جو سب سے نمایاں خصوصیت ہے وہ ادبیت ہے۔ جملوں میں جامعیت در روانی جہاں کہیں ہم آہنگ ہوگئی ہے وہ مقام ادب کا بہترین حصہ ہوگیا ہے۔ چونکہ ان کے یہاں ذہنی کش مکش نہیں ہے اس لئے نہ تحریر میں اُلجھن پیدا ہوتی ہے نہ مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ وہ اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے تشبیہ و استعارے کا سہارا نہیں تلاش کرتے بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف اور برجستہ کہہ جاتے ہیں۔ اپنے کرداروں کی جزدی تفصیلات سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے ان باتوں کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں جو باوجود روزمرّہ دیکھنے کے ہم بہت معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن اسی کو کیور اس رنگ سے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ کہ وہی دیکھی بھالی، سوچی سمجھی بات بڑی عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے اور ہم دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ تشنہ اور مختصر ہیں۔

اب تک ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سنگ و خشت، چنگ و رباب، نوکِ نشتر اور شیشہ و تیشہ۔

اختتام

ہر زندہ زبان کی طرح اردو کا یہ نمایاں جوہر روز ازل سے رہا ہے کہ اپنے سماج اور ماحول کی ترجمانی کرے یہ اور بات ہے کہ سماج اور ماحول اچھا نہ رہا ہو لیکن زبان نے ان خیالات کی عکاسی بڑی صداقت سے کی۔ کوئی دور ایسا مشکل سے ملیگا جس میں اردو نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا ہو۔ یہاں تک جب آخر میں انگریزی حکومت کے پنجہ غصب سے ملک کو آزاد ہونے کا احساس ہوا اور بڑی سے بڑی قربانی کی ضرورت پڑی تب بھی اردو نے آگے بڑھ کر حسب حیثیت مردانہ وار قوم و ملک کی مدد کی۔ آزادی کی تحریک کی ابتدا سے انتہا تک سیاسی رہنماؤں کے ہمدوش چلتی رہی۔ کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جہاں اردو کی نظمیں دلوں کو گرمانے کے لئے نہ پڑھی جاتی رہی ہوں۔ جیل سے بھی شعرا اپنا پیام بھیجتے رہے چکی کی مشقت کیساتھ مشق سخن بھی جاری تھی۔ غالباً ہندوستان کی کسی زبان نے قوم و ملک کا اس معرکہ میں اتنا ساتھ نہ دیا ہو گا جتنا اردو نے۔ وہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو آزادی نصیب ہو گئی۔ خیال ہوا کہ جس زبان نے اتنا ساتھ دیکر اتنی محنت کے بعد ہندوستان کو اس منزل مقصود پہ پہنچایا ہے اس کو ہندوستان بھی زوروں کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا یا کم سے کم ایسی خدمت گذار وفا شعار اور قابلِ قدر زبان کو آزاد ملک اگر کچھ دیگا نہیں تو اس سے کچھ چھینے گا بھی نہیں مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

جس آزادی کا صدیوں سے انتظار تھا، اس کی شروعات عجب انداز سے ہوئی برِ اعظم صغیر کی تقسیم پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں متحد تھیں ان کی رضامندی سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا خیال یہ تھا کہ فریقین کی رضامندی امن و سکون کی ذمہ دار ہے مگر نتیجہ بالکل برعکس ہوا جشنِ آزادی کا خیر مقدم کشت و خون سے ہوا، جس کو جہاں موقع ملا مار کاٹ سے باز نہ آیا۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ ہر طرف لگ گئی بربریت پوری فضا میں چھا گئی وہ رن پڑا کہ زمین تھرّا گئی۔ گویا سکون دنیا سے اُٹھ گیا۔ سیاسی رہنما بھی اپنے کو بے بس پانے لگے۔ ایسی حالت میں ادبی رہنماؤں نے زبان و قلم سے وہ کام لیا جو زبان تیغ سے نہ ہو سکا تھا۔ فوج اور پولیس حسب خواہش سکون قائم نہ کر سکی تھیں۔ اردو کے ادیبوں نے نظم و نثر سے لوگوں کو خانہ جنگی کے نقصانات اور صلح و سکون کے فوائد فنکارانہ انداز میں اس طرح سمجھائے کہ ذہنیتیں بدلنے لگیں۔ افسانوں اور نظموں کے ذریعہ دلکش طریقہ پر عوام کو متاثر کیا، انسانیت کی عظمت اور کشت و خون کی بھیانک شکلیں نظروں کے سامنے آگئیں۔ غرض کہ لوگ ہوش میں آئے اور بربریت سے ہاتھ کھینچا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ فرقہ وارانہ فساد تمام تر ادب کی وجہ سے ختم ہوا بلکہ کہنا یہ ہے کہ سماج کو راہِ راست پر لانے میں اردو شعراء و نثر نگاروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادیبوں نے سمجھ لیا تھا کہ ادب کے ذریعہ سے ملک و قوم کی خدمت فرض اولین ہے لیکن اس خدمت کا صلہ اردو زبان کو جو ملا وہ بھی تاریخی حادثہ ہے

آزادی نصیب ہوتے ہی اردو کی مخالفت ہندوستان میں شروع ہو گئی کبھی اس کو بیرونی بتایا گیا کبھی غیر آریائی کہہ کر جلا وطن کرنے کی کوشش کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوستی کے پردے میں اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ ہندی اور اردو الگ الگ چیزیں نہیں۔ گرامر کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہے صرف رسم الخط کا فرق ہے اور چونکہ رسم الخط ناگری کا مکمل اور رفتار زمانہ سے بھی ہم آہنگ ہے

اس لئے اردو رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی رسم الخط اختیار کر لینا چاہیئے۔ جو الفاظ عربی کے اردو میں آ گئے ہیں ان کو نکال دینا چاہیئے اس لئے کہ وہ غیر آریائی ہیں۔ غرضکہ اس طرح اردو کی بیخ کنی ہونے لگی۔ یہ تو سب زبانی گفتگو تھی۔ ان خیالات کو عمل میں اس طرح لایا گیا کہ دفتروں، عدالتوں سے بہ یک جنبشِ قلم اس کو نکال دیا گیا۔ اسکول اور کالج میں جہاں جہاں اردو رائج تھی منتظمین نے موقع پر اردو ختم کر دی۔ پڑھانے والے بیکار ہو گئے۔ ابتدائی مدرسوں میں اردو پڑھانے کا وہ انتظام نہ رہا جو آزادی سے پہلے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کی تعداد بڑی تیزی سے گھٹ گئی۔ اس کے علاوہ نصاب تعلیم میں بھی کچھ ایسا التزام رکھا گیا کہ جو لڑکے اردو لینے پر آمادہ ہوتے تھے ان کو آسانی سے اردو نہ مل سکی مثلاً یہ شرط کہ اگر کوئی لڑکا اردو لے تو انگریزی نہیں لے سکتا اور مختلف موضوعات کے ساتھ بھی اردو کی تعلیم اسکول اور کالجوں میں ناممکن ہو گئی غرضکہ کچھ ایسی قیدیں لگا دی گئیں کہ بہت کم طلبا اردو لے سکتے ہیں چنانچہ اسکول اور کالجوں میں اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد ناگفتہ بہ ہو گئی۔

ہندوستان کے دستور العمل میں ۱۴ زبانوں کو علاقائی زبان تسلیم کیا گیا۔ منجملہ ان کے اردو بھی ایک زبان مانی گئی لیکن حیرت و افسوس یہ ہے کہ اس زبان کو نہ عملاً علاقائی زبان کا درجہ دیا گیا اور نہ اس کا کوئی علاقہ بنایا گیا۔ دستور العمل کی کاغذی کارروائی اشک شوئی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس کو علاقائی درجہ دلانے کے لئے اردو والوں نے رات دن ایک کر کے بیس لاکھ سے زیادہ ایسے لوگوں کے دستخط مع سکونت وغیرہ کے فراہم کئے جن کی مادری زبان اردو تھی۔ ایسے دستخط کرنے والوں میں ہندو مسلمان سب ہی تھے۔ سب کاغذات لے کر ایک وفد باقاعدہ صدر حکومت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کو واقعات سمجھائے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ مگر سال بھر سے زیادہ ہوا۔ ابھی تک حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس

طویل خاموشی کے درمیان اس کمیشن کی بھی رپورٹ شائع ہوئی جو لسانی بنیادوں پر صوبوں کو از سر نو ترتیب دینے کے لئے حکومت ہند نے مقرر کی تھی اس کمیشن نے بعض صوبوں میں دو دو زبانیں رکھنے کی سفارش کی ہے مگر اردو کے لئے اس نے بھی کوئی جگہ متعین نہیں کی۔ گویا اردو ہندوستان میں نہ کہیں بولی جاتی ہے نہ کسی علاقہ کی مادری زبان ہے۔ یہ سب قید و بند اس زبان پر ہے جس نے آزادی کی جنگ میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا تھا۔ ان تمام تشدد اور حق تلفیوں کا انجام یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو سرپرستی سے محروم ہے بلکہ بے اعتنائیوں کا شکار ہے حکومت کا یہ رویہ اردو کے لئے تکلیف دہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کے لکھنے پڑھنے والے اس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اسکے حقوق کا مطالبہ برابر کئے جارہے ہیں، اس کی اشاعت کے لئے ہمیشہ سے زیادہ مستعد ہیں۔ اس میں آج بھی ہونہار شعراء و نثر نگار پیدا ہو رہے ہیں لیکن مستقبل خطرے سے خالی نہیں۔ جب ابتدائی و ثانوی تعلیمات سے وہ محروم رہے گی تو انفرادی حیثیت سے کب تک اس کا وقار قائم رہے گا اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھ دی گئی ہے تو اس کی سرسبزی کا خدا حافظ

باوجود ان بے عنوانیوں کے اردو اب بھی فرض شناسی سے کام لے رہی ہے اس کے ادیب ملک کی بے کاری و بیکاری سے حکومت اور سماج کو آگاہ کئے جارہے ہیں۔ ملک کی بہتری کے لئے راستے بتائے جارہے ہیں۔ نثر و نظم دونوں کے ذریعہ سے مختلف خرابیوں کو ارباب حل و عقد کے سامنے بے باکی سے پیش کئے جارہے ہیں انسانیت کی بلندی کی برابر فکریں کئے جارہے ہیں۔ بلکہ اب تو ان کا ایک نمایاں رجحان یہ بھی ہو چلا ہے کہ جسکو اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

حقیقی ادیب اور سچے شاعر کی طرح وہ دنیا کے کسی گوشہ میں تباہی یا ہلاکت کے آثار

دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔ ظالم کی مذمّت اور مظلوم کی حمایت میں برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں کوریا، مراقش، ایران، مصر جہاں کہیں بھی جنگ یا جارحانہ کارروائی دیکھتے ہیں اپنے طور پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کی محبت کا شعور بلند ہو رہا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ وسیع النظری بڑھ رہی ہے ایٹم اور ہیڈروجن بم کی تیاری میں وہ ساری دنیا کو خطرہ میں تصور کر کے امن کی تلقین اور جنگ کی خرابیوں اور تباہ کاریوں کی روک تھام کی برابر فکر کر رہے ہیں۔

پاکستان میں بھی اردو کو وہ سرپرستی نہ حاصل ہو سکی جس کی امید تھی۔ انفرادی و ذاتی حیثیت سے جو کچھ اس سلسلہ میں ہو رہا ہے وہ قابل اطمینان تو نہیں غنیمت ہے۔ وہاں کے بھی شعرا، نثر نگار اپنے طور پر اردو ادب کی اشاعت کی فکر کرتے ہیں، مختلف ادارے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ادب کو دولت مند و ہمہ گیر بنانے کا خیال ان کو بھی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی خدمات بڑی رفیع و قابلِ قدر ہیں وہ اپنی دھن میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں تن، من، دھن سب کچھ اردو کے نذر کر چکے ہیں لیکن حکومت حسب خواہش امداد سے دریغ کرتی ہے اس نے کبھی کوئی سرکاری کمیشن ایسا مقرر نہیں کیا جو تمام ملک میں دورہ کر کے مختلف زبانوں کا جائزہ لے اردو کو مالدار بنانے کی فکر کرے نہ کوئی انجمن ابھی تک ایسی بنی جو غیر زبانوں کی اصطلاحات کا مترادف بنائے یا ترجمہ کرے نہ طریقۂ تعلیم کو اردو زبان میں رائج کرنے کا خیال ہوا۔ کاش یہ سب باتیں اور ان کے علاوہ بہت سی اور باتیں حکومت کے سامنے آتیں اردو کو ترقی دینے کے لئے مختلف انجمنیں بنائی جاتیں، جو غور کرتیں کہ اردو کو مکمل زبان کے مراتب عطا کرنے کے لئے کن مسائل کا حل کرنا ضروری ہے۔

پاکستان اب ایک نئی دنیا ہے اس کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں کے

بولنے والے بستے ہیں اب وہ نئی حکومت میں ایک کئے جا رہے ہیں۔ لیکن تمدن و زبان کا فرق امتیازی حیثیت رکھتا ہے اپنی مادری زبان کے محاورے، کہاوتیں لوگ اردو میں شامل کرتے جاتے ہیں۔ گو اردو ابتدائے آفرینش سے ان باتوں کی عادی ہے اس کا خمیر ایسے ہی اجزا سے بنا ہے۔ لیکن چونکہ اب صدیوں کے بعد اردو ادب کا سانچہ مکمل ہو چکا ہے وہ آنے والے اجزا کو اپنے طور پر تراش خراش کر ادب میں جگہ دیگا اپنے معیار سے آنے والے ذخیرہ کو دیکھے گا۔ لیکن پھر بھی اندیشہ ہے کچھ دنوں تک معیاری ادب کو بے راہ روی محسوس ہوگی، نئے الفاظ نئے انداز بیان کو ایک عرصہ لگے گا کہ وہ مانوس ہو سکیں اور ان کو ادب میں جگہ مل سکے۔

دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول نے اپنے وقت میں احتساب کا بھی کام کیا تھا۔ زبان کو ایک راستہ پر لگانے میں ان دونوں اسکولوں نے بڑی جانفشانی و دوراندیشی سے کام کیا تھا، مستند ادیبوں کے کلام ورائے کی سند کے بغیر الفاظ و محاورات کا ادب میں جگہ پانا ناممکن تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بہت اچھا ہوا کہ اپنی ڈفلی اپنا راگ نہ ہونے پایا۔ ادب کے لئے ایک شاہراہ ہوگئی قلیل عرصہ میں اردو کی ایک ایسی صورت نکل آئی جس کو ہمہ گیری حاصل ہوئی، ادبی اختلافات باعثِ نزاع نہ ہو سکے۔ لیکن اب پاکستان میں کوئی اس قسم کا اسکول نظر نہیں آتا۔ اردو کے مزاج کے لحاظ سے حکومت کو چاہیے مستند ادیبوں کا ایک ایسا بورڈ بنادے جو آنے والے الفاظ و محاورات و اختراعات پر نظر رکھ کر ادب میں ان کو داخل کرے لسانی اصول و عوامی پسندیدگی کا خاص خیال رکھے۔ ابھی تک حکومت نے اس طرف بھی توجہ نہیں کی اور نہ دفتروں میں اردو کو وہ جگہ ملی جو ہندوستان میں ہندی کو مل گئی ہے۔ خدا کرے دستورِ عمل بن جانے کے بعد اربابِ حل و عقد کو اردو زبان کی ترقی و ترویج بھی قومی ترقی کے لئے ضروری محسوس ہو۔